اسلامی نظمِ معیشت

پہلی جلد

اسلام کے معاشی نظریے

[illegible]

از

محمد یوسف الدین

ایم اے، پی ایچ۔ ڈی،

بمراسلہ کتب خانہ جامعہ ملیہ دہلی

محمد یوسف الدین
ریڈر شعبہ مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ
۵۷-۲-۹

اسلامی نظم معیشت

(پہلی جلد)

اسلام کے معاشی نظریے

(از)

محمد یوسف الدین ایم، اے، پی ایچ۔ ڈی (عثمانیہ)

استاذ مذہب و ثقافت

جامعہ عثمانیہ

۱۳۶۹ھ م ۱۹۵۰ء

دوسری اشاعت

(۱۰۰۰)

مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

۷۸۶
۴۹۲

فہرست مضامین

نوٹ

تقسیم دولت کے دیگر مسائل، مسئلہ اجرت، اور مسئلہ سود وغیرہ دوسری جلد میں بیان ہوئے ہیں۔

۷۸۶
۴۹۲

دیباچہ

• جامعہ عثمانیہ کے گوشۂ عزت و عافیت میں آج سے دس سال پہلے جب میں نے یہ جرأت کی تھی کہ اسلام کے معاشی نظریوں کو تلاش و تحقیق کا موضوع قرار دوں تو حال یہ تھا کہ "معاشی تخیل کی تاریخ" پر جو مختلف کتابیں نظر سے گذرتیں ان میں ان تمام مختلف مذہبوں اور مفکروں کا تذکرہ تو ملتا جنھوں نے معاشی تخیل کے نشوونما اور ترقی میں خفیف سے خفیف حصہ بھی لیا تھا۔ برہمنی مت کا بھی تذکرہ ہوتا جس نے ذات پات کا نظام قائم کر کے تقسیم عمل کا نیا نظام رائج کیا، یہودیت کا بھی تذکرہ دیکھنے میں آتا جس نے سود کو ممنوع قرار دیا، عیسائیت کی خدمات کا بھی تذکرہ پڑھنے میں آتا، لیکن نظر نہ آتا اور بالکل نہ آتا تو اسلام کا تذکرہ جس نے ایک نیا اور اپچ بھرا معاشی نظام قائم کیا اور صدیوں دنیا کے بڑے حصے میں کارفرما رہا۔ ان عصری کتابوں کے مطالعہ سے یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ اسلام کا بھی کوئی نظام ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے بھی کسی معاشی نظام کے ارتقاء میں کچھ حصہ لیا ہے۔ ایک مسلمان کی اپنے مذہب کے متعلق خوش اعتقادی سے قطع نظر یہ تو ایک امر واقعی تھا کہ بحر اوکاہل سے بحر ظلمات تک تین براعظموں پر پھیلی ہوئی جس قوم نے صدیوں داد حکمرانی دی اور جس کا وسیع معاشی نظام دنیا کے بڑے حصے پر صدیوں تک کارفرما رہا، ایسے نظام کے نام سے کہیں دو بول تک نہیں۔

پھر یہ ایک عجیب و غریب مظاہرہ ہے کہ مغرب کا علم معاشیات

اپنے تقریباً ہزار سالہ مستقل ترقی و ارتقاء اور بزعم خود اوج کمال کو پہنچنے کے بعد اور چند بنیادی اور اہم ترین و دوررس معاملوں میں جن پر ایک طرح سے پورا علم معاشیات مبنی ہے بہت کچھ بھٹکنے کے بعد، آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کے پیش کیے ہوئے اسلام کے معاشی نظریوں کی پیروی اور تقلید کی طرف کھنچا چلا آ رہا ہے مثلاً اسلام نے سود کی قطعی ممانعت کی تھی، گذشتہ صدی تک مغرب میں سود کا اس درجہ زور رہا کہ سود خواری اور معاشی ترقی دونوں لازم و ملزوم ہو گئے تھے، جسے دیکھ دیکھ کر راسخ العقیدہ مسلمانوں کے قدم بھی ڈگمگانے لگے تھے، لیکن معاشیات کے بڑے ماہر اور ناقد لارڈ کینز آنجہانی نے بتا دیا کہ سود ہی معاشرہ کی ترقی میں سدِ راہ ہے، ایک سود ہی نہیں اب تک اور بہت سے اسلام کے معاشی اصولوں کی برتری تسلیم کی جا چکی ہے۔ ان حالات میں اس موضوع پر کام کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔

بہرطور اس اظہار مختصر سے موضوع کی اہمیت، اشکال اور پیچیدگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ جب عصری مستعملہ کتابیں بے سود ثابت ہوئیں تو پھر یہ سارا مواد کیسے ہاتھ آیا! ایک ایک نکتے کا کھوج لگانے اور ایک ایک رمز کو پانے کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑے اور کہاں کہاں کی بادیہ نوردی سے یہ سرمایہ سمیٹ سمیٹ کر ایک جگہ اکھٹا کیا گیا اس کے جواب کے لیے وہ صفحے دیکھنے کے ہیں جن پر استفادہ کی ہوئی کتابوں کی فہرست پھیلی ہوئی ہے۔

تلاش و تحقیق کے اپنے اس دس سالہ سفر میں اس حقیقت کا ہر مرحلہ پر انکشاف ہوا کہ اسلام کا نظام زندگی کوئی جامد نظام نہیں ہے بلکہ اس نے ترقی اور برتری کی جو شاہراہ دکھائی ہے اس پر چلنے میں بہت ہی کم کسی پُرمشقت نشیب و فراز کا سامنا ہوتا ہے۔

ادب، فلسفہ اور سائنس وغیرہ میں مسلمانوں کی استادی کا اعتراف تو پروفیسر برنارڈ لیوی جیسے مستشرقوں نے مدت ہوئی کر لیا[1] لیکن مغربی علم معاشیات کا بھی

---

[1] British Contributions To Arabic Studies 1941

اسلامی معاشیات کا رہینِ منت ہونا چاہیے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے ہمارا منشا یہ ہے کہ
اس مقالہ کے ذریعہ علمی تاریخِ انسانیت کے ایک اہم باب یعنے اسلامی معاشیات پر
کچھ مواد جمع کریں۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس میدان میں ہمارے پیشرو بھی ہیں اور دعا ہے کہ
ہمارے بعد اس اہم کام کے جاری رکھنے کے لیے اخلاف میسر آئیں، اہمیت کا کام
اجتماعی جد و جہد کے سوا اور کسی چیز کی طالب نہیں، اسلاف سے ہم نے خوشہ چینی کی ہے
اخلاف کے لیے نشانِ راہ اور شکرانہ کے طور پر اپنا مواد نذر کیا جاتا ہے۔

یہ مقالہ جامعۂ عثمانیہ کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری پی ایچ، ڈی کے لیے لکھا گیا اور
منظور ہوا، اولاً اس کے اجزاء بہت کچھ اصلاح اور حذف اضافے کے بعد حیدرآباد دکن کے
ایک ماہنامہ "روح ترقی" میں اقساط سے شائع ہوتے رہے۔ نظرِ ثانی کے بعد خاصے
رد و بدل اور نئے اضافے کے ساتھ اب جب کہ یہ مقالہ دوسری مرتبہ کتابی شکل میں
شائع ہو رہا ہے تو اساتذہ کرام اور احباب باصفا کی امداد و اعانت کی ممنونیت
اور جذبات تشکر سے مولف کا دل اخلاص مندی کے ساتھ بھرا ہوا ہے۔

مشفق و محترم اساتذہ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی (سابق صدر شعبہ دینیات
جامعہ عثمانیہ) اور ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی (سابق صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ،
حال مشیر معاشیات مملکت پاکستان) کا شکریہ کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے زبان و قلم سے
احسان مندی کے جذبات کا اظہار کما حقہ نہیں ہو سکتا۔ محترم پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب
(سابق صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ) اور بعض دیگر اساتذہ جنھوں نے چند وجوہ سے
اپنے نام کی اشاعت کی اجازت نہیں دی ہے ان کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے، ان بزرگوں نے مقالہ کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ
اسپین کی عرب یونیورسٹیوں میں تشنہ کامانِ یورپ کی بھیڑ بھاڑ دنیا بہ غور دیکھ چکی ہے یہاں تک کہ ان
تشنہ لبوں کے نام تک تاریخ کو یاد ہیں اور صرف نام ہی نہیں بلکہ ریکارڈ بھی محفوظ ہیں۔
جرمن، فرانس وغیرہ کے فلاسفہ اور اربابِ نظر کا مدتوں علامہ ابن رشد کے نقشِ قدم پر چلنا اور اپنے آپ کو
علامہ موصوف کی طرف فخریہ منسوب کرنے کی داستان فرانس کے فاضل پروفیسروں رینان اور لیبان سے مخفی نہیں ہے۔
ڈاروِن کا شہرۂ آفاق ارتقائی مبحث عالم بھر سے خراجِ تحسین وصول کر چکا لیکن رمز شناس
جانتے ہیں کہ علامہ ابن مسکویہ (المتوفی سنہ ۴۲۱ھ) کی تحقیق و تدقیق ہی اس کا اصل ماخذ ہے،
علامہ موصوف کا اثباتِ نبوت کے استدلال میں موجوداتِ عالم کی ترتیب اور ارتقائی سلسلہ
ڈاروِن کے مشہور نظریہ ارتقاء کا حقیقی سنگِ بنیاد ہے۔

ترتیب اور اصلاح میں اپنی گراں قدر رہنمائی سے ممنون فرمایا۔ اس سلسلے میں برادران محترم شرف الدین اور ڈاکٹر محمد غوث ایم۔ اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے یا تو اپنی مہارت معاشیات سے کسی نہ کسی مرحلے میں میری مدد فرمائی یا طباعت سے قبل مقالہ کو شروع سے آخر تک دیکھ کر قابل قدر مشورے دیے۔ مولوی ناصر علی صاحب ایم۔ اے (ریڈر معاشیات جامعہ عثمانیہ) کا بھی شکریہ کرنا ہے جنھوں نے آغاز کار پر مجھے معاشیات کے ابتدائی درس دیے، مولوی سید ابوالقاسم صاحب سرور (دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ) بھی خاص طور پر میرے شکریے کے مستحق ہیں، صاحب موصوف کی عنایتوں سے ادبی اصلاح کے بعد مقالہ کتابی شکل میں جامعہ عثمانیہ کی اعلیٰ معیاری کتابوں کے نمونہ پہ شائع ہو سکا، اور یوں تو مجھے ان تمام اساتذہ صاحبان کا شکریہ کرنا چاہیے جنھوں نے ابتدائی جماعتوں سے اعلیٰ جماعتوں تک تعلیم دے کہ مجھے اس قابل بنایا کہ یہ مقالہ لکھ کر علمی دنیا میں پیش کر سکوں۔

سب سے آخر لیکن اہمیت میں کسی سے کم نہیں وہ جامعہ عثمانیہ کے علم دوست وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ بہادر بالقابہ ہیں جن کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے آپ نے مقالہ سے وقتاً فوقتاً دلچسپی لیتے ہوئے مقالہ نگار کی ہمت افزائی فرمائی اور اس کو زریں مشوروں سے رہین منت کیا۔ مناسبت مقام و محل سے یہ دعائیہ سجع بھی یاد آ رہا ہے:

نبیؐ یاور تو علیؓ یار باد

حسن اتفاق کی یہ دلچسپ روداد بھی مسرت افزا ہے کہ نواب صاحب کی وائس چانسلری کے پہلے دور میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے یہ تحقیقی مقالہ پیش کیا گیا اور خوش قسمتی سے اب نواب صاحب ہی کی وائس چانسلری کے دوسرے نئے دور میں یہ مقالہ کتابی شکل میں زیور طبع سے آراستہ ہو رہا ہے۔

انشاء اللہ مقالہ کی تیسری اشاعت کی آئندہ نوبت آئے تو اس وقت جو خامیاں نظر آ رہی ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یوں سوائے اللہ جل شانہ کی ذات کے کون خامیوں سے پاک ہے!

سُبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم۔

ڈاکٹر محمد یوسف الدین
(استاذ مذہب و ثقافت، اسلامک سکشن) جامعہ عثمانیہ
۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ

کلیہ فنون جامعہ عثمانیہ
روم نمبر ۹۹
دوسری اشاعت

اسلام کے معاشی نظریے

(از)

ڈاکٹر محمد یوسف الدین ایم، اے۔ پی ایچ، ڈی

انسان کی دنیاوی زندگی میں معاشیات کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے نہ پرانے زمانوں میں انکار تھا اور نہ آج ہے۔ اہل دنیا تو اس کے معتقد ہیں ہی، اہلِ دین کو بھی اس سے انکار نہیں۔

اس ہمہ گیر تسلیم کے باوجود دنیا کی تمام کشمکشوں کی جڑ بھی معاشی ہی قرار دی جاتی ہے۔ وجہ بھی ظاہر ہے۔ اگر معاش اچھے اصول پر حاصل ہو، تو سب ہی امن چین سے رہیں۔ بُرے اصول پر بنے تو ہر کوئی بلا میں پھنستا ہے۔ اسی بناپر نہایت قدیم زمانے سے ہر تمدن اور ہر مذہب نے کچھ معاشی اصول اور نظریے اپنے متبعین پر عائد کرنے کی کوشش کی، اور اپنے مقصد میں کسی کو کم، کسی کو زیادہ کامیابی ہوئی۔

موجودہ زمانے میں حریفوں میں انضمام اور جتھا بندی ہوتے ہوئے صرف دو بڑے کیمپ ہو چلے ہیں: ایک سرمایہ داری اور ایک اشتراکیت۔ دونوں ہی انتہا پسندیاں ہیں۔ اور خیرُ الاُمورِ اَوسطُہا[1] کے بغیر اس شعبۂ حیات میں بھی انسان کو امن چین حاصل نہیں ہو سکتا۔

تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی رہتی ہے۔ اب سے چودہ سو سال پہلے بھی دنیا کو

---

[1] تمام کاموں میں میانہ روی بہتر ہے۔

مزدک کی اشتراکیت اور سابقی اہل قدرت کی سرمایہ داری میں ایک شدید کشمکش نظر آئی تھی۔ اور فاران کے نور نے اس اندھی کشاکش سے نجات کا راستہ دکھایا تھا۔ آج مزدک کی جگہ کارل مارکس کے آجانے سے چاہے نام بدلے کام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دنیا محمد الرسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فارانی نور کو بھی بھول چکی ہے۔ ضرورت تھی کہ اس کو مکرر دنیا کے سامنے اسی کشمکش کے سلسلے میں پیش کیا۔ اور عمل کر کے دکھلایا جائے۔

حالیہ سالوں میں اسلامی معاشیات پر قلم اٹھانے کا بہتوں کو شوق ہوا۔ ذوق والے شاذ تھے، اور ان کی کاوشیں بھی ہمہ گیر نہ تھیں۔ اگر مغربی تعلیم یافتہ حضرات کو شوق ہوا تو انھیں اسلامی مواد پر دسترس نہ تھی۔ مولویوں کو معاشیات کے جدید تصور کا علم سطحی ہونے سے رطب و یابس کے حشویات کے سوا کم کچھ کام کی چیز سامنے آئی۔ اس پر متزاد یہ کہ ماخذ بہت کثیر اور مواد بے حد منتشر۔ ساتھ ہی غیر جانبدار اور صحیح تصویر کی جگہ کسی نہ کسی ادنیٰ مقصد کی تائید کے لیے جانبداری۔

اسلامی معاشیات کے لیے تفسیر و حدیث کے بے پایاں سمندر کو عبور کرنے کے علاوہ فقہ کی کتابوں کے اتاہ ساگر میں غوطہ لگا کر تل سے موتیاں چنتا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں نماز روزے وغیرہ کو چھوڑ کر تقریباً دو تہائی معلومات معاشی معاملات ہی کے متعلق ہوتے ہیں اسلام کی خالص معاشی کتابیں چاہے اپنے زمانے کے لیے اچھی رہی ہوں، اب یہ قدیم عربی کتابیں زیر بحث مقصد کے لیے ناکافی ہیں۔

اسلامی معاشیات، پر اصل میں تاریخی طور پر ہی کام ہونا چاہیے۔ یعنی عہد نبوی سے آج تک جو ممتاز و معین عہد قرار دیے جا سکتے ہیں، ان میں سے ہر عہد کے نظریوں اور نظیروں (یا تعلیم اور تعمیل) کو الگ الگ جمع کیا جائے۔ یہ نہیں کہ سب کو گڈمڈ کر دیں۔ اور اپنی پسند کی چیزیں (خواہ کسی دور کی ہوں) لے کر اور باقی چیزوں سے چپ کی سادہ کر اس مجموعے کو اسلامی معاشیات قرار دیا جائے۔

ڈاکٹر محمد یوسف الدین صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ وہ فقہ میں ایم اے بنے پھر معاشیات اور اسلامیات ہر دو قسم کے متعاون اساتذہ (مولانا مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر انور اقبال قریشی) کی نگرانی میں پی ایچ، ڈی کا مقالہ چار سال تک انہماک سے مرتب کر کے اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔
ان کے مضمون کا عنوان تو صرف "نظریے" ہے لیکن اس میں ہر قدم پر نظیریں اور مثالیں بھی ہیں۔ اور انھوں نے اپنے مواد کو تاریخی درجہ بندی بھی نہیں عطا کی ہے پھر بھی انھوں نے اتنا کچھ مواد جمع کر لیا ہے جو آج تک کسی مسٹر نے پیش کیا اور نہ کسی مولوی نے۔ اس کی طباعت دنیا کو اپنی منزل مقصود کی طرف ایک قدم ——— اور ایک طویل قدم ——— آگے لے جاتی ہے، اور پیاسی دنیا کو ایک پانی کا پیالہ اور بیمار دنیا کو دوا کی ایک شیشی مہیا کرتی ہے۔ اسلامی دنیا ہی نہیں، ساری دنیا کو۔
"روح ترقی" مسرت کے ساتھ اس کارنامے کو بہ اقساط ملک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف الدین صاحب اپنے مقالے کو (جو نظر ثانی اور حذف و اضافے کے باعث جامعہ میں پیش و منظور شدہ مقالے سے مختلف بھی ہے اور بہتر بھی) اہل علم کے سامنے افادے سے زیادہ استفادہ کیلئے پیش فرما رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ ضخیم مقالہ جو پانچ چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، ایک سال کے عرصے میں ہمارے اوراق میں مکمل ہو جائے گا۔ اس کے انگریزی اور عربی ترجمے بھی خود مؤلف صاحب مکمل کر چکے یا کر رہے ہیں بہرحال فوقَ کلِّ ذِی علمٍ علیم۔

مدیر "روح ترقی"

پہلی اشاعت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کے معاشی نظریے

حرفِ آغاز

وسیع نظر ڈالیں تو دنیا کی موجودہ دشواریاں بڑی حد تک مغربی اصول معاشیات، سرمایہ داری، سودخواری اور اشتراکیت کے تصادم و کشمکش کے نتائج ہیں۔

اسلامی اصول معاشیات نے ــــــ جب تک کہ وہ برسرِعمل رہے ــــــ ایک معتدل اور محفوظ راہِ عمل دکھائی تھی۔ اب تو اس کے جاننے والے بھی کم رہ گئے ہیں البتہ قرآن کریم اور اس کے علاوہ حدیث، تفسیر و فقہ کی کتابوں اور مستند تاریخوں میں خام مواد بکثرت منتشر پایا جاتا ہے میں نے اپنے اس مقالہ میں اسلامی معاشیات کے اس مواد کو علمی ترتیب کے ساتھ یکجا پیش کرنے کی ابتدائی کوشش کی ہے۔ کیا عجب کہ یہ کوشش کسی نئے آغاز کی تمہید ثابت ہو۔

پہلا باب

عرب کا قدیم معاشی نظام

خلاصہ:۔ عرب اسلام کا گہوارہ ہے اس لیے اسلامی معاشیات کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے عرب کے قدیم معاشی نظام کو پس منظر کے طور پر اپنے سامنے رکھ لینا ناگزیر ہے۔

تاریخ کے قدیم دور ہی سے جزیرہ نمائے عرب کی اہمیت واضح ہے۔ یہ تین بر اعظموں کا مقام اتصال ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے چین و ہندوستان، ایران وغیرہ مشرقی ممالک سے یورپی ممالک کو جو تجارتی سامان جاتا تھا وہ عراق اور شام وغیرہ کے علاقوں ہی سے ہو کر جاتا تھا۔ حجاز کے ایک شہر مکہ کی نسبت بتایا گیا ہے کہ یہ کاروانی راستہ پر ایک اہم اسٹیشن تھا۔

ماسوا اس کے اسی وادی مکہ میں حضرت ابراہیمؑ نے حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، مہاتما بدھ، کنفیوشس اور سقراط سے صدیوں قبل سے "دنیا کے بت کدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا" تعمیر کیا۔ اسی مکہ سے اسلام کی سب سے پہلی شعاعیں چمکیں اور مکہ کے غار حرا میں قرآن مجید کی پہلی وحی کا نزول ہوا

جزیرۂ نمائے عرب کے شمال مغربی علاقے، جزیرہ نمائے سیناشام و فلسطین

دنیا کے اور دو بڑے مذاہب یہودیت اور عیسائیت کے گہوارے ہیں۔ اسی سرزمین میں توریت، زبور اور انجیل کا نزول ہوا اور یہی علاقے حضرت سلیمانؑ و داؤدؑ کے پایۂ تخت بھی رہ چکے ہیں۔

فنیقی ملاح بہت ہی قدیم زمانے میں سوئز سے چل کر پورے براعظم افریقہ کا چکر لگاتے اور ابنائے جبل الطارق کے اس پار انگلستان میں بھی تجارت کی غرض سے لنگرانداز ہوا کرتے تھے۔

دجلہ اور فرات کے کنارے تمدن کی ابتدا سومیریہ والوں سے ہوئی ہے یہ عرب کے خانہ بدوش قبائل تھے۔

بعد ازآں عمان کی بندرگاہ کا منظر دکھایا گیا ہے۔ جو بین الاقوامی تجارت کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

پھر یمنی تہذیب کا تذکرہ ہوا ہے آج سے ہزاروں سال قبل سبائی لوگ آبپاشی کے بڑے بڑے بند اور ساگر بنا رہے ہیں۔ ان میں سکہ کا بھی رواج ہے اور ملکہ سبا اپنے پُرشکوہ تخت پر جلوہ گر ہے۔ آخر میں بتایا ہے کہ ترقیات کے یہ سارے کارنامے عہد کہن کی داستاں بن چکے تھے۔

پھر رسول اکرمؐ کی ولادت باسعادت کے زمانے میں عرب کی سیاسی حالت دکھائی گئی ہے۔ بعد ازاں حجاز کے تین شہر طائف، مکے، اور مدینے کا تذکرہ ہوا ہے۔

طائف کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اور معاشی حالات کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ اور بتایا ہے کہ زمین و آسمان یوں ہی گردش میں ہیں تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے چنانچہ طائف کے معاشی حالات کے تذکرہ میں اگر آپ ایک ایک طرف زمیندار اور کاشتکار کی کشمکش دیکھیں گے تو دوسری طرف دولتمند طبقہ اور غریب طبقہ کی کشمکش اور اس کا انجام بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔

پھر مکہ کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اور معاشی حالات پیش کیے گئے ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے کاروان جس میں دو دو ہزار اونٹ ہیں سامان تجارت لے کر شام یا یمن جا رہے ہیں۔ قریشی عورتیں بھی تجارت سے دلچسپی لیتی ہوئی

دکھائی گئی ہیں۔ مکہ کے ہاشمی سردار قیصر و کسریٰ کے دربار میں باریاب ہوکر امن و امان کا پروانۂ شاہی حاصل کر رہے ہیں۔ پھر نجاشی کے حضور میں آپ قریشی تاجروں کو اپنی مصنوعات اور تجارتی سامان پیش کرتے ہوئے پائیں گے۔ یہ تو تصویر کا ایک رُخ ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ بھیانک ہے حجازی اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے قتل کر رہے ہیں۔ کہیں دختر کشی ہو رہی ہے۔ کہیں زندہ درگور کیا جا رہا ہے۔ آجر مزدوروں پر اور آقا اپنے غلاموں پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہے ہیں۔ سرمایہ دار ساہوکاروں کا طبقہ، غریب طبقہ کو لوٹ کھسوٹ کر رہا ہے۔ قرض خواہ اور مقروضوں کے جھگڑے چل رہے ہیں۔ صرف سال میں چار مہینے امن کے ہیں۔

پھر مدینہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک چھوٹی سی کسانوں کی بستی ہے جس میں نراج کی کیفیت ہے۔ مدینہ کے دو قبیلے اوس اور خزرج لڑتے لڑتے کمزور ہو چکے ہیں۔ تجارت پر یہودی قابض ہیں۔ یہی زمانہ ہے جس میں رسالت کے آفتاب سے مدینہ جگمگا اٹھتا ہے اور یہی چھوٹی سی بستی دیکھتے دیکھتے چوبیس پچیس سال کے قلیل عرصہ میں ایک بڑی شاندار سلطنت کا دارالخلافہ بن جاتی ہے جس کے حدود تین براعظموں پر پھیلے ہوئے ہیں۔

غرض اس باب میں تفصیل سے دکھایا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کس قسم کے معاملات مروج تھے۔ جس میں اسلام نے تنسیخ، ترمیم اور اضافہ کیا ہے۔ سود، مضاربت، رہن، محصول درآمد، مروجہ سکے، ہنڈی گھر (بنک) غرض بیسیوں چیزیں جو قدیم عرب میں رائج تھیں انھیں پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ وہی حجازی عرب جو آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت کس طرح متحد ہو گئے کہ چند ہی سال کے عرصہ میں انھوں نے ایک بڑی شاندار سلطنت قایم کرلی جس کی وسعت دارا و سکندر اعظم کی سلطنت، روم کی سلطنت، اشوک، چندرگپت امور یا، اور دکن کے پلکیشن ثانی کی سلطنت سے کئی گونا بڑھی ہوئی تھی اس وسیع سلطنت میں اسلام نے جو

معاشی اصول رائج کئے اور جو نتائج حاصل ہوئے، اس معاشی نظام کی تاریخ اور تفصیل کو مقالہ کے دیگر ابواب میں بیان کیا گیا ہے۔

تاریخ وجغرافیہ میں عرب کی اہمیت

دنیا کا کرۂ نما نقشہ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ جزیرہ نمائے عرب پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، جہاں تینوں براعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ ملتے ہیں۔ عرب کے محل وقوع کی اسی خصوصیت کا نتیجہ تھا کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے میں بھی ہندوستان، ایران وغیرہ سے یورپی ممالک اور افریقی ممالک کو تجارتی سامان جاتا تھا وہ عراق اور شام ہی کے علاقوں سے ہو کر جاتا تھا۔ اور آج بھی یورپ جانے کا جو ہوائی راستہ ہے وہ ان ہی ممالک سے گزرتا ہے۔ علاوہ بریں ایک دوسرا تجارتی راستہ بھی تھا جو طائف۔ مکہ۔ مدینہ اور فلسطین ہوتے ہوئے مصر یا ترکی جاتا تھا۔

مزید برآں یہ امر بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہی عرب دنیا کے اور دو بڑے مذاہب یعنی یہودیت اور عیسائیت کا بھی گہوارہ رہ چکا ہے۔

آئندہ ہم واضح کریں گے کہ دجلہ اور فرات ہی کے کنارے تمدن کی ابتداً ہوئی۔ اسی طرح شام و فلسطین اور یمن وغیرہ کا بھی دنیا کی تہذیب وتمدن کی آبیاری میں خاص حصہ ہے۔

عرب دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے[1]۔ اس کا جملہ رقبہ دس لاکھ مربع میل سے کسی قدر زائد ہے، بالفاظ دیگر عرب کا رقبہ ہندوستان سے کچھ ہی کم ہے۔ لیکن انگلستان، اسکاچستان، ولندستان، بلجیم۔ جرمنی، فرانس، اطالیہ۔ اور اسپین کے مجموعی رقبہ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ قدیم عرب کے باشندے اس کو

---

[1] ۔ جغرافیہ عالم حصہ دوم از ابی مارسڈن صفحہ ۱۱۴ ۔ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ

جزیرۃ العرب کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ چنانچہ رسول کریم نے بھی اسی نام سے اس کا تذکرہ فرمایا تھا[1]۔

حجاز اسی عرب کا ایک صوبہ حجاز بھی ہے جو بحیرۂ احمر کے کنارے دور تک چلا گیا ہے۔ حجاز کو شہرت صدیوں سے اس کے دو شہروں کی بدولت حاصل ہے جن میں سے ایک تو مکہ معظمہ ہے اور دوسرا مدینہ منورہ۔

مکہ مکہ کی سرگزشت سے اسلامی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ اور یہی دیار اسلام کا سب سے زیادہ مقدس شہر ہے۔ یہیں اسلام کی سب سے پہلی شعاعیں چمکیں۔ یہیں غار حرا میں قرآن پاک کی پہلی وحی کا نزول ہوا لیکن اس کی تاریخ اس سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ روایات بتاتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ بلکہ حضرت موسیٰؑ سے صدیوں قبل جب کہ سری رام چندر جی کا دکن میں بن باس بھی نہ ہوا تھا اور ہندوستان میں بدھا نے دریائے گنگا کے کنارے وعظ و تلقین شروع بھی نہ کی تھی، اور جب کہ چین میں کنفیوشس نے اپنے سنہرے قوانین کی بنا بھی نہ رکھی تھی، اور یونان کی سرزمین پر سقراط دانا ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا، اس زمانے میں اسی وادی مکہ میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے مل کر بیت اللہ ــــ "دنیا کے بت کدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا"[2] تعمیر کیا جس کے حج کے لیے اب صدہا سال بعد بھی دنیا کے گوشے گوشے سے ہزاروں لاکھوں حاجی ہر سال کھنچے کھنچے چلے آتے ہیں۔

---

[1] ۔ ایک حدیث ہے کہ "مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو" (بخاری پ ۱۲ کتاب الجہاد)

[2] ۔ اقبال: قومی ترانہ۔ اس سلسلہ میں قرآنی آیت ملاحظہ ہو کہ اِنَّ اَوَّلَ بَیتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِی بِبَکَّۃَ مُبَارَکاً وَّھُدًی لِّلعَالَمِینَ۔ فِیہِ آیَاتٌ بَیِّنَاتٌ مَّقَامُ اِبرَاھِیمَ۔ (پ ۴ آل عمران۔ ۳ ع ۱) بیشک لوگوں کے لیے جو پہلا گھر عبادت گاہ ٹھہرایا گیا وہ یہی ہے جو بابرکت شہر مکہ میں ہے اور دنیا جہاں کے لوگوں کے لیے راہ نما ہے، اس میں بہت سی نشانیاں ہیں از آں جملہ مقام ابراہیم ہے۔ ؎

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا ✤ خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا

(مسدس حالی)

مکہ کے محل وقوع نے ابتدائی زمانے سے ہی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ یہ مقام صحرا کے کاروانی تجارت کے راستے پر واقع تھا اور گویا ایک اہم اسٹیشن تھا[1]۔ الغرض مکہ ایک مقدس مقام ہونے کے علاوہ رفتہ رفتہ ایک تجارتی مرکز بھی بن گیا۔ ہر طرف بلند اور ناقابل تسخیر پہاڑیوں نے اُسے فوجی نقطۂ نظر سے محفوظ بنا دیا۔ مزید بر آں جاہلیت میں بھی اس کے اطراف فصیل بنی ہوئی تھی۔

یہ تو حجاز کے ایک شہر مکہ کی کیفیت تھی، لیکن شہر کے اطراف و اکناف میں خانہ بدوش چھوٹے چھوٹے قبائل بستے تھے، اور سال کے بارہ مہینے دانہ چارہ کی تلاش میں اپنے اونٹ اور بکریوں کو لیکر گھوما کرتے تھے، ان بدوؤں کی غذا اور ان کا لباس بھی جنگل میں پکارنے والے یوحنا سے کچھ مختلف نہ تھا کہ "اس یوحنا کی پوشاک اونٹ کے بالوں کی تھی۔ اور چمڑے کا کمر بند اس کی کمر میں تھا، ٹڈی اور جنگلی شہد اس کی خوراک تھی[2]" لیکن یہی حجازی عرب جو ٹڈیاں[3] اور جنگل کا شہد کھاتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت ایسے متحد اور بیدار ہو گئے کہ دنیا حیران رہ گئی ؎

نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی ٭ اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

(مسدس حالی)

ان ہی حجازیوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ایک حکومت قائم کرلی اور آپ کی رحلت کے دس پندرہ سال کے اندر ہی اندر اس نے ایک بڑی شاندار سلطنت کی شکل اختیار کرلی۔ جس کی وسعت سکندر اعظم کی سلطنت، روم کی سلطنت، اشوک، چندرگپت موریا اور پل کیسن ثانی کی سلطنتوں سے کئی گنا

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا۔ عنوان "مکہ" جلد (۱۵) صفحہ (۱۵۰) چودھواں ایڈیشن۔

[2] متی باب (۳) نمبر (۴)۔

[3] عبد اللہ بن اوفی ایک صحابی بیان کرتے ہیں: "میں رسول اکرمؐ کے ساتھ چھ لڑائیوں میں شریک ہوا، اور ہم ٹڈیاں کھاتے تھے۔" (ترمذی ابواب الاطعمہ جزو ۸ صفحہ ۱۵ مطبوعہ مصر نیز بخاری پ ۲۲ کتاب الذبائح۔

بڑھی ہوئی تھی۔ اس وسیع سلطنت میں اسلام نے جو معاشی نظام رائج کیا اور اس سے جو نتائج حاصل ہوئے، اس کی تاریخ اور تفصیل ہمارے اس مقالے کا موضوع ہے۔

مدینہ حجاز کا دوسرا شہر مدینہ بھی تاریخی حیثیت سے کچھ کم نہیں۔ مدینہ منورہ ابتدائے اسلامی حکومت کا مرکز اور رسول کریمؐ اور خلفائے راشدینؓ کا دارالخلافہ رہ چکا ہے۔ گویا تاریخی حیثیت سے تاریخ عالم میں مدینہ منورہ ایک ایسی شاندار سلطنت کا پایۂ تخت رہا جس کی سرحدیں تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھیں، حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں اسلامی مملکت کی حدود بڑھتے بڑھتے عرب کے علاوہ ایشیا میں آرمینیا، ایران، مکران، اور پھر اس سے بھی آگے بلوچستان (سجستان) تک پھیل گئیں، پھر دوسری طرف افریقہ میں علاوہ مصر اور طرابلس کے تیونس، بربر، اور مراکش تک اسلامی خلافت کی حکمرانی تھی، اسی طرح براعظم یورپ میں بحیرۂ روم کے علاوہ مختلف جزائر حتیٰ کہ خود اندلس کا ایک حصہ مسلمانوں کے زیر نگیں آچکا تھا[۱]۔

جزیرہ نمائے سینا اور فلسطین حجاز کے صوبے سے شمالی جانب آگے قدم بڑھاؤ تو جزیرۂ نمائے سینا اور فلسطین واقع ہیں۔ یہ مقامات بھی تاریخ عالم میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ اس علاقے میں ہی یہودیت اور عیسائیت نے جنم لیا۔ توریت، زبور، اور انجیل جیسی قدیم مذہبی کتابوں کا یہیں نزول ہوا۔ فلسطین حضرت سلیمانؑ و داؤدؑ جیسے عظیم المرتبت انبیاءؑ کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔

شام شام عرب کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی ایک ہزار پانسو سال قبل فنیقی (Phoenicians.) اندرونی عرب سے آکر شام کے ساحل پر آباد ہو گئے۔ فنیقی فطرۃً بحر نورد واقع ہوئے تھے اپنے عروج کے زمانے میں تمام بحیرۂ روم پر چھا گئے۔ کیونکہ یہ بہترین ملاح اور تاجر تھے۔ ان کا مشہور شہر صور (ٹائر) تھا۔ جو بحری تجارت کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں وہ سامان تجارت لا لا کر جمع کرتے اور دوسرے ملکوں کو پہنچاتے تھے۔ انھوں نے

۱۔ تفصیل کے لیے لاحظہ ہو تاریخ طبری ۳۲ھ کے واقعات صفحہ (۲۸۱۷) مطبوعہ لیڈن نیز تاریخ زوال سلطنت روما از گبن جلد (۵) صفحہ ۵ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

بیشمار تجارتی چوکیاں نہ صرف بحیرۂ روم کے ساحلوں پر بلکہ جبل الطارق کے اس پار بھی قائم کیں[1]۔ اس طرح نو آبادیوں کا بھی سلسلہ جاری رہا۔ جس میں مرسی ایلیا (مارسلز) اب تک ان کا نام لیوا ہے۔

ان تجارتی چوکیوں اور نو آبادیوں نے خوب ترقی کی خصوصاً ۵۰۰ سنہ قبل مسیح میں قرطاجہ (کارتھیج) ایک بہت بڑی بحری قوت تھی جس کے جہاز بسلسلۂ تجارت دور دور افریقہ کے مغربی ساحلوں تک جاتے بلکہ شمال میں انگلستان کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوتے تھے[2]۔ ہنی بال جس کے فوجی کارناموں کا چہار دانگ عالم میں ڈنکا ہے کارتھیج ہی کا باشندہ تھا[3]۔ اس نامی گرامی جنرل نے اپنی قلیل فوجوں سے اسپینوں فرنگیوں (فرانسیسیوں) اور رومیوں کی کثیر فوجوں کو پے درپے شکستیں دی تھیں۔ قرطاجہ ایک بہت بڑا صنعتی مرکز بھی تھا۔ جہاں مصنوعات، خاص کر پارچہ بافی کی صنعت خوب ترقی پر تھی۔ یہ لوگ اسپین کے معدنوں میں کان کنی کرتے تھے، بہت سے علوم وفنون میں یونانی ان کے خوشہ چیں تھے[4]۔

"کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ فنیقی ملاحوں نے سوئز سے چل کر پورے براعظم افریقہ کا چکر لگایا اور تین سال کی مدت میں اس بحری سفر کو طے کیا ہر سال بحری سفر کرتے کرتے خشکی پر اتر پڑتے اور گیہوں بوتے اور فصل تیار ہوتی تو کاٹ کر پھر آگے بحری سفر پر روانہ ہو جاتے۔ اغلب یہ ہے کہ فنیقی ہندوستان اور لنکا سے بھی باقاعدہ تجارت کرتے تھے۔ ان ہی فنیقیوں نے حروف تہجی لکھنے کا طریقہ ایجاد کیا ورنہ اس سے قبل اشیا بلکہ خیالات کی تصویروں کے ذریعہ بول چال کا مطلب ادا کیا جاتا تھا[5]۔"

حیرہ والوں کے رقیب غسانی عرب بھی شام میں فرماں روائی کرتے تھے، حلب جیسے انتہائی شمالی مقام پر سینٹ پال کے زمانے میں عرب ریاست پائی جاتی تھی۔

۱۔ ہائی لینڈ: ہسٹری آف سیویلیزیشن صفحہ ۴۴۔ ۲۔ ہائی لینڈ: ہسٹری آف سیویلیزیشن صفحہ ۴۴۔
۳۔ ہائی لینڈ: ہسٹری آف سیویلیزیشن صفحہ ۱۱۲۔ ۴۔ قرطاجہ کی قدیم معاشی تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو ٹوٹین: اکنامک لائف آف دی اینشینٹ ورلڈ۔
۵۔ ہائی لینڈ: ہسٹری آف سیویلیزیشن صفحہ ۴۴۔

عراق عرب کا شمال مشرقی سرحدی صوبہ عراق انسانی تہذیب و تمدن کا قدیم گہوارہ سمجھا جاتا ہے، تاریخ اور آثار قدیمہ ــــ جن کا حال میں انکشاف ہوا ہے ــــ دونوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دجلہ اور فرات کے اس دوآبے کی زمین پر ہزارہا سال پہلے بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں، اور صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ بابل اور نینوا کے کھنڈر اب بھی زبانِ حال سے اپنی داستاں سنا رہے ہیں۔ سومیریا والوں (سومیرینز) کے متعلق جیسا کہ اب ثابت ہو چکا ہے یہ عرب ہی کے خانہ بدوش قبائل تھے۔ ان ہی لوگوں نے دجلہ اور فرات سے نہریں نکالی تھیں، اور پھر آپس ہی میں ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش شروع کی تو قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ "انھوں نے اپنی معاش یہی ٹھہرا لی تھی کہ راہوں پر منتظر کھڑے رہتے جو کوئی قافلہ آتا لوٹ لیتے تھے"[۱]

سرحد عراق و عرب پر حیرہ کی عربی مملکت تاریخ عالم میں بڑا عہد آفریں حصہ لے چکی ہے اور ساتھ ہی عربی تمدن و تہذیب کی آبیاری میں شہرۂ آفاق ہے۔

بحرین و عمان عرب کے جنوب مشرق میں بحرین و عمان بھی زرخیز علاقے تھے، تہذیب و تمدن اس قدر ترقی کر گئے تھے کہ وہاں بین الاقوامی تجارت کی منڈیاں بن گئی تھیں۔ جہاں اقصائے ایشیا و یورپ کے ماہر جمع ہوا کرتے تھے[۲] طاقتور تاجداروں کی حکمرانیاں وہاں دھاک بٹھائے ہوئے تھیں[۳]

یمن اس طرح عرب کے جنوب مغربی ساحل پر علاقہ یمن میں حمیری اور سبائی آباد تھے۔ جنھوں نے آج سے ہزاروں برس پہلے آبپاشی کے بڑے بڑے بند اور ساگر بنائے تھے[۴] یہیں کی مشہور ملکہ سبا تھی جو حضرت سلیمان کو

---

[۱] ۔ صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب نوفل آفندی صفحہ (۱۵) مطبوعہ بیروت۔ [۲] ۔ کتاب المحبر صفحہ (۲۶۵ تا ۲۶۶)۔ [۳] اشتقاق ابن درید صفحہ (۲۰۹) عقد الفرید لابن عبد ربہ جلد ۲ صفحہ (۶۷) سلیمان ندوی صاحب عربوں کی جہاز رانی صفحہ (۳۰) بحوالہ ابن حایک الہمدانی۔
[۴] ۔ یمن کے معاشی حالات پر وے من برٹرے نے ایک کتاب لکھی ہے بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا۔ عنوان "ارے بیا"

ملکۂ سبا نے جو دولت بھیجی اس کو توریت میں پڑھ کر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ایک یونانی مورخ اور سیاح اسٹرابو نے یمن کے ان قدیم باشندوں کے متعلق ایک انوکھی بات لکھی ہے جو ہمارے لیے باعث دلچسپی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ان قدیم عربوں میں اشتراکیت کا رواج تھا اور تمام مال واسباب مشترکہ ملک سمجھا جاتا تھا۔ اور سب سے زیادہ سن رسیدہ شخص ان کا رئیس ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں اسٹرابو لکھتا ہے کہ عورت بھی ان کے پاس مشترک ہوتی تھی، اور تمام بھائی مل کر ایک عورت سے شادی کرتے تھے۔ جب کوئی اس عورت کے پاس جاتا تو دروازے پہ اپنا عصا چھوڑ جاتا اور بڑے بھائی کے لیے شب مخصوص تھی، اور وہ ان کا سردار سمجھا جاتا تھا۔[1]

حضرت مسیحؑ سے قبل بھی ان میں سکہ کا رواج تھا۔[2] توقع ہے کہ یمن میں آثار قدیمہ کی تلاش ضرور بار آور ہوگی۔

ایک بات یقینی ہے کہ ان تمام مذکورۂ بالا سلطنتوں کے عروج کے زمانے میں بھی تمام عرب کے صوبے اور باشندے اسلام سے قبل ایک مرکز پر کبھی جمع نہیں ہوئے لیکن ہم جس زمانے کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں اس وقت ترقیات کے یہ کارنامے عہد کہن کی داستان بن چکے تھے۔

---

[1] - اسٹرابو III ۳۸۹ بحوالہ العرب قبل اسلام تالیف جرجی زیدان صفحہ ۱۳۸ نیز ملاحظہ ہو رابرٹسن اسمتھ کی کتاب کنزشپ اینڈ میارج ان ارلی اریبیا صفحہ ۱۵۰۔

[2] - یمن کے قدیم سکوں سے متعلق تفصیل تمدن عرب موسیو لی بان باب سوم صفحہ (۸۸) ملاحظہ کیجیے نیز ملر: سوڈارا بیان صفحہ (۶۷ - ۷۷)۔ نیز جرجی زیدان نے اپنی کتاب العرب قبل الاسلام کے جزء اول صفحہ (۱۳۶) الیمن القدیم میں ان کی تصویریں بھی دی ہیں۔ ان سکوں میں سب سے عجیب یہ شئے ہے کہ ایک سکہ پر اُلو کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ ۱۲۔

رسول کریمؐ کی ولادت کے زمانے میں عرب کی سیاسی حالت

یمن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کے زمانے میں یمن پر حبشی حکمرانی کر رہے تھے۔ ابرہہ بن الصباح الاشرم (نکٹا) یمن کا بادشاہ تھا۔ وہ عیسائی تھا۔ صنعاء یمن کے پائے تخت میں قلیس نام کا ایک بے مثل کلیسا اس نے تعمیر کیا تھا اور اہتمام کیا کہ لوگ اس کی زیارت کیا کریں۔ تاکہ بیت اللہ کا احترام عام قلوب سے نکل جائے۔ کہتے ہیں کہ بنو کنانہ کے قبیلے کا ایک آدمی رات کے وقت اس کلیسا کو اپنے قضاء حاجت سے گندہ کرکے بھاگ گیا۔ اس شرارت نے ابرہہ کو غضبناک کر دیا۔ حتیٰ کہ اس نے قسم کھائی کہ وہ کعبہ کو مسمار کرکے رہے گا۔ چنانچہ اپنا لشکر لیکر مکہ کی طرف چل دیا۔ اس لشکر میں ایک بہت بڑا ہاتھی تھا، جس کا نام محمود (Mammoth) اور ایک ہتنی بھی تھی[1]۔ یہ واقعہ اسی سال ہوا جس سال کہ رسول کریم صلعم پیدا ہوئے۔ ابرہہ نے مکے والوں کا مال بیرون شہر چھین لیا۔ ایک قدرتی آفت سے ابرہہ اور اس کا لشکر ہلاک ہو گیا۔ جس کا ذکر قرآن مجید کے سورۂ فیل میں موجود ہے۔ غرض کہ حبشیوں نے مکہ پر حملہ کیا تو صورتِ حال بہت خطرناک تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت نے مکہ والوں کو بچا لیا۔

عراق عراق پر ساسانی شہنشاہ حکمراں تھا اور جس وقت آنحضرتؐ نے نبوت کا اعلان فرمایا اس وقت عراق کے علاوہ ایرانی بڑھتے بڑھتے عمان۔ حضرموت اور یمن پر قابض ہو چکے تھے۔ اور یہ سمجھنے لگے تھے کہ گویا اندرونی

---

[1] تفسیر بیضاوی الجزالثانی صفحہ (۳۹) مطبوعہ نولکشور پریس تفسیر سورہ فیل بروایت ابن اسحاق۔ واقدی کامل ابن اثیر اور ابوالفدا نے ہاتھیوں کی تعداد زیادہ بتائی ہے۔ مگر قرآن ایک ہی ہاتھی کا ذکر کرتا ہے۔ حبشی زبان میں (Mammoth) بڑے گرانڈیل ہاتھی کو کہتے ہیں۔ ابرہہ کی مکہ پر چڑھائی کی مزید تفصیل تاریخ طبری از صفحہ ۹۳۶ تا ۹۳۹ مطبوعہ لیڈن نیز تفسیر طبری الجزء الثلاثون تفسیر سورۂ فیل ملاحظہ ہو۔

نجد کا علاقہ اور حجاز کا صوبہ ان کے زیر اقتدار آچکا ہے۔ چنانچہ جب ۶ھ میں آنحضرتؐ نے مختلف حکمرانوں کے نام اسلام کے دعوت نامے ارسال فرمائے تو خسرو پرویز (شاہ ایران) نے خط پڑھ کر اسے پارہ پارہ کر دیا اور کہا کہ "جو میری رعایا ہے وہ مجھے ایسا خط لکھتا ہے"[1] ساتھ ہی خسرو پرویز نے اپنے یمن کے گورنر کو جس کا نام باذان تھا حکمنامہ بھیجا کہ آنحضرتؐ کو ایران حاضر ہو کر ملنے کی ہدایت کرے، اور اگر آنحضرتؐ انکار کریں تو آنحضرتؐ کو گرفتار کر کے مدائن بھیجا جائے۔ باذان نے ایک اخلاق آمیز مکتوب دیکر آنحضرتؐ کی خدمت میں دو سوار بھیجے جو ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہوئے[2]

صوبہ جات شام و فلسطین وغیرہ

شام اور فلسطین شہنشاہ ہرقل کی سلطنت کا جزو بن چکے تھے، دومۃ الجندل جو مدینہ کے شمال مشرق میں فلسطین کی سرحد پر ایک ریاست تھی، اس کا حاکم اکیدر بن عبدالملک تھا۔ جو مذہباً عیسائی تھا، اور ہرقل شہنشاہ روم کا فرماں بردار تھا[3] علیٰ ہذا خیبر جو حجاز کی منڈی تھا یہودیوں کا مرکز تھا[4] اور حجاز و فلسطین کی سرحد پر واقع تھا۔

غرض معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو تمام زرخیز و شاداب علاقے، بڑے بڑے شہر، اور تجارتی مرکز اور تمام بڑی بندرگاہیں اجنبیوں کے قبضہ میں تھیں۔ صرف حجاز کا بنجر حصہ، اور نجد کا علاقہ دو ہی ایسے صوبے تھے، جن پر غیر عرب اقوام کا ابھی واقعی قبضہ نہیں ہوا تھا، اور یوں بھی اولاد اسمٰعیل کو یہ شرف حاصل رہا کہ وہ کسی کے غلام نہیں بنے۔ اپنی آزادی انہیں دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ابورغال نامی ایک شخص جو ثقیف کے قبیلہ کا آدمی تھا، ابرہہ کے لشکر کو مکہ پہنچانے میں راہبری کی تھی، کہتے ہیں کہ جب وہ مرا تو

1۔ تاریخ طبری مطبوعہ لیڈن ۶ھ ہجری کے واقعات صفحہ ۱۵۷۲۔

2۔ التنبیہ والاشراف مسعودی مزید تفصیل تاریخ طبری ۶ھ ہجری کے واقعات میں صفحہ ۱۵۷۱ تا ۱۵۷۵ ملاحظہ فرمائیے۔ 3۔ التنبیہ والاشراف مسعودی غزوہ دومۃ الجندل۔

4۔ تاریخ طبری عنوان خیبر صفحہ ۱۵۷۶ ۷ھ کے واقعات۔

عرب مدت تک اس کی قبر پر پتھراؤ کرتے رہے۔ ہر آنے جانے والے کا فرض تھا کہ ابورغال کی قبر پر پتھر پھینک کر اس بے غیرت سے انتقام لے۔[1]

مکہ کے ایک سردار "عثمان بن الحویرث الاسدی نے عیسائیت قبول کی تو قیصر روم نے اسے ایک تاج شہریاری سے سرفراز کیا اور ایک فرمان دے کر مکہ روانہ کیا جس میں حکم تھا کہ مکہ والے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں عثمان کے لیے بڑے اچھے مواقع تھے کیونکہ مکہ والے غلے اور دیگر ضروریات اور نیز اپنے تجارتی کاروانوں کے لیے مصر فلسطین اور شام کے رومی صوبوں کے دست نگر تھے اور وہ آسانی سے فرمان قیصری کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے لیکن عین لمحہ آخر میں عثمان ہی کے ایک رشتہ دار نے جلسہ میں اٹھ کر اعتراض کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ مکہ کے آزاد باشندے بادشاہت اور امرائیت کی بدعتوں کو کیسے قبول کر سکتے ہیں۔ اور اس خیال کا خوب مضحکہ اڑایا اور دم کے دم میں جلسہ کی رائے بدل گئی۔ عثمان بیزار ہو کر شام واپس چلا گیا اور قیصر روم نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ اپنی قلمرو مکہ والوں کے لیے بند کر دی اور ان کے جو تاجر اس وقت وہاں تھے ان کو قید کر لیا۔[2] قیصر اس وقت اس سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکا کیونکہ ایران سے جنگ چھڑ گئی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے قبل تجارت کی غرض سے شام فلسطین گئے اور ایک عیسائی تاجر نے آپ کو دعوت دی" رسول اللہؐ وعدہ کے موافق رات کو عیسائی تاجر کے پاس گئے اور اس سے باتیں کیں۔ وہاں ایران کا سوداگر بھی موجود تھا۔ عیسائی سوداگر نے اپنے قیصر روم کی بہت بڑائی بیان کی اور کہا کہ عربوں کو چاہیئے کہ وہ بھی قیصر روم کی رعایا بن جائیں اس سے ان کی بہت اصلاح و ترقی ہو جائیگی۔

---

[1] ۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ (۳۱) نیز تاریخ طبری صفحہ (۹۳۷) نیز کامل ابن الاثیر الجزری الجزء الاول صفحہ ۱۵۶۔
[2] ۔ عہد نبوی میں نظام حکمرانی از ڈاکٹر حمید اللہ جلد ۱ صفحہ ۱۶ بحوالہ الفاسی طبع یورپ صفحہ ۱۴۴ اسہیلی کی الروض الانف ۱۴۶/۱ لامنس کی فرانسی کتاب "مکہ ہجرت سے پہلے" صفحہ ۲۶۷، اشپرنگر کی جرمن سیرۃ و تعلیمات محمدی جلد ۱ صفحہ ۸۹ تا ۹۰۔

"عیسائی کی باتیں سن کر رسول اللہؐ خاموش رہے مگر ایرانی سوداگر بولا تم نے قیصر روم کی ایسی تعریفیں کیں جن میں سمجھ بہت تھوڑی ہے۔ اس کے علاوہ عرب قبائل کسی بادشاہ کے محکوم ہو کر نہیں رہے اور میں قیصر کی حکومت کو نہیں سمجھتا کہ عرب اس کے محکوم ہوں۔"

"اس کے بعد ایرانی تاجر نے اپنے شہنشاہ ایران کی اور اس کی حکومت کی بہت تعریف کی اور کہا کہ بہت سی باتوں میں عرب اور ایرانی مشابہ ہیں اور ان کا رنگ بھی ایک ہے۔ اس لیے عرب قبائل کو ہمارے ایران کے کسریٰ کا محکوم بن جانا چاہیے عرب کا اس میں فائدہ ہے۔"

"رسول اللہؐ دونوں کی باتیں سنتے رہے۔ یہاں تک کہ ایرانی اور عیسائی آپس میں سخت کلامی کرنے لگے۔ ہر ایک یہ کہتا تھا کہ ملک عرب ہماری حکومت کے اثر میں ہے اس لیے ہمارا محکوم ہے اور اہل عرب کو ہمارا ہی محکوم بن جانا چاہیے آخر رسول اللہؐ نے تبسم کر کے فرمایا کہ تم آپس میں نہ لڑو۔ عرب کسی کا بھی محکوم نہیں اس کو تو خدا نے حکومت کے لیے بنایا ہے۔ اگرچہ میری قوم آج خراب حالت میں ہے لیکن وہ محکوم کسی کی نہیں ہے اور نہ میں اس کو محکوم ہونے دونگا تم ہم پر حکومت کرنے کا خیال چھوڑ دو۔[۱]"

یہاں یہ یاد دلانا ہے کہ ایران و روم میں نسلہا نسل کی رقیبانہ آویزش زندگی و موت کی کشمکش میں مبدل ہو گئی تھی۔ کبھی یہ غالب آتے کبھی وہ، بہر حال ہر دو کمزور پڑتے جا رہے تھے۔ آغاز اسلام کے وقت بھی ان میں جنگ کی آگ بھڑکی ہوئی تھی اور ہر چیز کو خاکستر کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ مٹھی بھر قبائل بکر بن وائل نے ذیقار کے مقام پر شہنشاہ ایران کے عظیم لشکر کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ اس طرح "سلطنتوں" کا رعب ان خانہ بدوشوں میں ختم ہو کر ان کی اپنی صلاحیتوں کا شعور و احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

---

[۱] ۔ سیرت نبوی از شمس العلماء خواجہ حسن نظامی ص

عرب کا قدیم معاشی نظام

عرب اسلام کا گہوارہ ہے اس لیے اسلامی معاشیات کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے عرب کے قدیم معاشی نظام کو پس منظر کے طور پر اپنے سامنے رکھ لینا ناگزیر ہے چنانچہ اس فصل میں عرب کے قدیم معاشی نظام کا ایک سرسری خاکہ پیش کیا جاتا ہے، تاکہ اسلامی معاشیات کو سمجھنے میں مدد ملے ضمناً یہ بات بھی برمحل معلوم ہوئی کہ مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

عراق، یمن و شام میں رسول کریمؐ کی بعثت کے وقت جو حالات تھے ہم انھیں مختصر طور پر بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم حجاز جس سے اسلام کا قریب ترین تعلق ہے، اس کے معاشی نظام کی کچھ تفصیل پیش کرتے ہیں۔ سہولت کی خاطر نیز طوالت سے بچنے کے لیے ہم حجاز کے صرف تین ہی اہم مقامات کا تذکرہ کریں گے۔

(الف) طائف (ب) مکہ۔ (ج) مدینہ۔

پہلی فصل میں طائف کے صرف مختصر حالات بیان کیے جائیں گے۔ اس کے بعد البتہ علیحدہ علیحدہ فصل میں مکہ اور مدینہ کا تذکرہ تفصیل سے کیا جائیگا کیونکہ مکہ اسلام کا ابتدائی گہوارہ تھا، اور مدینہ اسلام کا سب سے بڑا دینی اور سیاسی مرکز بنا تھا۔

پہلی فصل: طائف

ایامِ جاہلیت میں طائف کی سیاسی مذہبی معاشرتی اور معاشی حالت

محلِ وقوع طائف کا شہر مکہ سے ۷۵ میل دور جنوب مشرق کی جانب واقع ہے سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فیٹ بلند ہے۔ طائف کی زمین عموماً زرخیز اور سیر حاصل ہے۔

سیاسی حالت قدیم زمانے میں مضر کا قبیلہ طائف میں آباد تھا۔ لیکن بنو عامر کی جب آبادی بڑھی تو ایک خونریز معرکہ کے بعد طائف پر اسی بنو عامر کے قبیلہ نے غلبہ حاصل کر لیا۔ بنو عامر موسم گرما طائف میں بسر کرتے اور سردیوں میں نجد کے علاقے میں چلے جاتے تھے جو ان کا اصلی وطن تھا۔ لیکن بنو ثقیف نامی قبیلہ طائف ہی کے گرد و نواح میں سال کے بارہ مہینے قیام پذیر رہتا تھا۔ بنو ثقیف کے لوگ طائف کی اراضی کے کاشتکار تھے اور رفتہ رفتہ جب ان کی آبادی بڑھ گئی تو بنو عامر پر اس نے غلبہ حاصل کر لیا تھا[۱]۔ اس کا تعلق طائف کی اراضی سے زمینداری کا تھا۔

مذہبی حالت ثقیف کے لوگ "لات" کی پرستش کرتے تھے جو کہ ان کی قومی دیوی تھی۔ مورخ طبری کا بیان ہے کہ "لات" ثقیف کی ایک فاحشہ عورت تھی جس کی یہ پرستش کیا کرتے تھے[۲]۔ ۹ھ میں ثقیف کا ایک وفد رسول کریمؐ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا اور اس نے اسلام قبول کیا۔ جب وفد کے لوگ مسلمان ہو کر طائف واپس پہنچے تو ثقیف کی عورتیں برہنہ سر "لات" پر گریہ و بکا کرتی ہوئی گھروں سے نکل آئیں اور اس کا نوحہ پڑھ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ ؎

الا۔ أبكين دفاع اسلمها الرضاع لم يحسنوا المصاع

ترجمہ:۔ ہم اپنے محافظ پر روتے ہیں جسے اس کے خادموں نے چھوڑ دیا اور انہوں نے اس کی حفاظت میں داد مردانگی نہیں دکھائی۔

مغیرہ بن شعبہؓ جن کو آنحضرتؐ نے اہل طائف کی تعلیم کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ بُت پر تبر مار رہے تھے، اور کہتے جاتے تھے کہ تیرا بُرا ہو چنانچہ اسے توڑ کر انہوں نے اس کے چڑھاوے اور زیور کو ضبط کر لیا[۳]۔

معاشرتی حالت ثقیف کی سماجی زندگی میں لونڈی غلام کا بھی وجود تھا چنانچہ طائف کے محاصرہ کے دوران میں کچھ غلام طائف والوں کے

۱۔ تاریخ الکامل ابن الاثیر الجزری الجزء الاول صفحہ (۲۵۲) ذکر غلبۃ ثقیف علی الطائف۔

۲۔ تاریخ طبری ۸ھ کے واقعات۔ ۳۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۶۹۲ ۹ھ کے واقعات۔

رسول کریمؐ کی خدمت میں مسلمان ہو کر چلے آئے۔ رسول اکرمؐ نے انھیں آزاد کر دیا۔ بعد ازآں ثقیف کا ایک وفد مدینہ حاضر ہوا اور اسلام لے آیا تو ان غلاموں کے مالکوں اور سرداروں نے عرض کیا کہ ان کے غلام انھیں واپس کیے جائیں۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ میں کبھی ایسا نہ کروں گا۔ وہ تو خدا کے آزاد کردہ ہیں[1]۔

ثقیف کے لوگ دولتمند تھے اس لیے ان کی عورتیں زیور بھی پہنتی تھیں۔ چنانچہ "عثمان بن مظعون کی بیوی خویلہ بنت حکیم نے رسول کریمؐ سے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! اگر طائف کو آپؐ خدا کے حکم سے فتح کر لیں تو مجھے بادیہ بنت غیلان بن سلمہ یا فارعہ بنت عقیل کا زیور عطا کیجیے۔ بنو ثقیف کی عورتوں میں سب سے زیادہ زیور ان ہی دو عورتوں کے پاس تھا۔ اس کے جواب میں رسول اللہؐ نے ان سے فرمایا" اور چاہے اب تک مجھے ثقیف کے بارے میں اجازت نہ ملی ہو؟" خویلہ آپؐ کے پاس سے مایوس چلی آئیں[2]۔

قبیلہ ثقیف کے لوگ بڑے بہادر تھے، یہی وجہ ہے کہ ثقفیوں کے کارنامے تاریخ اسلام میں اہمیت رکھتے ہیں۔ رسول کریمؐ نے فتح مکہ کے بعد طائف کا محاصرہ کیا۔ اس محاصرہ میں عیینہ بن حصن بھی شریک تھا۔ اس نے کہا "بخدا میں تمھارے ساتھ ثقیف سے لڑنے نہیں آیا تھا بلکہ میرے آنے کی غرض اتنی تھی کہ اگر محمدؐ طائف فتح کر لیں تو مجھے ایک لونڈی مل جائے اور اسکے بطن سے ایک بہادر لڑکا پیدا ہو کیونکہ یہ قبیلہ جنگجو اور بہادر ہے[3]۔

معاشی حالت

طائف کی معاشی زندگی میں دو امور اہم ہیں (۱) زمیندار اور کاشتکار میں

---

[1] - تاریخ الکامل ابن الاثیر الجوزی الجزء ثانی صفحہ (۱۰۱)۔ [2] تاریخ طبری صفحہ ۱۶۷۳ ۸ھ کے واقعات

[3] - تاریخ طبری ۸ھ کے واقعات صفحہ ۱۶۷۴ نیز ابن ہشام صفحہ (۳۸۲)۔

کشمکش (۲) دولتمند طبقہ اور غریب طبقہ میں کشمکش۔

زمینداری نظام کی ابتدا طائف کے سیاسی حالات میں اوپر بیان ہوا ہے کہ بنو عامر کا طائف پر غلبہ تھا اور طائف کے گرد و نواح میں ثقیف کے لوگ آباد تھے۔ چنانچہ "ثقیف کے لوگوں نے دیکھا کہ وہاں کے درخت اور ان کے پھل بہت اچھے ہیں تو انھوں نے بنو عامر سے کہا کہ یہ زمین تمہارے خیال میں کاشت کے قابل نہیں ہے، بلکہ دودھ دینے والے جانوروں کی چرائی کے قابل ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم لوگ مویشی پالنے کو ترجیح دیتے ہو اور درخت نہیں اگاتے اور ہم ایسے لوگ ہیں جن کے پاس مویشی نہیں ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ یہاں کاشتکاری بھی ہو، اور دودھ دینے والے جانور بھی رہیں اور ساتھ ہی تمھیں کچھ محنت بھی اٹھانی نہ پڑے تو تم اپنے شہر کی زمینات ہمارے حوالے کر دو۔ ہم اس میں ہل چلائیں گے، درخت اگائیں گے کنویں کھودیں گے، نیز ہم تم سے کچھ محنت نہ لیں گے، جو کچھ محنت کرنی ہوگی وہ سب ہم کر لیا کریں گے۔ اور پھر جب پھل پک جائیں گے تو تم کو پورے آدھے پھل دیا کریں گے اور ہم اپنی محنت کے معاوضے میں آدھے پھل لیں گے۔ چنانچہ اس بات پر بنو عامر آمادہ ہو گئے اور اپنی زمینات ان کے حوالے کر دیں[1]۔ غرض اس طرح بنو عامر زمیندار بن گئے۔ اور ثقیف کے لوگ کاشتکار بن کر ان کی زمینات پر کام کرنے لگے اور لگان میں پیداوار کا نصف حصہ ادا کرتے رہے۔

زمیندار اور کاشتکار میں کشمکش جب بنو عامر اور ثقیف میں بٹائی (مٹائر سسٹم) کا معاہدہ طے ہو چکا تو "ثقیف طائف میں آ بسے اور انھوں نے شہر کی زمینات کو آپس میں تقسیم کر لیا اور زمین پر کام کرنے لگے۔ وہ انگور اور دیگر پھل دار درختوں کی کاشت کرتے تھے اور ایک زمانے تک جو کچھ بنو عامر سے معاہدہ ہوا تھا اس کو پورا کرتے رہے اس دوران میں جب کبھی

---

[1] تاریخ الکامل ابن الاثیر الجزری الجزو الاول صفحہ (۲۵۳) ذکر غلبۃ الثقیف علی الطائف۔

ثقیف پر جو کاشتکار تھے دیگر عرب حملہ آور ہوتے تو بنو عامر جو زمیندار تھے ان کی حفاظت کرتے۔ پھر جب ثقیف کی کثرتِ آبادی ہوئی اور انھیں وقعت حاصل ہوگئی تو انھوں نے طائف کے اطراف ایک شہر پناہ تعمیر کی اور اس کو مضبوط کیا۔ اور بنو عامر کو جو نصف پھل پیداوار میں ادا کیا کرتے تھے وہ ادا کرنا چھوڑ دیا۔ بنو عامر نے ان سے اپنا حق لینا چاہا لیکن انھیں وصول کرنے کی قوت نہ تھی۔ پس آپس میں لڑائی ہوئی لیکن (بنو عامر) کامیاب نہ ہو سکے۔[1]

تجارت۔ مکہ کے مقابلے میں طائف کی اراضی خوب زرخیز تھی۔ طائف کے اطراف و اکناف کی وادیوں میں خاصی پیداوار حاصل ہوتی تھی جس کو وہ باہر بھیجتے تھے۔ خارجہ تجارت میں گیہوں، زبیب (منقہ) اور لکڑی نمایاں تھی۔[2] یہ اپنی پیداوار کو اطراف و اکناف اور خاصکر مکہ میں بھیجتے تھے۔ ثقیف کا سردار غیلان بن سلمۃ الثقفی مکہ کے سردار ابوسفیان بن حرب کے ساتھ تجارت کی غرض سے عراق بھی گیا تھا۔ "کسریٰ (شاہِ ایران) نے غیلان سے سوال کیا، بتا تیری غذا کیا ہے؟ غیلان نے جواب دیا کہ گیہوں کی روٹی۔ کسریٰ نے کہا جب ہی تو تو عقل کی باتیں کرتا ہے۔ عقل گیہوں کھانے سے آتی ہے۔ کھجور اور دودھ سے نہیں۔ پھر کسریٰ نے اس کا سامانِ تجارت دوگنی قیمت پر خرید لیا"[3]

"طائف میں یہودیوں کی بھی ایک جماعت تھی جو یمن اور یثرب سے نکال دی گئی تھی، اور یہاں وہ تجارت کے لیے مقیم ہوگئی تھی"[4] طائف میں رسول اللہؐ نے یہودیوں کا ایک مدرسہ بھی دیکھا تھا جہاں یہودی مذہب کی تعلیم ہوتی تھی۔"[5]

---

[1] تاریخ الکامل ابن الاثیر الجوزری الجزء الاول صفحہ (۲۵۳) ذکر غلبۃ الثقیف علی الطائف۔ [2]۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد (۴) عنوان "طائف"۔
[3]۔ کتاب الاغانی ج ۱۲ صفحہ (۴۸) اخبار غیلان بن سلمۃ۔
[4]۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۵۶) "الطائف" [5] سیرت نبوی از شمس العلما خواجہ حسن نظامی صاحب۔

صنعت و حرفت

زراعت اور تجارت کے علاوہ طائف کے لوگ صنعت و حرفت میں بھی مشغول رہتے تھے ۔ طائف کی خاص صنعت چرم سازی تھی، کہا جاتا ہے کہ وہاں دباغت کے کارخانے اس قدر زیادہ تھے کہ اس کی وجہ سے آس پاس کی ہوا بدبودار ہوگئی تھی[1] چنانچہ مشہور جغرافیہ دان الہمدانی المتوفی ۳۳۴ھ/۹۴۵ء لکھتا ہے کہ "طائف زمانۂ جاہلیت کا ایک قدیم شہر ہے اور یہ بلد الدباغ (دباغت کرنے والوں کا شہر) کہلاتا ہے، جہاں چمڑوں کی دباغت کی جاتی ہے[2]"

دیگر پیشے

طائف میں جبکہ زراعت و تجارت، اور صنعت و حرفت اس قدر ترقی یافتہ تھی تو لازم ہے کہ اور پیشے بھی ہوں گے ۔ تاریخوں کا زیادہ تفصیلی مطالعہ کرنے سے ان کا پتہ چل سکتا ہے، یہاں ہم اختصار پر اکتفا کریں گے تاکہ ایک سرسری اندازہ ہو جائے ۔ طائف میں لوہار بھی رہتے تھے، چنانچہ مورخ بلاذری المتوفی ۲۷۹ھ کا بیان ہے کہ "رسول اللہ کی خدمت میں طائف والوں کے غلاموں میں سے چند غلام حاضر ہوئے ان میں ایک الازرق تھے ۔ یہ رومی غلام تھے اور لوہاری کا کام جانتے تھے[3]"

"غیلان بن سلمۃ الثقفی کی خواہش پر شاہ ایران نے ایک ایرانی انجنیر (مہندس) کو بھیجا جس نے طائف میں قلعہ تعمیر کیا ۔ یہ پہلا قلعہ تھا جو طائف میں بنایا گیا[4]"

طائف میں دیگر پیشہ وروں کے علاوہ طبیب وغیرہ بھی تھے ۔ چنانچہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا تو "بنو عامر کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں عرب کا سب سے بڑا طبیب ہوں[5]"

---

۱ ۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد (۴) عنوان "طائف"

۲ ۔ کتاب صفۃ جزیرۃ العرب ۔ الہمدانی صفحہ (۱۲۰) مطبوعہ لیڈن ۔

۳ ۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۵۶) ۔ طائف ۴ ۔ کتاب الاغانی الجزء الثانی والعشر صفحہ (۴۸) اخبار غیلان بن سلمۃ ۔

۵ ۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۱۴۶)

طائف میں حرث بن کلدۃ الثقفی نامی ایک اور طبیب تھا۔ اس نے مختلف شہروں کا سفر کیا تھا اور ایران جا کر علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہیں اپنی ابتدائی مشق جاری رکھی اور ادویات اور بیماریوں میں مہارت حاصل کی یہ طبیب عہد رسالت دور خلافت راشدہ اور کچھ مابعد زمانے تک زندہ رہا اور بے شمار لوگ اس کے ہاں علاج کے لیے آتے تھے۔[1]

طائف میں انگور کی کثرت تھی، یہی وجہ تھی کہ طائف میں باضابطہ شراب خانے بنے ہوئے تھے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عصری شراب خانوں کی طرح طائف کے ان شراب خانوں کی جانب سے عیاشیوں کے لیے عورتیں بھی فراہم کی جاتی تھیں۔ ابوسفیان بن حرب زمانۂ جاہلیت میں طائف گیا تھا اور ابومریم سلولی ایک شراب فروش کے ہاں مہمان ہوا تھا، وہاں ابوسفیان کے پاس ایک عورت سمیہ پیش کی گئی اور اس سے زیاد کا حمل ٹھہر گیا۔[2]

سودی کاروبار

مورخ بلاذری کا بیان ہے کہ "طائف کے لوگ (بلا کے) سود خوار تھے[3] قبیلہ ثقیف کے بعض لوگوں نے تو سودی کاروبار کو اپنا پیشہ ہی بنا لیا تھا۔ ان کا کاروبار صرف طائف تک محدود نہ تھا۔ بلکہ مکہ والوں کو بھی سودی قرض دیا کرتے تھے اور بالعموم سود بشکل زر و اشیاء وصول کرتے تھے چنانچہ ثقیف کے لوگ جاہلیت میں بنو مغیرہ[4] قرض دیا کرتے تھے۔ جب مدت ادائیگی پہنچتی تو وہ (بنو مغیرہ) کہتے کہ ہم مزید سود دیں گے۔ تم ہمیں مزید مہلت دو۔[5]

سودی کاروبار کا طریقہ

"جاہلیت میں ثقیف کے سود لینے کا یہ طریقہ تھا کہ یہ لوگ کسی شخص کو کسی مدت تک کے لیے قرض دیتے

---

[1] ابن ابی صبعۃ، عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۰۹

[2] تاریخ الکامل ابن الاثیر الجزء الثالث ۴۴ھ کے واقعات بعض مورخین اس واقعہ کو غلط قرار دیتے ہیں

[3] فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۵۶) الطائف۔

[4] بنو مغیرہ قریش مکہ کی ایک شاخ تھی۔

[5] تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۵۵) آیت: لا تاکلوا الربوا اضعافاً بروایت ابن جریج۔

تھے جب قرض کی ادائی کا وقت آتا تو قرض خواہ مقروض سے کہتا کہ یا تو میری رقم ادا کر دو یا اس میں زیادتی قبول کرو۔ اگر مقروض کے پاس مال ہوتا تو وہ ادا کر دیتا ورنہ زیادتی کو قبول کر کے ایک سال کی اور مہلت لے لیتا۔ چنانچہ اگر ایک سال کی عمر والی اونٹنی واجب الادا ہوتی تو دوسرے سال دو سال عمر والی اونٹنی مقروض پر واجب الادا ہوتی پھر تیسرے سال تین سال عمر والی اونٹنی طلب کرتا۔ اگر اس کے بعد نہ دیتا تو چار سالہ اونٹ طلب کرتا۔ غرض افزائش زیادتی کا یہ سلسلہ مہلتوں کی زیادتی کے ساتھ یوں ہی بڑھتا رہتا تھا۔"

"وزر میں بھی یہی طریقہ مروج تھا۔ یعنی مقروض مدتِ مقررہ پر رقم ادا نہ کر سکتا تو دوسرے سال دوگنی رقم وصول کرتا۔ چنانچہ اگر سَو ۱ واجب الادا ہوتے تو دوسرے سال دو سَو ۲ کی رقم مقروض پر واجب الادا ہو جاتی تھی، پھر بھی ۲ ادا نہ کرتا تو تیسرے سال چار سَو ۴۔ غرض یوں ہی ہر سال کی مہلت سود کے اضافہ کی وجہ بنتی جاتی تھی"[1]

طائف کے اصل دار قبیلہ ثقیف کے چار بھائی سودی کاروبار میں بہت مشہور تھے ان کا کاروبار مکہ تک پھیلا ہوا تھا "ثقیف کے چار بھائی جن کے نام مسعود۔ عبد یالیل۔ حبیب۔ اور ربیعہ تھے"۔ یہ چاروں عمرو بن عمیر الثقفی کے بیٹے تھے۔ اور بنو مغیرہ کو قرض دیا کرتے تھے"[2] ان ہی بھائیوں کے ایک سودی کاروبار کے مقدمہ نے اس قدر طول کھینچا کہ یہ مقدمہ آنحضرتؐ کے پاس مدینہ میں پیش ہوا۔ اور اسی سودی مقدمہ کے سلسلہ میں قرآنی آیت "وذروا ما بقی من الربوٰا" (مابقی سود نہ لو) نازل ہوئی۔ تفصیل اس قصہ کی یہ ہے کہ "ثقیف کے چار بھائی مسعود عبد یالیل۔ حبیب اور ربیعہ بن عمیر الثقفی یہ چاروں بنو مغیرہ کو قرض دیا کرتے تھے اور وہ انھیں سود ادا کرتے تھے۔ جس وقت رسول کریمؐ طائف تشریف لے گئے تو یہ چاروں بھائی مشرف بہ اسلام ہوئے، اور بنو مغیرہ سے سود طلب کیا۔ بنو مغیرہ نے کہہ دیا کہ بخدا! ہم اسلام میں تو سود نہیں دیں گے۔ خدا نے اس کو مسلمانوں سے

---

[1] ۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ ۵۹ آیت: لا تاکلوا الربوٰا اضعافاً بروایت ابن جریج۔
[2] ۔ تفسیر طبری الجزء الثالث صفحہ (۶۵) آیت: وذروا ما بقی من الربوٰا۔

ہٹا دیا ہے۔ بالآخر وہ اپنے اس قضیہ کو عتاب ابن اُسیدؓ کے پاس لے گئے جو آنحضرتؐ کی طرف سے مکہ کے قاضی و والی تھے۔ عتابؓ نے فریقین کے قضیہ کو لکھ کر آنحضرتؐ کی خدمت میں روانہ کیا۔ سود کی یہ رقم بہت بڑی تھی۔ اُسی پر قرآن کی "وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا" والی آیت نازل ہوئی (یعنی سود کی بقیہ رقم طلب نہ ہو)[1] اُن اصل واروں کی ذہنیت میں اتنا انقلاب ہو چکا تھا کہ قرآن پاک کے حکم کو سن کر فوراً مابقی واجب الوصول سودی رقم سے دست بردار ہو گئے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ بلا کے سود خوار تھے۔ چنانچہ رسول کریمؐ نے طائف کے باشندوں سے جو معاہدہ کیا تھا۔ اس میں سود نہ لینے کے متعلق بھی معاہدہ کی دستاویز میں تذکرہ تھا۔ رسول کریمؐ کا یہ صاف منشا تھا کہ غریب طبقے کو سودخواروں کے پنجے سے چھڑایا جائے۔ معاہدہ میں سود سے اجتناب کا جو تذکرہ ہے مورخ بلاذری نے اس کی یہ وجہ لکھی ہے کہ سود اور شراب سے انکو خصوصیت کے ساتھ روکنے کا سبب یہ تھا کہ یہ لوگ بلا کے سود خوار تھے[2] بلاذری نے تو نہیں البتہ خود بلاذری کے اُستاذ ابو عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ نے اپنی کتاب "کتاب الاموال" میں معاہدہ کے پورے متن کو بھی نقل کیا ہے۔ سود سے متعلق دستاویز کے یہ الفاظ ہیں۔

وَمَا كَانَ لَهُمْ فِي النَّاسِ مِنْ دَيْنٍ فَلَيْسَ عَلَيْهِمْ إِلَّا رَأْسُهُ[3]

ترجمہ:۔ لوگوں کے ذمہ ان کا جو قرض واجب الوصول ہے اُس میں سے ان کو (ثقفیوں کو) صرف راس المال (اصل کیپیٹل) ملے گا۔

دولتمند طبقہ اور غریب طبقہ میں کشمکش جس شہر یا ملک میں ایک طرف چند بڑے بڑے دولتمند ہوں، اور دوسری طرف غریب طبقے کی اکثریت ہو تو ان میں کشمکش کا پیدا ہونا لازمی ہے چنانچہ طائف کے لوگ بھی دو جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے" قبیلۂ ثقیف کے دو بطن (گروپ) تھے ایک احلاف دوسرے بنو مالک۔ اس کاشتکاری میں احلاف کا بہت کچھ حصہ تھا

---

[1] تفسیر طبری ج ۳ صفحہ ۵۵

[2] فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۵۶) الطائف ۔ [3] کتاب الاموال ابو عبید قاسم بن سلام صفحہ (۱۹۲) فقرہ (۵۰۶) مطبوعہ مصر۔

چنانچہ وہ بنو مالک پر احسان جتایا کرتے تھے۔ کچھ دن بعد احلاف بہت دولتمند ہو گئے اوران کے پاس بہت سے گھوڑے ہو گئے[۱] نتیجۃً بنو مالک اوران کے حلیف بنو نصر اور احلاف کے درمیان سخت لڑائی ہوئی۔ جس میں احلاف فتحمند ہوئے اور انھوں نے بنو مالک کو طائف سے نکال باہر کیا[۲]۔ اس کے بعد بھی ان میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ ان ہی لڑائیوں نے شہر طائف کی معاشی ترقی کو مفلوج کر دیا[۳]

دوسری فصل: مکّہ

ایام جاہلیت میں مکہ کی مذہبی سیاسی معاشرتی، تعلیمی اور معاشی حالت

آبادی مکہ کی آبادی قریشی قبائل پر مشتمل تھی[۴]۔ ان قبائل کے آبا و اجداد ایک ہی تھے۔ پچھلے زمانے میں قصی بن کلاب پہلا شخص ہے جس نے قریش کو عزت بخشی اوران سب کو ایک جا اکٹھا کیا اور مکہ میں لا بسایا ورنہ اس سے قبل وہ متفرق جگھوں میں بے آبروئی سے زندگی بسر کرتے تھے[۵]۔

---

[۱] ۔ تاریخ الکامل ابن الاثیر الجزء الاول صفحہ (۲۵۳) ذکر غلبۃ الثقیف۔

[۲] ۔ " " " " "

[۳] ۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد (۴) صفحہ (۶۲۱) عنوان " طائف "

[۴] ۔ قریشی قبائل کے ناموں وغیرہ کی تفصیل کے لیے کتاب المحبر محمد بن حبیب صفحہ (۱۶۸) قبائل قریش البطاح وقبائل قریش الظواہر ملاحظہ ہو۔

[۵] ۔ تاریخ یعقوبی الجزء الاول صفحہ ۲۰۷ ۔ ہر چند تاریخ یعقوبی میں لکھا ہے کہ مکہ میں آباد ہونے سے قبل قریش کے افراد متفرق مقامات میں بے آبروئی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن یہ امر ابھی تحقیق طلب ہے ۔ ورنہ عام طور سے یہ خیال ہے کہ قریش جس نسل سے تھے اس نسل کا ممالک عرب بالخصوص حجاز پر مدتوں اقتدار رہا ہے۔ بعض دفعہ اسرائیلی بادشاہوں نے بنی اعمام ہونے کی وجہ سے عرب کے ان ہی حجازی سرداروں کے پاس پناہ بھی لی ہے۔ قیدار اور عدنان کے حالات پڑھنے سے بھی ان امور کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہی لوگ قریش کے اجداد تھے۔ یہی لوگ بنی اسمٰعیل میں شامل اور ابراہیم الخلیل کی اولاد ہیں۔

مذہبی حالت جاہلیت میں مکے کے باشندے تین ساڑھے تین سو سال سے بتوں (دیوی اور دیوتاؤں) کی پرستش میں مبتلا تھے۔ خود کعبہ جس کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، اور قرآنی الفاظ میں جس کی یہ شان ہے۔ ...

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا (ترجمہ) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے (برمن عبادت) بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔

قرآن پ۴ آل عمران ۳ ع ۱۰

صنم کدہ بن چکا تھا۔ اور اس میں (۳۶۰) بُت جمع تھے۔ جن میں بعض گڑیوں سے زیادہ چھوٹے تھے۔ لیکن ہم یہاں ان تفصیلات میں نہ جائیں گے۔ بلکہ ان کے مذہب کے صرف اس پہلو سے بحث کریں گے جس کا اثر ان کی معاشی زندگی پر پڑتا تھا۔

"ہبل مکہ میں قریش کا سب سے بڑا بت تھا اور کعبہ کے عین وسط میں ایک کنویں پر رکھا ہوا تھا۔ اس کنویں میں کعبہ کے چڑہاوے ڈالے جاتے تھے۔ اس کے پاس سات پانسے تھے۔ ہر ایک پر کچھ الفاظ کندہ تھے۔ منجملہ ان کے ایک تیر پر "دیت" کا لفظ تھا۔ مطلب یہ تھا کہ جب قریش میں دیت کے متعلق اختلاف رائے ہوتا کہ کون دیت ادا کرے تو ان سات پانسوں کو باہم ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیتے تھے، پھر جس کے نام دیت کا پانسہ نکل آتا وہی دیت ادا کرتا۔[1]

"ایک پانسہ پر "ہاں" لکھا ہوا تھا۔ جب قریش کوئی کام کرنا چاہتے تو ان ہی پانسوں کو ملا کر ڈالتے، اگر جواب میں "ہاں" نکلتا تو اس پر عمل کرتے تھے ایک پانسہ پر "نہیں" لکھا تھا ایک اور پانسہ پر لکھا تھا "پانی" چنانچہ جب قریشی کنویں کھودنا چاہتے تو اس پانسہ کو دوسروں کے ساتھ ملا کر ڈالتے، اگر جواب میں یہ پانسہ نکل آتا تو کنویں کھودتے۔"

"اسی طرح جب قریش بچہ کا ختنہ کرنا چاہتے یا نکاح کرنا چاہتے یا ان کو کسی کے نسب میں شک ہو جاتا تو "ہبل" دیوتا کے پاس سو درہم اور قربانی کی بھیڑ بکریاں لے جاتے اور یہ چیزیں پانسہ پھینکنے والے کو دیتے۔ علیٰ ہٰذالقیاس کسی اور معاملے کے متعلق جس کو وہ کرنا چاہتے پانسے ڈلواتے پھر اس کے جواب میں "ہاں" نکل آتا تو اس کام کو کرتے اور اگر "نہیں" نکلتا تو اس کام کو ایک سال کے لیے موخر کر دیتے۔"

[1] تاریخ طبری صفحہ (۱۰۷۵)

"بہر حال اپنے تمام معاملات کو اسی دستور پر وہ انجام دیتے۔ اجازت نکلتی تو کرتے، ممانعت آتی تو نہ کرتے[1] بھیڑ بکری کے علاوہ اونٹ، اور گوسالے وغیرہ بھی بت کی نذر کرتے اور ان کا گوشت بھی پجاری آپس میں تقسیم کر لیتے[2]

بتوں کے پاس خزانہ رہتا تھا

لوگ بتوں پر زر و جواہر چڑھاتے کعبہ کے چڑھاوے، کعبہ کے کنویں میں ڈالے جاتے پجاریوں کو جو دولت بطور نذر کے ملتی اس کو وہ وہیں دفن کر رکھتے گویا دیوتا ان کی نگہبانی کر رہا ہے۔ چنانچہ خالد بن ولید نے نخلہ میں عزیٰ کو جو بنو شیبان کا بت تھا جب توڑا تھا تو اس بت سے بہت سے زر و جواہر نکلے۔ انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح مغیرہ بن شیبہ نے لات کو جو کہ طائف کی دیوی تھی توڑ ڈالا اور اس کے خزانے اور زیور پر قبضہ کر لیا[3]۔ کعبے میں زمزم کے کنوئیں میں دو ہرن سونے کے تھے، جن پر موتی اور جواہرات تھے۔ ان زیورات کے علاوہ سات تلواریں بھی تھیں۔ عبد المطلب پہلے شخص ہیں، جنھوں نے کعبہ کے لیے سونے کا دروازہ بنایا[4]۔

سیاسی حالت

ابتداً قصی بن کلاب قریش کے ایک معمولی سردار تھے۔ مگر نہایت ہوشیار اور معاملہ فہم۔ قصی ہی نے ایک مشک شراب اور تھوڑے عود کے معاوضہ میں ابو غبشان سے کعبہ کی تولیت خرید لی۔ اس پر قبیلہ خزاعہ کے لوگ بگڑے اور قصی پر چڑھ آئے۔ تب انھوں نے اپنے بھائی سے مدد مانگی اور اس کے ساتھ خزاعہ سے لڑے[5] جس میں وہ کامیاب ہوئے اور خزاعہ کو مکہ سے نکال باہر کیا۔ مورخ ابن قتیبہ کی بات پر اگر اعتبار کر لیا جائے تو خود "قیصر روم نے قصی کی اعانت کی تھی[6]"

۱۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۰۷۵)۔ ۲۔ تفصیل تاریخ طبری ص ۱۱۴۵ ۳۔ تاریخ طبری ص ۱۶۹۲

۴۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۰۰۸) نیز طبقات ابن سعد جزو اول صفحہ (۱۰۵)

۵۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۰۹۴)۔

۶۔ معارف ابن قتیبہ صفحہ ۲۱۵۔ ملوک شام مطبوعہ مصر

اب "قصی بلا شرکت غیرے کعبہ کے متولی اور (مکہ کے) حاکم ہو گئے۔ انھوں نے قریش کے تمام قبیلوں کو اکٹھا کیا اور ان کو مکہ کی اونچی جگہ پر آباد کیا۔ جن میں بعض اب تک گھاٹیوں اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سکونت رکھتے تھے۔ انھوں نے خزاعہ کے مکان قریش میں تقسیم کر دیئے[۱] پھر" قصی ہی نے اپنی قوم اور اہل مکہ سے کہا کہ وہ ان کو اپنا سردار مان لیں۔ ان کی خواہش کے مطابق سب نے منظور کر لیا۔ اس طرح کعب بن لوئی کی اولاد میں قصی بن کلاب پہلے شخص ہیں جنھیں قریش کی سرداری ملی اور دل سے لوگ ان کے مطیع ہو گئے۔ اب کعبہ کی حجابت سقایت۔ رفادہ اور لوا یہ سب امور ان ہی قصی کے متعلق ہو گئے۔ گویا مکہ والوں پر ان کی حکومت قائم ہو گئی۔"

"قصی نے شہر مکہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اپنی قوم قریش کے حوالے کر دیا اور جن مکانات پر قبضہ ہو گیا، ان ہی میں قریش کے خاندانوں کو الگ الگ آباد کرا دیا۔"[۲]

سردار کے فرائض اور اس

قصی سیاہ اور سفید کے مالک تھے، "انھوں نے" دارالندوہ" کے نام سے ایک مکان بنایا اور اس کا دروازہ مسجد الحرام کی طرف رکھا یہیں قریش اپنے تمام معاملات طے کرتے چنانچہ اب یہ دستور ہو گیا کہ قریش کے ہر مرد اور ہر عورت کا بیاہ ان ہی کے گھر میں ہوتا جسے قصی نے اس کام کے لیے معین کیا تھا یعنی دارالندوہ بلکہ دوسرے اہم کام بھی اس گھر میں جمع ہو کر مشورہ کے بعد انجام دیئے جانے لگے۔ کسی غیر قوم سے اگر لڑائی چھڑتی تو اس کے لیے بھی قصی ہی کے گھر کا کوئی لڑکا جنگی نشان باندھتا تھا۔ جب کوئی لڑکی سن بلوغ کو پہنچتی تو قصی ہی کے گھر میں اسے پہلی انگیا پہنائی جاتی۔ خود قصی انگیا قطع کر کے سلواتے اور پہناتے تھے[۳] اس طرح قریش اپنے تمام کام خواہ زندگی کے ہوں یا موت کے ان کی سعادت فضل اور شرافت کی وجہ سے مذہبی عقیدہ کی

۱۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۰۹۰ نیز التنبیہ والاشراف ۲۔ تاریخ طبری ص۱۰۹۵ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۷۹۔
۳۔ تاریخ طبری ص۱۰۹۳ نیز ابن سعد ص

طرح ان کے بغیر انجام نہ دیتے۔ قصی کا حکم ان کی قوم میں ان کی زندگی اور مرنے کے بعد دین کی طرح سمجھا جاتا تھا۔[1]

قصی بن کلاب کی وفات کے بعد مکہ میں ایک اشرافیت (ارسٹوکراسی) قائم ہوگئی کیونکہ "خود قصی نے مختلف انتظامی عہدے اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیے تھے"[2] ایک دن قصی نے اپنے بیٹے عبدالدار سے کہا کہ میں تجھے اپنی قوم سے ملاتا ہوں۔ اگرچہ کہ وہ تجھ سے شرافت میں بڑھ گئی ہے، مگر اس کی پرواہ نہیں۔ جب تک تو کعبہ کا دروازہ نہ کھولے ان میں سے کوئی اس میں داخل نہ ہوگا تیرے سوا کوئی دوسرا لڑائی کے لیے قریش کا جھنڈا نہ باندھے گا۔ سب تیرے سقایہ سے پانی پئیں گے۔ حج کے زمانے میں سب تیرے ہی مہمان ہوں گے اور تیرے مکان میں اپنے تمام معاملات طے کریں گے۔[3]

معاشرتی حالت قبیلہ واری تقسیم:۔ یوں تو عرب کے باشندے عرب سے باہر رہنے والوں کو عجمی یعنی "گونگے" کہتے تھے، اور اپنا نام انھوں نے عرب رکھا تھا یعنی "فصیح" اور "زبان آور"، لیکن پھر عرب ہی کے اندر تین درجے کے قبیلے بستے تھے۔ (۱) قبائل حمس (۲) قبائل طلس (۳) قبائل حلہ۔

حمس تو قریش اور خزاعہ وغیرہ تھے۔ یمن اور حضر موت کے عرب طلس اور باقی عرب حلہ کہلاتے تھے۔[4] ان تینوں میں حمس سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ حضری اور بدوی کی تقسیم بھی اکثر جگہ تھی۔

معاشرہ میں اونچ نیچ اور پجاریوں کی سیادت مکہ کے قدیم ترین معاشرہ میں پجاریوں کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ چنانچہ "پجاریوں میں سے ایک شخص رمی جمار کراتا تھا اور تاوقتیکہ وہ رمی نہ کرلے دوسرے حاجی رمی نہیں کرسکتے تھے"[5]

---

[1]۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۰۹۸)۔ تاریخ الکامل ابن الاثیر الجزء ثانی صفحہ ۸ حالات ابن قصی نیز سیرۃ ابن ہشام صف [2] التنبیہ والاشراف مسعودی صفحہ (۲۹۳) نیز ازرقی اخبار مکہ
[3]۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۰۹۹) نیز واقدی صفحہ (۱۳) سیرۃ ابن ہشام صف نیز ابن سعد جزء اول صفحہ ۴۱
[4]۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو محمد بن حبیب کی کتاب المحبر صفحہ ۱۷۹۔ [5] تاریخ طبری ۱۰۹۶۔

اسی طرح کنکریاں مارنے کے بعد جب لوگ مقام منا (منیٰ) سے واپس ہوتے تو یہ" پجاری سب سے پہلے گھاٹی کے سروں پر آجاتے اور دوسرے لوگوں کو گزرنے سے روک دیتے اور کہتے کہ پہلے ہم پجاری گزرلیں تب دوسرے گزریں چنانچہ پہلے وہ گزرجاتے، اس کے بعد دوسرے لوگوں کو وہاں سے نکلنے کی راہ ملتی۔۔۔۔۔۔"

"یہ طریقہ ان میں بنو جرہم اور خزاعہ کی تولیت کے عہد سے چلا آتا تھا اور اس سے تمام عرب واقف تھے۔ اور اسے تسلیم کرتے تھے"[1]

قصی نے پجاریوں کی سیادت ختم کردی

قصی بن کلاب چونکہ خود کعبہ کے متولی بن چکے تھے، اور اپنی قوت کے بل بوتے پر مکہ کے رئیس بن گئے تھے، انھوں نے ان پجاریوں سے تمام حقوق چھین لئے چنانچہ "ایک دن قصی بن کلاب خود اپنی قوم قریش بنو کنانہ اور قضاعہ کے ساتھ گھاٹی پر آئے اور انھوں نے ان پجاریوں سے کہا کہ اس تمام بند وبست کے ہم تمہارے مقابلہ میں زیادہ اہل ہیں۔ انھوں نے اس دعوے کو نہ مانا قصی نے بھی ان کی بات نہ مانی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تلوار چلی، اور نہایت شدید اور خونریز لڑائی کے بعد پجاریوں کو شکست ہوئی قصی نے ان کے تمام حقوق خود حاصل کرلے اور گھاٹی سے ان کو بے دخل کردیا"[2]

قریش کی سیادت

قصی نے پجاریوں کی سیادت اپنی تلوار کے زور سے ختم کردی، لیکن چند سال بعد ہی خود ان کی قوم قریش کی سیادت قایم ہوگئی چنانچہ "جب اصحاب فیل کا واقعہ پیش آیا تو عربوں میں قریش کی عظمت بڑھ گئی۔ اور وہ کہنے لگے قریش اہل اللہ ہیں۔ خدا کے بندے ہیں کہ وہ ان کی مدد کرتا ہے۔ اس واسطے قریش آپس میں جمع ہوئے اور کہا کہ ہم حضرت ابراہیم کی اولاد، اہل حرم، بیت اللہ کے متولی اور مکہ کے باشندے ہیں۔ لہذا کسی عرب کی منزلت ہمارے برابر نہیں ہوسکتی اور عرب کے لوگ

۱۔ تاریخ طبری ص ۱۰۹۶ ۲۔ تاریخ طبری ص ۱۰۹۶

ہمارے برابر کسی کو نہیں مانتے۔ اس لیے چاہیئے کہ ہم آپس میں دوستی اور بھائی چارہ پر اتفاق کریں اور یہ مقرر کریں کہ جو چیزیں حل (علاقہ بیرون حرم) کی ہیں اُسے متبرک نہ مانیں جیسی کہ حدود حرم کی چیزیں مانی جاتی ہیں تاکہ اس تفریق کی بدولت عرب ہم سے اور ہمارے حرم سے کم رتبہ ہو جائیں اور سمجھیں کہ قریش ان سے اور حل سے معظم ہیں۔ چنانچہ اس بنا پر انھوں نے حج کے لیے عرفات[I] میں وقوف (ٹھہرنا) اور عرفہ سے افاضہ (واپس آنا) چھوڑ دیا۔ قریش یہ بھی کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں اس لیے ہم کسی غیر کی تعظیم نہ کریں گے اور ہم حمس[II] (دیندار) ہیں[1]"

سیادت جن باتوں میں تھی حدود حرم سے باہر رہنے والے حرم میں باہر سے کھانا نہیں لا سکتے تھے مجبوراً انھیں قریش سے ہی خرید کر کھانا پڑتا۔ اس طرح وہ حرم کے اندر اپنے کپڑے پہن کر نہیں آ سکتے تھے یا تو قریش کے کپڑے پہننے پڑتے یا برہنہ ہی طواف کرنا پڑتا۔ ظاہر ہے کہ اس میں علاوہ سیادت کے مالی فائدہ بھی ہوتا تھا کیونکہ قریش اپنے کپڑے ہمیشہ مفت نہیں دیتے تھے۔ " قریش کہتے تھے کہ حل والے جب وہ حج یا عمرہ کے لیے آئیں تو حل کا کھانا لا کر نہ کھائیں اور جب پہلے طواف کے لیے آئیں تو صرف حمس کے کپڑے پہنیں اور اگر کسی کو کپڑے نہیں ملتے تو ننگے بیت اللہ کا طواف کرتے[2] اسی طرح بخاری میں مذکور ہے کہ " جاہلیت میں لوگ برہنہ طواف کیا کرتے تھے۔ سوائے حمس کے اور حمس قریش اور ان کی اولاد کو کہتے تھے۔ اور حمس لوگوں کو حسبۃ للہ کپڑے دیا کرتے تھے۔ مرد کو مرد کپڑے دیتا اور وہ اس میں طواف کر لیتا تھا۔ اور عورت

I عرفات حدود حرم سے باہر ایک مقام ہے۔ II حمس کے معنی " متشدد فی امر دین" کے ہیں یعنی جو دین کے کاموں میں تشدد کرے اور انکی تعمیل کا دھیان رکھے وہ حمس ہے۔ ابن الاثیر الجزالاول صفحہ (۲۴۴) [1] تاریخ الکامل ابن الاثیر الجزالاول صفحہ (۱۵۹) نیز تفسیر طبری الجزالثانی آیت: ثم افیضوا من حیث افاض الناس۔

[2] تفسیر طبری الجزالثانی۔ آیت: ثُمَّ اَفِيضُوا مِن حَيثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔

عورت کو کپڑے دیتی تھی، اور وہ اس میں طواف کرلیتی تھی اور جس کو حمس کچھ نہ دیتے وہ برہنہ ہی کعبہ کا طواف کرتے۔ اور اکثر لوگ عرفات سے روانہ ہوتے تھے اور حمس مزدلفہ سے روانہ ہوتے تھے"۔[۱]

قریش نے یہ بھی قاعدہ بنایا تھا کہ "اگر کسی سردار کو برہنہ طواف کرنے میں شرم محسوس ہو، اور اسے حمس کے کپڑے بھی نہ مل سکیں تو وہ اپنے ہی کپڑوں میں طواف کرلے لیکن جب طواف سے فارغ ہو جائے تو انھیں پھینک دے۔ پھر نہ تو وہ ان کپڑوں کو چھوئے اور نہ کوئی دوسرا اسے چھوئے۔ ان سب باتوں میں عربوں نے ان کے احکام کو تسلیم کرلیا اور جس طرح انھوں نے مقرر کیا اسی طرح طواف کرنے لگے اور جو کھانا وغیرہ وہ حل سے لاتے اسے چھوڑ دیتے اور حرم کا کھانا خرید کر کھاتے اور جتنے مرد ہوتے اتنے ہی کھاتے۔ عورتیں بھی اپنے کپڑے اتار ڈالتیں اور صرف اپنے زیور پہنے رہتیں"۔[۲]

شادی بیاہ جاہلیت کے لوگ بیک وقت دس عورتوں تک سے بھی نکاح کرتے تھے۔[۳] عام طور پر تعداد متعین نہیں تھی، بلکہ ہر شخص جتنے نکاح چاہتا کرسکتا تھا چنانچہ مورخ طبری لکھتے ہیں کہ "جاہلیت میں لوگ پانچ، چھ دس عورتوں تک سے نکاح کرتے۔ اگر کسی کے زیر نگرانی کوئی یتیم مالدار لڑکی ہوتی تو وہ کہتا کہ کونسی چیز ہے جو مجھے اس کے نکاح سے روکتی ہے؟ کیا کوئی دوسرا اس سے نکاح نہیں کرتا۔ پھر وہ اس سے نکاح کرتا اور اس یتیم لڑکی کا مال لے لیتا ہے"۔[۴]

ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں چار طرح کے

۱۔ بخاری پ۶ کتاب المناسک۔ نیز ابن الاثیر الجزء الاول صفحہ (۱۶۰) ذکر ما احدثہ قریش بعد الفیل۔

۲۔ ابن الاثیر الجزء الاول صفحہ (۱۶۰)

۳۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۱۴۵) آیت: فانکحوا ما طاب لکم من النساء۔

۴۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۱۴۵) آیت: فانکحوا ما طاب لکم من النساء۔

نکاح تھے :۔

(۱) ایک تو یہی تھا جو آج کل لوگ کرتے ہیں یعنی کوئی شخص لڑکے کے والدیا لڑکی کے ولی کے پاس نکاح کا پیغام بھیجتا ہے، اور مہر دیکر اُسے بیاہ لاتا ہے۔

(۲) اور ایک نکاح یہ تھا کہ کوئی مرد اپنی بیوی سے کہہ دیتا کہ جب تو پاک ہو جائے تو فلاں شخص کے پاس چلی جا اور اس سے فائدہ حاصل کر۔ پھر شوہر اس عورت سے جدا ہو جاتا اور اس کے قریب نہ جاتا جب تک کہ اس مرد سے حمل ظاہر نہ ہو۔ جب اس کا حمل ظاہر ہو جاتا تو اس کا شوہر جب دل چاہتا چلا جاتا یہ اس واسطے کیا جاتا کہ بچہ اچھی نسل کا ہو۔ اس نکاح کو استبضاع کہتے تھے۔

(۳) نکاح کی تیسری قسم یہ تھی کہ چند آدمی دس سے کم جمع ہو کر ایک عورت کے پاس جایا کرتے، جب کسی سے حمل رہ جاتا اور وہ بچہ جنتی اور اسنے جنے ہوئے کئی دن ہو جاتے تو وہ سب کو بلواتی، اس میں کسی کی یہ مجال نہ ہوتی کہ آنے سے انکار کرے جب سب جمع ہو جاتے تو وہ کہتی کہ تم سب کو اپنا حال معلوم ہے، اور میرے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ اے فلاں شخص یہ تیرا بیٹا ہے، جو دل چاہے اس کا نام رکھ بس وہ بچہ اس شخص کا ہو جاتا اور اس شخص کو انکار کی مجال نہ ہوتی تھی۔

(۴) چوتھی قسم کا نکاح یہ تھا کہ بہت سے آدمی ایک عورت کے پاس آیا جایا کرتے وہ آنے جانے والے کو منع نہ کرتی تھی۔ یہ بیسوائیں تھیں، انھوں نے نشانی کے واسطے دروازوں پر جھنڈے گاڑھ رکھے تھے۔ جو چاہتا ان سے ہم بستر ہو جاتا۔ جب ان میں سے کسی کو حمل رہ جاتا اور وہ بچہ جنتی تو سب لوگ جمع ہو کر علم قیافہ جاننے والے کو بلاتے اور وہ بچہ کو جس کے مشابہ دیکھتا اس سے کہہ دیتا کہ یہ تیرا بیٹا ہے، چنانچہ وہ اس کا بیٹا ہو جاتا تھا اور اسی کا بیٹا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ شخص اس سے انکار نہ کرسکتا تھا۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی مبعوث ہوئے تو سب نکاح جاہلیت کے بجز اس نکاح کے جو آج کل (مروج) ہے باطل ہو گئے [1]۔

---

[1] ۔ بخاری کتاب النکاح پ ۲۱ کشف الغمہ الجزء الثانی صفحہ (۵۶)

جاہلیت میں طلاق کا بھی رواج تھا۔

مہر مہر دینے کی رسم زمانۂ جاہلیت میں بھی مروج تھی لیکن مہر دیکر گویا شوہر اپنی منکوحہ کو خرید لیتا تھا۔ اور شوہر کے مرنے کے بعد اس کی بیوی بطور متروکہ جائداد کے کسی وارث کا ورثہ بن جاتی تھی چنانچہ " جاہلیت میں کسی شخص کا باپ بھائی، یا بیٹا مر جاتا اور اپنی بیوی چھوڑ جاتا تو متوفی کا وارث اس عورت پر کپڑا ڈال دیتا اور وہ اس عورت سے بہ وجہ اس مہر کے جو مرنے والے نے دیا تھا نکاح کرنے کا زیادہ حق رکھتا تھا۔ بصورت دیگر وہ اس عورت کا کسی دوسرے شخص سے نکاح کر دیتا اور عورت سے اس کا مہر لے لیتا تھا[۱] مگر حقیقی ماں سے نکاح نہیں ہو سکتا تھا[۲]

میراث جاہلیت کے معاشی نظام میں عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ " جاہلیت کے لوگ کسی ایسے شخص کو متوفی کی میراث نہ دیتے تھے جو دشمن سے مقابلہ نہ کر سکتا یا جنگوں میں لڑ نہیں سکتا تھا مثلاً متوفی کے چھوٹے بچے اور عورتیں[۳] متوفی کا حقیقی لڑکا بھی اس وقت باپ کے متروکہ کا مستحق ہوتا جب کہ اس میں مقابلہ اور جنگ آزمائی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی۔ رہیں متوفی کی بیٹیاں سو وہ بہر حال محروم ہی رہتی تھیں[۴]۔

لڑکا نہ ہونے کی صورت میں جب اسلام میں متوفی کی لڑکی کو نصف میراث دینے کا حکم ہوا تو صحابہ نے رسول کریمؐ سے دریافت فرمایا کہ " اے رسول خداؐ! کیا ہم لڑکی کو اس کے باپ کا نصف متروکہ دیدیں؟ درآنحالیکہ وہ گھوڑے کی سواری نہیں کرتی اور قوم سے جنگ نہیں کرتی۔! اور کیا ہم بچہ کو میراث دیدیں؟

۱۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۱۹۳) آیت: یا ایھا الذین آمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا۔

۲۔ دیکھئے کتاب المحبر صفحہ (۳۲۶)

۳۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۱۷۱) آیت: یوصیکم اللہ فی اولادکم۔

۴۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۱۷۱) آیت: یوصیکم اللہ فی اولادکم۔

درآنحالیکہ وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جاہلیت میں صرف اسی کو میراث دیتے جو جنگ کرسکتا تھا۔ اور میراث بڑے شخص کو ملتی تھی خواہ وہ بیٹا ہو، یا بھائی ہو، یا چچا وغیرہ جو بھی بڑا ہوتا[1] اس سلسلہ میں جو آیات میراث نازل ہوئیں اس کا تذکرہ ہم نے تقسیم دولت کے باب میں وراثت کے تحت کیا ہے۔

متوفی کی عورتوں کو ورثہ کیا ملتا جبکہ وہ خود ہی میراث بن جاتی تھیں چنانچہ جب کوئی شخص مرجاتا تو اس کے ورثاء اس کی عورت کے زیادہ حقدار ہوتے تھے، اگر چاہتے تو ورثا ہیں سے کوئی شخص اس عورت سے نکاح کرلیتا یا اگر وہ چاہتے تو کسی اور شخص سے نکاح کرادیتے اور اگر چاہتے تو اس کا نکاح نہ بھی کراتے۔ الغرض عورت کے حقدار مرنے والے کے ورثا ہی قرار پاتے تھے[2]

تبنیت کسی اور کے لڑکے کو لیکر متبنیٰ بنانے کا رواج جاہلیت میں موجود تھا چنانچہ "زمانۂ جاہلیت کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی کو بیٹا بناتا تو لوگ اس کی طرف منسوب کرکے پکارتے تھے۔ اور اس کے مرنے کے بعد وہ وارث بھی ہوتا تھا"[3]

یتیم کا ولی یتیم کا ولی دادا یا چچا وغیرہ ہوتا جیسا کہ خود رسول کریمؐ کے ولی پہلے آپؐ کے دادا عبدالمطلب تھے، اور پھر چچا ابو طالب ولی ہوئے۔

جاہلیت میں ایسے بھی لوگ تھے، جو یتیم کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے۔ چنانچہ "یتیم کا ولی یتیم بچے کی موٹی بکری لے لیتا اور اس کے بدلے دُبلی اور لاغر بکری دیدیتا اور کہتا کہ بکری کے بدلے بکری دی گئی اور اچھا درہم لیکر اس کے بدلے کھوٹا درہم رکھ دیتا اور کہتا کہ درہم کے بدلے درہم دیدیا گیا ہے"[4]

---

[1] ۔ تفسیر طبری الجزالرابع صفحہ (۱۷۱) آیت: یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم فان کانت واحدۃ فلہا النصف۔ [2] ۔ بخاری باب ۱۲ کتاب النکاح بروایت ابن عباسؓ [3] بخاری باب ۱۲ کتاب النکاح
[4] ۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۱۴۲) آیت: واٰتوا الیتامیٰ اموالھم ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب۔

خوں بہا جب ایک قبیلے کا آدمی دوسرے قبیلے کے آدمی کو مار ڈالتا تو مقتول کے ورثا یا قبیلے کے سردار کو یہ حق حاصل تھا کہ مجرم کو قتل کیے جانے کے لیے طلب کرے۔ مجرم تاوان (جرمانہ) دیت (خوں بہا) دیکر مقتول کے ورثا کو راضی بھی کرسکتا تھا۔ خوں بہا سو اونٹ تھے لیکن ملزم کو ارتکاب جرم سے انکار ہوتا تو قبیلے کے چند لوگوں کے یہ قسم کھا لینے سے کہ ملزم بے گناہ ہے معاملہ ختم ہو جاتا تھا[1] بخاری شریف میں خود اس قسم کے مقدمہ کی پوری تفصیل درج ہے جس کو ہم نے "آجر اور مزدور کے تعلقات" کے تحت آگے چل کر درج کیا ہے۔

تاریخوں میں ایک اور واقعہ درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائً خوں بہا صرف دس اونٹ ہی تھے چنانچہ قریش کے سردار عبدالمطلب نے نذر مانی تھی کہ اگر ان کے دس لڑکے پیدا ہوں، اور وہ ان کی زندگی میں جوان ہوکر ان کی حمایت کے قابل ہوں تو وہ ان میں سے ایک کو کعبہ میں خدا کے لیے قربان کردیں گے چنانچہ انھوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کو ذبح کرنا چاہا لیکن قریش مانع ہوئے۔ بالآخر وہ ایک کاہنہ سے ملے اور پوچھا کہ کیا طریقہ عمل اختیار کروں؟ کاہنہ نے کہا کہ بتاؤ تمھارے ہاں جان کی دیت کیا ہے؟ انھوں نے کہا "دس اونٹ" کاہنہ نے بتایا کہ دس دس اونٹ بڑھا کر قرعہ ڈالا جائے آخر کار جب اونٹوں کی تعداد سو اونٹ تک پہنچ گئی تو قرعہ ان کے نام نکلا[2] غرض عبدالمطلب رسول کریمؐ کے دادا پہلے شخص ہیں جنھوں نے جان کی دیت سو اونٹ مقرر کی[3]

شہر مکہ کی تمام خدمتیں بارہ ذی اثر قبائل یا خاندانوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک قبیلہ سے متعلق تصفیہ تنازعات تھا اور اس فرض کو اس کا سردار انجام دیتا تھا۔"

"ایک دوسری اہم خدمت کے فرائض میں یہ داخل تھا کہ جو سردار اس

---

[1] اصول فقہ اسلام سر عبدالرحیم باب صفحہ ۴۔ [2] تفصیل کے لیے تاریخ طبری صفحہ (۱۰۷۴) ملاحظہ فرمائیے۔ [3] صبح الاعشیٰ القلقشندی ج ۱ ص ۲۶

خدمت کو انجام دیتے وہ اپنے پاس سے جرمانے اور معاوضے ادا کرے جو کسی دوسرے قبیلے والے کے مقابلے میں کسی جرم کے ارتکاب کی بنا پر اس کے کسی ہم قبیلہ پر عائد کیے جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے جو مسلمانوں میں اول خلیفہ ہوئے کچھ عرصے تک اس خدمت کو انجام دیا تھا[1] اس کی مزید تفصیل ہم نے مالیات کے باب میں بیمہ انشورنس کے تحت بیان کی ہے۔

گھوڑ دوڑ عرب میں گھوڑ دوڑ وغیرہ بھی ہوا کرتی تھی۔ داحس اور غبرا کی شرط مشہور ہے۔ جس کی وجہ سے برسوں لڑائی ہوتی رہی، جو تاریخ میں ایام داحس والغبرا[2] کے نام سے مشہور ہے۔

ان شرطوں میں بعض اوقات بڑی بڑی رقمیں باندھی جاتی تھیں، چنانچہ "مجاشع نامی ایک شخص کے پاس ایک گھوڑی تھی، جس کا نام وبسا تھا اس نے صرف ایک بازی میں اس گھوڑی کے ذریعہ پچاس ہزار درہم حاصل کیے"[3]

تعلیمی حالت جاہلیت کے عرب میں لوگوں کی تعلیمی حالت نہایت ہی پست تھی چنانچہ "جب اسلام آیا تو قبیلۂ قریش میں صرف سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے"[4]

۱۔ اصول فقہ اسلام سر عبدالرحیم باب صفحہ ۱۰۴۔ ۲۔ تفصیل کے لیے ابن الاثیر الجزو الاول عنوان "ایام داحس والغبرا" ملاحظہ فرمایئے۔ جہاں گھوڑ دوڑ کی بھی تفصیل دی گئی ہے۔

۳۔ ابن الاثیر الجزء الاول صفحہ (۴۰۷) ایام داحس والغبرا۔

۴۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۴۷۲) باب "خط کی ابتدا" سترہ آدمیوں کے نام مورخ بلاذری نے حسب ذیل درج کیے ہیں:۔

(۱) عمر بن الخطابؓ (۲) عثمان بن عفانؓ (۳) علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ (۴) ابوعبیدہ بن الجراحؓ (۵) طلحہؓ (۶) یزید بن ابی سفیان (۷) ابوحذیفہ بن عتبہ (۸) حاطب بن عمرو (۹) ابوسلمہ بن عبد الاسد المخزومی (۱۰) ابان بن سعید ابن العاص بن امیہ (۱۱) اور ان کے بھائی خالد بن سعید (۱۲) عبداللہ بن سعد بن ابی سرح (۱۳) حویطب بن عبدالعزیٰ (۱۴) ابوسفیان بن حرب بن امیہ (۱۵) معاویہ بن ابی سفیان (۱۶) جہم بن صلت (۱۷) العلاء بن الحضرمی حلیف قریش۔

حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل ایک شخص تھے جو زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور عبرانی کتاب لکھا کرتے تھے یعنی جس قدر اللہ کو منظور ہوتا بھا انجیل کو عبرانی میں لکھا کرتے تھے۔ یہ بڑے بوڑھے آدمی تھے[۱] الشفا بنت عبداللہ العدویہ جو کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے گھرانے سے تھیں، جاہلیت میں لکھنا جانتی تھیں[۲] چنانچہ حدیث میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔

توہمات جاہلیت کے لوگ اونٹ، بھیڑ، بکریوں کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے اور پھر نہ کوئی ان کا دودھ پیتا۔ نہ بال اون حاصل کرتا۔ نہ ان اونٹوں پر کوئی سواری کرتا اور نہ سامان لادتا۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ بعض اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کا گوشت صرف پجاری ہی کھاتے۔ اور بعض کا صرف مرد ہی کھاتے اور عورتیں نہیں کھاتی تھیں۔

وَقَالُوا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا اِلَّا مَنْ نَّشَاءُ بِزَعْمِهِمْ۔
قرآن پ۸ انعام ۶ ع ۱۹

ترجمہ:۔ اور وہ کہتے تھے کہ کھیتی اور چارپائے ممنوع ہیں ان کو۔ سوائے ان کے جنہیں ہم چاہیں کوئی کھا نہیں سکتا۔ اور یہ ان کا خیال تھا۔

"جنہیں ہم چاہیں" سے صرف پجاری اور عورتوں کے سوا صرف مرد مراد ہوتے تھے[۳]

وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا۔
(قرآن پ۸ انعام ۶ ع ۱۲)

ترجمہ:۔ اور جس پر سواری ممنوع کر دی گئی تھی۔

ان سواریوں سے بحیرہ۔ سائبہ۔ حامی اور وصیلہ مراد تھے[I]

---

[۱] ۔ بخاری پ۱ باب الوحی۔ [۲] ۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۴۷۳)

[۳] ۔ تفسیر بیضاوی الجزالاول صفحہ (۲۷۱) آیت مندرجہ بالا۔

[I] ۔ بحیرہ ـــ بحیرہ اس اونٹنی کو کہتے تھے جس کو وہ لوگ بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے، اور اس کا کوئی دودھ نہ دوہتا تھا۔
طریقہ یہ کہ جو اونٹنی پانچ مرتبہ جنتی تو وہ اس کا کان پھاڑ کر چھوڑ دیتے، پھر نہ تو کوئی اس پر سوار ہوتا اور نہ کوئی اس کا دودھ دوہتا۔

۲۶۰۸۷

معاشی حالات

زراعت اور صنعت و حرفت مکہ کے قرب و جوار میں زراعت نہیں ہو سکتی تھی جنگلات بھی نہیں تھے معدنیات بھی نہیں تھے اس لیے وہاں خام پیدا وار کی ہمیشہ سے کمی تھی۔ اس کا اثر وہاں کی صنعت و حرفت پر بھی مضر پڑا چنانچہ خام پیدا وار نہ ہونے سے صنعت و حرفت نے وہاں ترقی نہیں کی صرف دو ایک صنعتیں وجود میں آئیں خاص کر دباغت کیونکہ اونٹ اور بکریوں کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سائبہ :۔ سائبہ اس اونٹنی کو کہتے تھے جس کو لوگ بتوں کی نذر میں چھوڑ دیتے تھے اور اس پر کوئی چیز نہیں لادتے تھے۔ حام :۔ "حام جس اونٹ کو کہتے تھے اس کی کیفیت یہ تھی کہ کفار نذر مانتے کہ ہماری اونٹنیوں میں اگر اتنے (مثلاً ۱۰ یا ۲۰) بچے ہوں تو ہمارے، اور اگر اس سے زائد ہوں تو وہ ہمارے بتوں کے، پھر جوان کی مقررہ تعداد سے زائد بچے ہوتے، ان کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے۔ اور اس پر کوئی چیز نہ لادتے۔

مورخ طبری نے اپنی تفسیر میں حام کی یہ تشریح کی ہے کہ جس نرسانڈ اونٹ سے لگاتار دس مادیاں پیدا ہوتیں اور نر پیدا نہ ہوتا تو پھر اس کو چھوڑ دیا جاتا۔ پھر نہ تو کوئی اس کی پیٹھ پر سوار ہوتا اور نہ اس کے پشم (بال) کترے جاتے اور جہاں چاہتا وہ پھرتا رہتا اور کوئی اس سے فائدہ نہ اٹھاتا۔

وصیلہ :۔ اگر کسی بکری کو پانچ جھول میں دس مادیاں پیدا ہوتیں، اور کوئی نر پیدا نہ ہوتا تو اس بکری کو وصیلہ بنا دیا جاتا پھر اس کے بعد وہ جو بچے جنتی ان کو صرف مرد ہی کھاتے عورتیں نہ کھاتیں، البتہ اگر وہ مر جاتا تو اس کو مرد اور عورت کھاتے چنانچہ قرآن مجید میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔

وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِن يَكُن مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ۔ قرآن پ انعام ۶ ع ۱۶ ۔ ترجمہ :۔ وہ کہتے کہ اگر ان جانوروں کے شکم میں (جنھیں ہم نے بتوں کے نام پر چھوڑا ہے) جو (زندہ بچہ پیدا) ہو وہ تو صرف ہمارے مردوں کے لیے (حلال) ہے اور ہماری عورتوں کو اس کا کھانا ناجائز ہے، اور اگر مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔

کھالیں وہاں بہ آسانی فراہم ہوسکتی تھیں ۔ مکہ کے تاجر اطراف واکناف کے بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے تو اپنی اسی صنعتی پیداوار کو پیش کرتے ۔ تاریخوں میں عمروبن العاصؓ کا ایک واقعہ درج ہے کہ عمروبن العاصؓ جاہلیت میں قریش کے سفیر بن کر حبشہ گئے تھے تو شاہی تحفہ میں ان ہی کھالوں کو لے گئے تھے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ....

"میں نے کہا نجاشی (نیگس) کے لیے ہدیہ جمع کرو، چونکہ وہ ہمارے ملک کی کھالوں کو بہت پسند کرتا ہے اس لیے ہم نے بہت سی کھالیں اس کے لیے جمع کیں اور پھر ہم مکہ سے چل کر نجاشی کے پاس آئے ......"

"میں نجاشی کے پاس گیا اور حسب عادت اُسے سجدہ کیا اس نے مجھے خوش آمدید کہا۔ اور کہا اے میرے دوست! اپنے وطن سے ہمارے لئے کوئی ہدیہ لائے ہو؟ میں نے ان چمڑوں کو اس کے سامنے پیش کیا اس نے ان کو بہت پسند کیا اور خوش ہوا"[1]

تاریخوں اور حدیثوں میں کہیں کہیں ایک آدھ جگہ مکہ میں جو صنعتیں چھوٹے پیمانہ پر جاری تھیں ان کا بھی پتہ چلتا ہے مثلاً رسول اللہؐ کے مولیٰ رافع بیان کرتے ہیں کہ "میں زمزم کے حجرے میں بیٹھا ہوا پیالے بنایا کرتا تھا"[2]

تلواروں اور کپڑوں وغیرہ کی بابت جا بجا اشعار میں تذکرہ ملتا ہے کہ مکہ وغیرہ میں یمن سے کپڑے آیا کرتے تھے اور عدنی کپڑے کہلاتے تھے، جو عدن سے منسوب تھے۔ اسی طرح تمام عرب میں ہندوستان کی تلواریں مشہور تھیں، جاہلیت کا ایک مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے ؎

وَظُلْمُ ذَوِی الْقُرْبٰی اَشَدُّ مَضَاضَۃً ÷ عَلَی الْمَرْءِ مِنْ وَقْعِ الْحُسَامِ الْمُھَنَّدِ[3]

ترجمہ:۔ کسی شخص پر اس کے بھائی بندوں کا ظلم ہند کی تلوار کی کاٹ سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

تجارت مکہ میں زراعت نہیں ہوسکتی تھی، جیساکہ خود خدائے تعالیٰ نے اُس کو

---

[1] ۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۶۰۲ ۔ [2] ۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۳۳۹ سنہ ۲ھ کے واقعات ۔

[3] ۔ سبعہ معلقات ۔ المعلقۃ الثانیہ صفحہ (۳۱) مجتبائی پریس دہلی۔

"وادی غیر ذی زرع" (بن کھیتی والی زمین) سے موسوم کیا ہے۔ اسی لیے مکہ کے بڑے لوگ تجارت کے لیے دو سفر کرتے تھے اور اپنے شہر والوں کے لیے ضروریاتِ زندگی کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑے لے آتے تھے۔ اور ان سفروں سے نفع کماتے تھے۔ کیونکہ اطراف و اکناف کے بادشاہ اہل مکہ کی عزت کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ یہ بیت اللہ کے پڑوسی حرم کے رہنے بسنے والے اور کعبہ کے متولی ہیں یہاں تک کہ وہ مکہ والوں کو اہل اللہ سے موسوم کرتے تھے[1]

قریشی تجارت کی ابتدا

"ہاشم پہلے شخص ہیں جنھوں نے قریش کے لیے سال میں دو سفر جاڑے اور گرمی میں رائج کیے۔ ان کی قوم قریش قحط اور افلاس کی سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئی تھی، یہ فلسطین گئے اور وہاں سے بہت سا آٹا لے آئے۔ اس کی روٹیاں پکوائیں، اور بہت سے جانور ذبح کر کے قورمہ بنایا اور روٹیوں کو توڑ کر شوربہ میں ثرید تیار کیا۔ لوگوں کو اسی طرح انھوں نے کھلایا[2]۔ بلکہ کہتے ہیں کہ "ہاشم" (روٹی چورنے والا) ان کا نام اسی فیاضی کی وجہ سے مشہور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ وہاں تجارتی سفروں کا رواج پڑ گیا۔ ان ہی تجارتی سفروں کی بدولت انھیں معاشی مرفہ الحالی نصیب ہوئی الغرض" قریش دو سفر کرتے تھے چونکہ موسم سرما میں ملک شام میں سردی رہتی تھی، اس لیے سرما میں یمن کا سفر کرتے تھے اور موسم گرما میں شام کا سفر کرتے تھے[3]

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو تجارتی منافع قریش کے سرمایہ دار حاصل کرتے تھے اس منافع سے علاوہ اپنی ذات اور اپنے خاندان کے قبیلے کے ناداروں اور مفلسوں کی بھی خبر گیری کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اسی طرز عمل کا یہ نتیجہ تھا کہ قریش میں جو غیر مستطیع تھے، ان کی مالی حالت بھی درست ہو گئی تھی۔ اسلام کا جس وقت ظہور ہوا قریش اسی حال میں تھے، اس لیے سمجھا جاتا ہے اس زمانہ میں مال میں، عزت میں، آبرو میں قریش کے برابر کم از کم حجاز میں کوئی دوسرا قبیلہ نہ تھا۔ قریش کے سرمایہ داروں کا اپنی قوم کے ناداروں کے ساتھ جو سلوک تھا اس کی طرف اشارہ

---

[1] تفسیر رازی الجزء السادس صفحہ (۳۰۶) تفسیر سورۂ قریش۔ [2] تاریخ طبری صفحہ ۱۰۸۹۔
[3] تفسیر طبری الجزء الثلاثون صفحہ (۱۷۱) تفسیر سورہ قریش۔

کرتے ہوئے ایک شاعر نے کہا تھا ؎

الخالطین فقیرھم بغنیھم ÷ حتیٰ یکون فقیرھم کالکافی[1]

ترجمہ :۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے اپنے غریبوں کو امیروں سے ملایا۔ یہاں تک کہ ان کا مفلس بھی مثل خوش حال کے ہو گیا۔

مکہ والوں کی معاشی زندگی میں ان دو سفروں کی خاص اہمیت تھی، حتیٰ کہ قرآن میں بھی رحلۃ الشتاء (سردیوں کا سفر) اور رحلۃ الصیف (گرمیوں کا سفر) کا خاص طور پر سورۂ قریش میں تذکرہ ہے، ان ہی تجارتی سفروں کی بدولت انھیں معاشی مرفہ الحالی نصیب ہوئی سالغرض "قریش تاجر قوم تھی"[2] "خود لفظ" قریش "کے معنی تجارت اور کسب کرنے والے کے ہیں کیونکہ وہ تجارتی کاروبار کرتے تھے اور اس کے لیے ملکوں کا سفر کرتے تھے"[3] یونانی مورخ اور جغرافیہ داں اسٹرابو کا بیان ہے کہ "ہر ایک عرب یا تو تاجر ہے یا دلال ہے"[4] غرض ان کا معاشرہ ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ

مَن لَم یکُن تَاجِراً فلیسَ عِندَھُم بشَیٍٔ ۔ ترجمہ۔ جو تاجر نہ ہوتا تو ان کے پاس اس کی کچھ قدر و منزلت نہ ہوتی۔

یہی وجہ ہے کہ مکہ کے مہاجرین جب مدینہ پہنچے، تو انھوں نے سب سے پہلے یہی سوال کیا کہ بازار کہاں ہے؟

بیوپار اور تجارتی کاروبار میں نہ صرف مرد بلکہ عورتوں کا بھی کافی حصہ تھا۔ چنانچہ ابوجہل کی ماں عطر کا کاروبار کرتی تھی، حضرت خدیجہؓ کا تجارتی کاروبار تو مشہور ہی ہے "خدیجہؓ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی نہایت شریف تاجر بی بی تھیں۔ دوسرے لوگ ان کے مال کی تجارت کرتے تھے، اور منافع میں سے وہ کچھ ان کو دیدیا کرتی تھیں" قریش تاجر قوم تھی، چنانچہ جب حضرت خدیجہؓ کو رسول اللہؐ کی راست گفتاری، امانت اور نیک کرداری کا علم ہوا تو انھوں نے آپؐ کو بلا بھیجا اور درخواست کی کہ آپ میرا مال

۱۔ تفسیر طبری سورۂ قریش ۲۔ تاریخ طبری ص ۱۲۲۷ ۔ ۳۔ تفسیر طبری سورۃ قریش نیز سیرۃ ابن ہشام صفحہ (۶۸) مطبوعہ مصر نیز کشاف زمخشری الجزء الثانی سورۃ القریش۔

۴۔ لائف ان اسلام بلیف اینڈ انسٹی ٹیوشن باب صفحہ (۱۵)۔

تجارت لے کر شام جائیں۔ میں اب تک دوسرے تاجروں کو منافع میں سے جسقدر دیتی تھی، اس سے زیادہ دوں گی اور اپنے غلام میسرہ کو ساتھ کر دوں گی آپؐ نے یہ تجویز منظور فرمالی اور ان کا مال لے کر روانہ ہوئے[1] اور شام میں پہنچکر رسول اللہؐ نے جو سامان لادکر لایا تھا بیچ دیا۔ اور جو سامان خرید نا تھا خرید لیا۔ ارباب سیر بیان کرتے ہیں کہ آپ خدیجہ کے پاس آئے، انھوں نے اس مال کو جو شام سے خرید کر لائے تھے جب بیچا تو دوچند یا قریب قریب دوچند کے نفع ہوا[1] ابوسفیان کی بیوی ہندہ شام کے کلبیوں (قبائل) میں اپنا مال تجارت فروخت کرتی تھی۔

مکہ کی عورتوں کو بھی تجارتی کاروانوں سے اسی قدر دلچسپی تھی، جتنی دلچسپی ان کے شوہروں کو تھی۔ بدرقہ (کینوائے) کی واپسی پر ابوسفیان کے اطراف جمع ہوتی تھیں، تاکہ یہ معلوم کریں کہ انھوں نے جو روپیہ پیسہ لگایا تھا اس میں کیا منافع ملا اور نفع میں ان کو کتنا حصہ ملیگا۔

سامرہ (یعنی سونے سے پہلے بطور دلبستگی کے جو گپ شپ ہوتی تھی) اس میں بھی کاروانوں کے سفری داستانوں کا تذکرہ زیادہ تر ہوتا۔ مکہ کے عام باشندوں کو بھی دیکھا جاتا تھا کہ ان کاروانوں کے لیے بے چین رہتے تھے۔ کیونکہ ان کی زندگی کا دارو مدار ہی ان پر تھا۔ جس وقت کاروان مسافت طے کرتا رہتا اس کی باقاعدہ اطلاع بدؤں کے ذریعہ مکہ پہنچتی رہتی۔ ابوسفیان نے ان ہی میں سے ایک قاصد کو بدر کے قافلہ کی نازک حالت بیان کرنے کے لیے مکہ بھجوایا تھا چنانچہ مختصر کیفیت ملاحظہ ہو:-

... ابوسفیان نے فوراً ضمضم بن عمرو الغفاری کو کچھ دیکر مکہ دوڑایا اور ہدایت کی کہ قریش کے پاس جاؤ اور فوراً اپنے اموال کی مدافعت کے لیے ان کو روانہ کرو۔ ضمضم تیزی کے ساتھ مکہ روانہ ہوا۔ ضمضم بطن وادی میں اپنے اونٹ پر کھڑا ہوکر چلّا رہا تھا اے معشر قریش! ابوسفیان کے ساتھ جو تمھارا

---

[1] تاریخ طبری ص ۱۱۲۷ نیز ابن سعد صفحہ (۸۳)۔ [2] تاریخ طبری ص ۱۱۳۵ نیز ابن سعد صفحہ ۸۳

[3] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد (۲) عنوان "مکہ"۔

مال و متاع ہے وہ لٹ جائیگا۔ محمدؐ اپنے اصحاب کے ہمراہ اسے روکنے پر آمادہ ہوئے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ تم اسے بچا سکو گے، دوڑو، دوڑو۔[1]

اس اطلاع کو پہنچانے کے لیے بیس دینار (۲۰ اشرفی) صرف ہوئے تھے گو یہ بڑی رقم معلوم ہوتی ہے لیکن اس کو اس تناسب سے دیکھئے کہ جس میں مکہ والوں نے (۵۰۰۰۰) پچاس ہزار دینار اس کاروان کے کاروبار میں لگائے تھے۔ نیز غزوۃ القردۃ کا پانچواں حصہ بیس ہزار ہوا تھا۔

الغرض مکہ کے کاروانوں کو اگر دیکھا جائے تو ان کا پیمانہ کافی وسیع تھا۔ ایک مرتبہ تو ان میں اونٹوں کی تعداد دو ہزار پانسو تک جا پہنچی تھی، بالعموم قافلہ کے ساتھ آدمیوں کی تعداد سو تا تین سو تک ہوتی تھی۔ جس میں تاجر۔ دلیل (رہبر) اور محافظ دستہ (بدرقہ) بھی ہوتا تھا۔ ۲ھ میں مکہ والوں کا مدینہ کے ساحل کے قریب سے جو قافلہ گزرا تھا اس کے متعلق مورخ طبری نے لکھا ہے، کہ "ان قافلوں میں اُمیہ بن خلف اور قریش کے سو آدمی تھے اور دو ہزار پانسو اونٹ تھے"[2]

بدر کے کاروان کو تمثیلاً پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے کسی اور کاروان کا تذکرہ نہیں ملتا جس میں اس قدر سرمایہ لگایا گیا ہو اس میں بڑا حصہ اُمیّہ کے شرکت ابو احیحہ یعنی سعید بن العاص کے خاندان کا روپیہ لگا ہوا تھا۔ اس شرکتی کاروبار نے اپنے خاندان کی ایک کمپنی بنائی تھی۔ اس میں ان کے سرمایہ کے علاوہ اور حصہ داروں کا روپیہ بھی لگا ہوا تھا۔ ان کے تیس ہزار دینار کے علاوہ اُمیّہ کے دیگر گھرانوں کے (۱۰۰۰۰) دس ہزار دینار لگائے گئے تھے۔ ۴/۵ اصل جو بدر کے کاروان میں لگایا گیا تھا وہ اُمیّہ والوں کا تھا اس لیے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں ابو سفیان کو قافلہ کی حفاظت اور قیادت سپرد کی گئی تھی، اور کیوں وہ شخصی طور پر اس میں دلچسپی لے رہے تھے، خود ابو سفیان کا بیان ہے کہ "مکہ کا کوئی قریشی مرد اور عورت ایسا نہیں ہے کہ جس کے پاس

---

[1] تاریخ طبری صفحہ ۱۲۹۰ سنہ ۲ھ کے واقعات [2] تاریخ طبری صفحہ (۱۳۰۱)

نصف اوقیہ یا زیادہ مال رہا ہو۔ اور اس نے ہمارے ساتھ روانہ نہ کر دیا ہو"[1]
مکے کے کاروان کھالیں، چمڑے اور بعض وقت طائف کا زبیب (منقہ) وغیرہ لے جاتے۔ چنانچہ مورخ طبری نے ایک اور قافلہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "قریش کا ایک قافلہ جس میں منقہ، چمڑے اور دوسرا تجارتی سامان تھا ان کے پاس سے گزرا"[2] نیز یہ لوگ چاندی سونے کی اینٹیں بنو سلیم کی کانوں سے حاصل کرتے تھے اور تبر (کچا سونا) اور مٹی ملا ہوا سونا افریقہ سے حاصل کرتے ابوسفیان بن حرب چاندی کی بڑے پیمانہ پر تجارت کرتے تھے، چنانچہ "واقعہ بدر کے بعد قریش نے شام کا عام راستہ ڈر کر ترک کر دیا تھا اس لیے اس مرتبہ انھوں نے شام کے لیے عراق کا راستہ اختیار کیا ان تاجروں میں ابوسفیان بن حرب شامل تھے۔ چاندی کی کثیر مقدار ان کے ساتھ تھی۔ یہی ان کا بڑا تجارتی سرمایہ تھا انھوں نے فرات بن حیان کو راہبری کے لیے اپنے ساتھ لیا جو قبیلہ بکر بن وائل کا آدمی تھا"[3]

"اس قافلہ کی کثیر دولت اور چاندی کا سامان جو صفوان بن امیہ نے تجارت کے لیے ساتھ کیا تھا اس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی...... اس مال کا خمس ⅕ بیس ہزار تھا"[4]

قافلہ کے ساتھ جو مال تجارت ہوتا اس کو وہ "لطیمہ" کہتے تھے، یعنی ایسا مال تجارت جس میں خوشبو کی چیزیں اور قیمتی مسالے ہوتے تھے۔ خوشبو کے سامان حجاز میں تو تیار نہ ہوتے تھے، بلکہ جنوبی عرب[5] نیز ہندوستان اور افریقہ سے لائے جاتے، متمدن ممالک کے لوگ ان چیزوں کو عیش و عشرت کے لیے خریدتے تھے، ان کے سوا جڑی بوٹیاں جو دواؤں میں کام آتی تھیں، مثلاً سنا، مکی وغیرہ تجارت میں

---

[1] - ابن سعد الجزء الثانی صفحہ (۷) [2] - تاریخ طبری ص ۱۲۴۲ ۲ ھ کے واقعات
[3] - تاریخ طبری صفحہ (۱۳۷۴) ۳ ھ کے واقعات [4] - تاریخ طبری صفحہ (۱۳۷۵) ۳ ھ کے واقعات
[5] - جنوبی عرب خاص کر یمن کا عطر شہرہ آفاق تھا حتیٰ کہ انگلستان کے شاعر ملٹن نے بھی اپنی نظم (Paradise Lost) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

داخل تھیں۔ عموماً ایسی چیزیں زیادہ ہوتی تھیں جو حجم میں تو چھوٹی ہوتیں، لیکن جن کے دام زیادہ ہوتے تھے۔ عرب کے یہ کاروانی قافلے یمن کے ساحل سے ہندوستان کی پیداوار، چین کا ریشم، اور عدن کے قیمتی کپڑے جو عدنی کپڑوں کے نام سے مشہور تھے لے جاتے۔ ماسوا اس کے ایسا سونا جس میں ابھی مٹی ملی ہوتی اور ہاتھی دانت کی چیزیں افریقہ سے برآمد کرتے تھے۔ افریقہ سے ہی مکہ والے اپنے غلام، خدمتگار، مزدور اور کرایہ کے سپاہی جن کو احابیش حبشہ کہا جاتا تھا لے جاتے۔ مصر اور شام میں قریشی تاجر تعیشات کی چیزیں درآمد کرتے تھے مثلاً بحیرۂ روم کی صنعتی پیداوار خاص کر سوتی کپڑے، ریشم، مخمل اور دیگر ملبوسات جو خوشنما ارغوانی رنگ میں رنگے ہوتے، بُصریٰ اور شام سے ہتھیار، غلّہ، اناج، تیل جس کو بدوی پسند کرتے لاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اونٹوں کے یہ کاروانی قافلے قدرتاً سُست رفتار ہوتے تھے۔ لیکن جو اشیا اُن کے ساتھ ہوتیں وہ بھی تو چمڑے، دھاتیں، خوشبودار لکڑیاں، کپڑے ہی جیسی چیزیں ہوتی تھیں۔ طول مسافت یا درازی مدت کی وجہ سے ان کے خراب ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا۔ مصارف کی مدّات زیادہ تر یہ ہوتی تھیں کہ جانوروں کے خریدنے پر کچھ خرچ ہوتا تھا کچھ محافظ دستوں کا خرچ ادا کرنا پڑتا تھا نیز قبائل کے شیوخ کو تحفہ تحائف کی رسم میں کچھ دینا پڑتا تھا لیکن پھر بھی ان کی معاشی تنظیم اس قسم کی تھی کہ عموماً صدفی صد نفع ہوتا تھا تو چنداں تعجب نہ تھا۔ چنانچہ ارباب تصنیف جو باتیں اس سلسلہ میں بیان کرتے ہیں، ان کے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی مثلاً بدر کے مشہور قافلے کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ایک دینار کے بدلے ایک دینار نفع حاصل ہوا تھا دو سال بعد رسول کریمؐ کے صحابۂ کرامؓ نے اس میدان میں قدم رکھا تو انھیں بھی ایک درہم کے بدلے ایک درہم نفع حاصل ہوا یعنے صدفی صد نفع حاصل ہوا[1]۔ بلکہ اس موقع پر ارباب سیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دینار کو دو دینار جب تک قریش بنا نہ لیتے واپس نہ ہوتے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد (۳) عنوان مکہ۔

تجارتی معاہدے

مکہ کی معاشی ترقی میں ہاشم سردار قریش کو خاص اہمیت حاصل ہے ہاشم ہی نے ان کے اسباب معیشت کی تنظیم کی تھی قریش کے لیے تجارتی معاہدے حاصل کیے۔ اس طرح قریش کی معاشی ترقی خصوصاً تجارت خارجہ کے لیے دروازے کھل گئے اور وہ تجارت کی بدولت مالا مال ہو گئے۔

مورخ یعقوبی لکھتا ہے کہ "ہاشم پہلے شخص ہیں جنھوں نے سال میں دو سفر جاری کیے، ایک سفر ملک شام کی طرف اور دوسرا سفر حبشہ میں نجاشی کے پاس۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قریش کی تجارت مکہ کے باہر نہ تھی اور وہ تنگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہاشم نے شام کا سفر کیا اور قیصر کے ہاں فروکش ہوئے۔"

"قیصر نے انھیں بلا بھیجا۔ اور ان کی گفتگو سنی جو اسے بہت پسند آئی چنانچہ وہ انھیں اپنے ہاں بلانے لگا۔ ہاشم نے اس سے کہا کہ اے بادشاہ! میری ایک قوم ہے، اور وہ عرب تاجر ہیں۔ انھیں ایک فرمان (پروانۂ شاہی) عطا کر جو انھیں اور ان کی تجارت کو امن دے تاکہ وہ حجاز کے چمڑے اور کپڑے برآمد کریں چنانچہ قیصر نے ایسا ہی کیا۔ ہاشم وہاں سے روانہ ہو گئے اور عرب کے جس جس قبیلے کے پاس سے ان کا گزر ہوا، ان قبائل کے سرداروں سے ایلاف (معاہدۂ امن برائے تجارت) کیا تاکہ وہ انھیں اپنے پاس اور اپنے حدود ارضی میں امن دیں اور انھوں نے مکہ سے شام تک ایلاف (معاہدۂ امن برائے تجارت) حاصل کیا۔"[1]

جس وقت ہاشم بن عبد مناف کا انتقال ہوا[2] تو قریش کو بڑا غم ہوا وہ بے چین ہو گئے ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دیگر عرب (تجارت میں) ان پر غالب آجائیں چنانچہ اسی لیے عبد شمس حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس گئے اور اس کے اور اپنے درمیان معاہدہ کی تجدید کی، اور نوفل عراق گئے اور

۱۔ تاریخ یعقوبی الجزء الاول صفحہ (۲۸۰)

۲۔ ہاشم کا انتقال تقریباً ۵۱۰ء میں ہوا۔

کسریٰ (شاہ ایران) سے ایک معاہدہ کیا[1] اور مُطّلب نے یمن کے قبائلی سرداروں سے معاہدے کیے۔ کہتے ہیں کہ قیصر روم ہی نے نجاشی کے نام سفارشی خط دیا تھا۔ اسے دیکھکر نجاشی نے ان لوگوں کو اپنے علاقے میں تجارت کے لیے آمد و رفت کا عام پروانہ عطا کیا تھا۔ چنانچہ مورخ ابن سعد کا بیان ہے کہ "ہاشم نے قیصر سے قریش کے لیے یہ عہد لیا تھا کہ امن و امان و حفاظت کے ساتھ سفر کر سکیں۔ سڑکوں اور راستوں پر اپنا مال و اسباب لے کر گزریں تو کرایہ اور محصول نہ دینا پڑے۔ قیصر نے یہ اجازت نامہ لکھ دیا اور نجاشی (فرمانروائے حبشہ) کو بھی لکھا کہ قریش کو اپنے ملک میں داخل ہونے دے۔ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے اور اسی لیے ان ممالک میں سفر کرنے کی انھیں ضرورت لاحق تھی"[2]۔

ہاشم اور پھر ان کے بھائی عبدشمس، مطّلب، اور نوفل کے قریشی بڑے ہی ممنون احسان تھے ان کو اصحاب الایلاف (معاہدۂ امن برائے تجارت کرنے والے) کے خطاب سے موسوم کرتے تھے چنانچہ محمد بن حبیب (المتوفی ۲۴۵ھ) اپنی کتاب "کتاب المحبّر" میں لکھتے ہیں کہ "ایلاف معاہدوں کو کہتے ہیں اور اصحاب الایلاف (معاہدۂ امن برائے تجارت کرنے والے) عبدمناف بن قصی کے بیٹے تھے جن کے نام ہاشم، عبدشمس، مطّلب، اور نوفل ہیں۔ ہاشم کی منڈی (متجر) شام میں تھی، اور بمقام غزہ (شام کا ایک مقام) انھوں نے انتقال کیا[3]۔

غرض "ہاشم پہلے شخص ہیں جنھوں نے قریش کے لیے دو سفر جاڑے اور گرمی میں رائج کیے۔ ہاشم، عبدشمس مطلب اور نوفل یہ چاروں عبدمناف کے بیٹے تھے"۔

"عبدمناف کے یہ چاروں بیٹے اپنے باپ کے بعد قوم کے سردار ہوئے۔ ان کو مجبرون کہتے ہیں۔ انھیں نے سب سے پہلے قریش کے لیے

---

[1] - تاریخ یعقوبی صفحہ (۲۸۲)۔ [2] طبقات ابن سعد الجزء الاول صفحہ (۴۵)
[3] - کتاب المحبر صفحہ ۱۶۳ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

دوسرے ملکوں میں سکونت کے لیے اجازت نامے حاصل کیے اس کی وجہ سے
قریش حرم سے دور دور منتشر ہو گئے۔"

"ہاشم نے شاہان روم اور غسان سے اجازت نامہ حاصل کیا۔"

"عبدشمس نے نجاشی سے اجازت حاصل کی اس وجہ سے قریش
حبشہ چلے گئے۔"

"نوفل نے شاہان ایران (اکاسرہ ایران) سے اجازت حاصل کی
اور اس وجہ سے قریش عراق جاکر آباد ہوئے۔"

"مطلب نے ملوک حمیر سے نوآبادی کی اجازت حاصل کی اور اس وجہ سے
قریش یمن جاکر آباد ہوئے چونکہ ان کی وجہ سے اللہ نے قریش کی حالت
درست کردی اس لیے ان کو مجبرون کہنے لگے۔"[1]

"عبدمناف کے بیٹوں میں سب سے پہلے ہاشم نے شام کے شہر
غزہ میں انتقال کیا اس کے بعد عبدشمس نے مکہ میں انتقال کیا اور اجیاد میں
دفن کیا گیا۔ اس کے بعد نوفل نے عراق کی راہ میں سلمان کے مقام پر انتقال
کیا۔ پھر مطلب نے یمن کے مقام ردمان میں انتقال کیا۔"[2]

غرض قریش مکہ سے یمن۔ حبشہ۔ مصر اور عراق، ایران تک تجارت کے
لئے سفر کرتے تھے۔ یہ تمام سفر اونٹوں ہی پر ہوتا تھا۔ البتہ حبشہ کو یمن سے
کشتیوں میں جاتے تھے۔ ان قریشیوں کی اُولوالعزمی دکھانے کے لیے صرف اتنا ہی
کافی ہے کہ ان کی ایک تجارتی منڈی حلب جوکہ شمالی سرے پر واقع ہے اور مکہ
جوکہ جزیرہ نمائے عرب کے وسط میں مغربی سمت پر واقع ہے، ان دونوں کے
درمیان فاصلہ اتنا ہی طویل ہے، جتنا کہ روم اور لندن کے درمیان فاصلہ ہے،
نیز عرب کا یہ راستہ بنجر اور اکثر پتھریلا ہے۔

تجارتی مسلک کمرشیل پالیسی مکہ والوں کو اپنا قافلہ منزل مقصود تک لے جانے
کے لیے مختلف قبیلوں کے سرداروں سے معاہدہ امن

۱۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۰۸۹ - ابن ہاشم۔ ۲۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۰۹۰ - ابن ہاشم۔

کرنا پڑتا تھا ورنہ قتل وغارت اور لوٹ کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس لیے مکہ والے اپنی تجارت گاہوں کے راستہ پر جو قبیلے آباد تھے ان سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی کوشش کرتے ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے اور تحفہ تحائف سے ان کو خوش رکھتے۔ قبیلہ غفار کے ایک شخص حضرت ابو ذر غفاریؓ جب اسلام لے آئے تو مشرکین مکہ ان پر ٹوٹ پڑے ابو ذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ "پھر مجھے عباسؓ نے اس حال میں پایا تو میرے اوپر جھک پڑے، پھر وہ کافروں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ تمہاری خرابی ہو، قبیلہ غفار کے ایک شخص کو قتل کیے دیتے ہو، حالانکہ تمہاری تجارت گاہ اور تمہارا راہ گزر غفار ہی کی طرف سے ہے۔ پس وہ لوگ مجھ سے باز آ گئے......[1]" حضرت ابو ذر ہی سے ایک اور حدیث اسی قسم کی مروی ہے، جس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ قبیلہ غفار شام جانے کے راستہ پر آباد تھا۔ عباس نے کہا "تمہارے تاجروں کے شام جانے کا راستہ اسی طرف ہے، پس انھوں نے ابو ذر کو چھوڑ دیا"[2]

بخاری شریف میں اور بھی دو احادیث ہیں، جن سے ان کی تجارتی پالیسی کا اظہار ہوتا ہے چنانچہ سعد مسلمان ہو کر فتح مکہ سے قبل مکہ گئے تھے تو ابو جہل نے انھیں طواف سے روکنا چاہا تو سعد نے ابو جہل سے کہا "خدا کی قسم! اگر تو مجھے طواف سے روکے گا تو میں تیری شام کی تجارت کاٹ دوں گا[3]" اور ایک جگہ حسب ذیل الفاظ ہیں" سعد نے بآواز بلند ابو جہل کو جواب دیا۔

"خبردار! اگر تو مجھے اس (طواف) سے روکے گا تو میں تجھے مدینہ کے راستہ سے روک دوں گا۔ اور تیرا مدینہ میں رکنا میرے یہاں کے رکنے سے زیادہ نقصان دہ ہے[4]"

مسلمانوں نے قریش کی معاشی قوت توڑنے کے لیے یہی حربہ استعمال کیا تھا

---

[1] - بخاری پ۱۴ ابو ذر کے اسلام کا قصہ ملاحظہ فرمائیے۔

[2] - بخاری پ۱۵ ابو ذر کے اسلام کا ذکر۔ [3] - بخاری پ۱۴ باب اسلام میں نبوت کی علامتیں۔

[4] - بخاری پ۱۶ کتاب المغازی۔

اور کامیاب ہوئے چنانچہ مورخ طبری کا بیان ہے کہ "واقعہ بدر کے بعد قریش نے شام کا عام راستہ ڈر کر ترک کر دیا اس لیے اس مرتبہ انھوں نے عراق کا راستہ اختیار کیا ......"[1]

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جو کوئی تاجر مکہ آتا تو اس سے محصول درآمد وصول کیا جاتا ہے اس کی تفصیل ہم نے چند صفحات بعد نظام مالیہ میں کی ہے۔ یوں تو قریش تاجر قوم تھی[2] اور اسی لیے خوش حال بھی تھی لیکن مکے میں اسلام کی اشاعت ہونے لگی تو قریش مسلمانوں اور آنحضرت ؐ کے سخت مخالف ہو گئے اور ان میں جو مشرف باسلام ہوتے تھے تو ان کا سماجی مقاطعہ (سوشیل بائیکاٹ) کیا جاتا تھا چنانچہ "انھوں نے مشاورت کر کے یہ عہد کیا اور اس کے لیے باقاعدہ عہد نامہ لکھا کہ ان میں سے آئندہ نہ کوئی بنو ہاشم اور بنو مطلب سے شادی بیاہ کرے اور نہ تجارت کرے۔ مذکورہ عہد نامہ کی تعمیل کے لیے سب نے سخت عہد و پیمان کیے اور اس کے شرائط کو اپنے اوپر شدت سے لازم کرنے کے لیے اس معاہدہ کو کعبہ کے وسط میں لٹکا دیا۔ قریش کے اس بند و بست پر بنو ہاشم اور بنو مطلب ابو طالب کے پاس چلے گئے اور ان کے ساتھ گھاٹی میں جا رہے ......"[3]

قریش کا یہ سماجی مقاطعہ کامیاب رہا، دو یا تین سال مسلمان اسی بےکسی کی حالت میں رہے یہاں تک کہ ان کو زندگی گزارنی مشکل ہو گئی اور کھانے پینے کی تکلیف ہونے لگی کوئی چیز ان کو میسر نہ آتی تھی[3] بالآخر نوبت بایں جا رسید کہ خود سعدؓ کے الفاظ میں "ہمیں درختوں کے پتوں کے سوا کچھ کھانے کو میسر نہ تھا یہاں تک کہ ہم بکریوں کی طرح مینگنیاں کرتے تھے"[4] یہ تو مسلمانوں کی حالت تھی مکے کے دولت مند قریشیوں کے علاوہ باقی حجازی بھی عموماً عسرت ہی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کسریٰ (شاہ ایران) کے گورنر نے مسلم حملہ آوروں سے سوال کیا کہ "تم کون لوگ ہو؟ تو مغیرہ بن شعبہ نے جواب دیا کہ ہم عرب کے

---

[1] - تاریخ طبری صفحہ ۹۳۲ [2] طبری صفحہ ۱۱۹۰ - [3] - طبری صفحہ ۱۱۹۰

[4] - بخاری پ ۲۲ کتاب الطعام -

لوگ ہیں ہم سخت بدبختی اور سخت مصیبت میں گرفتار تھے۔ مارے بھوک کے چمڑے اور کھجور کی گٹھلیوں کو چوسا کرتے تھے۔ چمڑے اور بال کی پوشاک پہنتے اور درختوں اور پتھروں کی پرستش کرتے تھے[1]

دیگر پیشے

تجارت کے علاوہ دوسرا بڑا پیشہ گلہ بانی تھا یہ لوگ اونٹ اور بکریاں چراتے تھے۔ چنانچہ خود رسول کریمؐ نے بچپن میں بکریاں چرائیں، رسول اکرمؐ کا قاصد جب شام میں قیصر کے پاس گیا تو اس کا بھی ان ہی الفاظ میں تعارف کرایا گیا کہ "یہ شخص عرب ہے، یہ اونٹ اور بکریاں چراتے ہیں یہی ان کے ملک میں عام مشغلہ ہوتا ہے[2]" ابوجہل کا مہری سانڈ اونٹ تھا جس سے وہ نسل کشی اور جنگ کا کام لیتا تھا[3]

مسلم ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "کتاب المعارف" میں ایک باب کے وغیرہ کے پیشہ وروں سے متعلق لکھا ہے۔ اور پھر نام بنام مشہور صحابیوں کے پیشوں کی صراحت کی ہے، جو پیشے اس وقت رائج تھے ذیل میں ان پیشوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) پارچہ فروش (۲) غلہ فروش (۳) عطر فروش (۴) تیل فروش (۵) شراب فروش (۶) چرم فروش (۷) مویشی فروش (۸) قصاب (۹) درزی (۱۰) بڑھئی (۱۱) لوہار (۱۲) تیر ساز (۱۳) اونٹوں اور گھوڑوں کا علاج کرنیوالے (۱۴) گوئیے۔

ابن قتیبہ نے نام بنام مشہور شہریوں کا پیشہ بھی درج کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ "ابو طالب عطر فروش تھے اور بعض اوقات گیہوں فروخت کرتے تھے، اسی طرح ابوبکر صدیقؓ پارچہ فروش تھے۔ عثمانؓ پارچہ فروش تھے۔ سعد بن ابی وقاصؓ تیر بناتے تھے، اور عوامؓ زبیرؓ کے باپ درزی کا پیشہ کرتے تھے اور زبیرؓ قصاب تھے، اور عمرو بن العاصؓ بھی قصاب تھے۔ اور عثمان بن طلحہؓ جنھوں نے

---

[1] - بخاری پ۱۲ کتاب الجہاد۔ [2] تاریخ طبری صفحہ ۱۵۶۲ ۶ھ کے واقعات

[3] - تاریخ طبری ص ۱۳۵۹ حالات جنگ بدر ۲ھ۔

کعبہ کی کنجی رسول اللہ کے حوالے کی تھی درزی کا پیشہ کرتے تھے۔ ابوسفیان بن حربؓ تیل اور چمڑا فروخت کرتے تھے، اور عقبہ ابن ابی وقاصؓ بڑھی تھے، اور امیہ بن خلفؓ پھل فروخت کرتے تھے، اور عاص بن ہشام ابوجہل کا بھائی لوہار تھا۔ عامر بن کریز قصاب تھا اور ولید بن مغیرہ لوہار تھا، اور عقبہ بن ابی معیط شراب فروش تھا، اور عبداللہ بن جدعان چوپائے فروخت کرتا تھا۔ میدان میں جانور پالتا اور ان کے بچے فروخت کرتا تھا۔ عاص بن وائل عمرو بن العاص کا باپ گھوڑوں اور اونٹوں کا علاج کرتا تھا۔ اور نضر بن الحارث رباب بجایا کرتا تھا[1]۔ "عباس بن عبدالمطلب یمن سے عطر خرید کر لاتے اور اسے موسم حج میں فروخت کرتے[2]۔" حضرت خباب کہتے ہیں کہ میں ایک لوہار تھا میں نے عاص بن وائل کے لیے ایک تلوار بنائی تھی[3]۔

غرض کسی متمدن شہر میں جو پیشہ ور ہوتے ہیں وہ سب مکے میں موجود تھے۔

مذکورۂ بالا فہرست دیکھنے سے اور ایک بات کا پتہ چلتا ہے کہ مکہ میں ہندوستان کی طرح یہ لازمی نہیں تھا کہ بچہ باپ کا پیشہ ہی اختیار کرے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عوام درزی کا پیشہ کرتے تھے، اور ان کے بیٹے زبیرؓ قصابی کا پیشہ کرتے تھے۔ اسی طرح عمرو بن العاصؓ کی بابت کہتے ہیں کہ وہ قصاب تھے، اور ان کے والد عاص بن وائل گھوڑوں اور اونٹوں کا علاج کرتے تھے۔

بعض اہم کاموں کے لیے ماہرین کو باہر سے بھی بلایا جاتا تھا۔ چنانچہ ازرقی (المتوفی ۲۲۳ھ) نے لکھا ہے کہ "وہ شخص جس نے کعبہ کی تعمیر کی اس کا نام باقوم تھا اور وہ ایک رومی تھا[4]۔" اور ایک جگہ ازرقی نے لکھا ہے کہ "انھوں نے ایک رومی جس کا نام باقوم تھا اور جو بڑھئی اور معمار کا کام جانتا تھا اس کو لے لیا[5]۔"

---

[1] - کتاب المعارف ابن قتیبہ صفحہ (۱۹۳) عنوان "صناعات الاشراف"۔ [2] تاریخ طبری ص ۱۱۶۲

[3] - بخاری پ۵ کتاب السلم نیز بخاری پ۸ کتاب البیوع، بخاری پ۸ کتاب القرض۔

[4] - ازرقی اخبار مکہ صفحہ (۱۱۴)۔

[5] - اخبار مکہ صفحہ (۱۰۷)۔

مورخ طبری نے بتایا ہے کہ وہ قبطی تھا۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "بحر احمر نے ایک رومی تاجر کا برباد شدہ جہاز ساحل جدہ پر لگایا۔ قریش نے جہاز کی لکڑی کو لے کر کعبہ کی چھت تیار کی۔ اس کام کو مکہ میں ایک قبطی بڑھئی تھا جس نے اپنی رائے کے مطابق انجام دیا"[1]

غرض چاہے وہ رومی ہو یا قبطی (مصری) بہر حال ملکی نہ تھا اور چونکہ اس زمانے میں مصر پر رومیوں کا قبضہ تھا اس لیے جاہلیت کے زاویوں نے اس میں تمیز نہ کی ہوگی۔

لونڈی غلام یونان، مصر، روم اور ہندوستان کی طرح جاہلیت کے عرب میں بھی ادارۂ غلامی موجود تھا، چنانچہ قریش کے پاس بھی لونڈی غلام تھے۔ اور وہ مثل منقولہ جائداد کے فروخت کیے جاتے تھے، جب یہ لونڈی غلام اسلام کی مساوات دیکھ کر اسلام لاتے تو قریش ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے تھے چنانچہ "امیہ مکہ میں بلال رض کو طرح طرح کی اذیتیں دیتا تھا تاکہ وہ اسلام ترک کر دیں، وہ ان کو ایک صاف چٹان پر جب وہ دھوپ سے تپ جاتی لے جاتا اور اس پر ان کو چت لٹاتا، سینہ پر ایک بڑا پتھر رکھ دیتا اور پھر کہتا کہ جب تک تو محمدؐ کے دین کو ترک نہ کریگا یہ سزا ملتی رہے گی مگر باوجود اس عذاب کے بلال رض یہی کہتے تھے" وہ ایک ہے، وہ ایک ہے[2] بالآخر حضرت ابوبکر رض نے بلال رض کو ۵ اوقیہ میں خرید کر آزاد کر دیا[3]

حضرت سلمان فارسی کہتے ہیں کہ "میں شہر رامہرمز کا رہنے والا تھا۔ لوگوں نے مجھے ظلماً غلام بنا لیا تھا اور میں دس سے زیادہ مالکوں کے پاس دست بدست منتقل ہوتا رہا[4]" طریقہ غلامی کی مزید بحث باب دوم میں اپنے محل پر پیش ہوگی۔

اجرا اور مزدور کے تعلقات قریش غلاموں سے کام لینے کے علاوہ اُجرت پر بھی مزدور رکھا کرتے تھے خصوصاً تجارتی کاروانوں کے سلسلہ میں

---

[1] تاریخ طبری صفحہ ۱۱۳۵ [2] تاریخ طبری صفحہ ۱۳۲۷ [3] بخاری ہجرت [4] بخاری سلمان فارسی کے اسلام کا تذکرہ۔

جس میں بڑے پیمانہ پر کام ہوتا اعلیٰ و ادنیٰ ہر قسم کے مزدور رکھے جاتے تھے خصوصاً قافلوں کی راہنمائی کے لیے اجرت ہی پر لوگوں کا تقرر ہوتا تھا۔ چنانچہ "واقعہ بدر کے بعد قریش نے شام کا عام راستہ ڈر کر ترک کر دیا، اور عراق کا راستہ اختیار کیا..... اس راہ سے شام چلے۔ انھوں نے قبیلہ بکر بن وائل کے فرات بن حیان کو راہبری کے لیے اجرت پر لیا[1] اس طرح جب رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ ہجرت کرنے لگے تو عبداللہ بن اریقط کو انھوں نے راستہ کی واقفیت کی وجہ سے اس کام کے لیے اجرت پر مقرر کر لیا تھا[2]۔

کبھی سرمایہ دار کاروانوں کی تنظیم اور مال فروخت کرنے کے لیے کمیشن ایجنٹ دلال، گماشتے مقرر کرتے اور منافع میں ان کو حصہ دار بنا لیتے چنانچہ خود حضرت خدیجہؓ نے حضرت نبی کریمؐ کو حصہ دار بنایا تھا اس کی تفصیل ابھی اوپر بیان ہو چکی ہے[3]۔

کاروانوں کی تنظیم راہنمائی وغیرہ کے لیے قریش، اونٹ اور بکریاں چرانے کے لیے بھی اجرت پر مزدوروں کو مقرر کیا کرتے تھے، مزدوروں کی اجرت اس زمانے کے معیار کے لحاظ سے بھی قلیل ہوتی تھی، چنانچہ رسول اکرمؐ نے بھی کچھ قیراطوں پر مکہ والوں کی بکریاں چرائی تھیں[4] سنن ابن ماجہ میں اور اتنا اضافہ ہے کہ "ہر بکری ایک قیراط پر چرایا کرتے تھے[5]۔"

دیگر اہل پیشہ کی طرح مویشی چرانے والوں کی زندگی کس قدر بے لطف ہوتی تھی اس کا تذکرہ خود رسالت مآب صلی اللہ کی زبان مبارک سے سنیئے فرماتے ہیں "میں نے ایک رات اس قریشی نوعمر لڑکے سے جو میرے ساتھ اعلیٰ مکہ میں مویشی چراتا تھا کہا کہ اگر تم میری بکریوں کی نگرانی رکھو تو میں مکہ جا کر دوسرے نوجوانوں کی طرح پر لطف باتیں کر آؤں۔ اس نے کہا اچھا تم جاؤ۔ میں اس غرض سے مکہ آیا۔ آبادی کے پہلے گھر تک پہنچا تھا کہ مجھے دف اور باجوں کی آواز آئی۔

---

[1] ۔ تاریخ طبری ص ۱۳۲۷ [2] ۔ بخاری ۱۵ ہجرت ابن سعد جزو اول صفحہ ۱۵۵ طبری صفحہ ۱۲۳۶ ۔
[3] ۔ قریشی تجارت کا عنوان ملاحظہ کیا جائے ۔
[4] بخاری ۹ [5] ۔ سنن ابن ماجہ الجزء ثانی باب الصناعات ۔

میں نے پوچھا کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ فلاں شخص کی فلاں عورت سے شادی ہوئی ہے یہ اس کا جلوس ہے۔ میں اسے دیکھنے بیٹھ گیا۔ اللہ نے میرے کان پٹ کر دیے۔ میں سو گیا۔ آفتاب کی تمازت نے مجھے بیدار کیا۔"[1]

حدیثوں کے مطالعہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ادنیٰ مزدوروں کے ساتھ آجرین کا برتاؤ سخت اور ظالمانہ تھا، اس کے ثبوت میں صحیح بخاری سے ایک طویل حدیث پیش کی جاتی ہے جس سے عہد جاہلیت میں آجر اور مزدور کے تعلقات کا اندازہ ہوگا۔

"......بنو ہاشم میں ایک شخص تھا اس کو ایک قریشی نے جو دوسرے خاندان کا تھا مزدوری میں رکھا۔ وہ ہاشمی اس قریشی کے ہمراہ اس کے اونٹوں میں چلا جا رہا تھا کہ اس طرف ایک اور ہاشمی کا گزر ہوا، جس کے تھیلے کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ میری ایک ڈوری سے مدد کر کہ اس سے تھیلے کا منھ باندھ لوں تاکہ اونٹ نہ بھاگیں چنانچہ اس ہاشمی مزدور نے اس کو اونٹ باندھنے کی ایک ڈوری دیدی اور اس نے تھیلے کا منھ باندھ لیا۔ پھر جب لوگ فروکش ہوئے تو سوائے ایک اونٹ کے سب باندھ دیے گئے۔ جس شخص نے اس ہاشمی کو مزدوری میں رکھا تھا اس نے کہا کہ اس اونٹ کا کیا حال ہے کہ یہ منجملہ اور اونٹوں کے نہیں باندھا گیا؟ اس نے کہا اس کی ڈوری نہیں ہے قریشی نے کہا تو پھر اس کی ڈوری کہاں ہے؟ حضرت ابن عباسؓ (جو کہ راوی حدیث ہیں) کہتے ہیں کہ پھر اس قریشی نے اس ہاشمی مزدور کو ایک لاٹھی رسید کی کہ بالآخر اسی میں اس کی موت ہوئی۔"

پھر اس طرف سے ایک یمن کے رہنے والے کا گزر ہوا تو اس ہاشمی نے اس سے پوچھا کہ کیا تو موسم حج میں جاتا ہے؟ اس نے کہا میں نہیں جاتا اور کبھی چلا جاؤں گا۔ اس نے کہا کیا تو میری طرف سے ایک پیغام پہنچا دے گا؟ اس نے کہا۔ ہاں! اس ہاشمی نے کہا کہ جب موسم حج میں جائے تو آواز دینا کہ اے آل قریش! جب وہ تمھیں جواب دیں تو آواز دینا کہ

[1] ۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۱۲۷ ۔

اے آل بنی ہاشم! پھر اگر وہ تمھیں جواب دیں تو ابوطالب کو پوچھنا اور ان سے کہہ دینا کہ فلاں شخص نے ایک ڈوری کی بابت مجھے قتل کر دیا۔" اور وہ مزدور مر گیا۔ پھر جب وہ شخص جس نے اسے مزدوری میں رکھا تھا مکہ پہنچا تو ابوطالب اس کے پاس گئے اور پوچھا کہ ہمارے ساتھی کا کیا حال ہے؟ اس قریشی نے کہا کہ وہ بیمار ہو گیا تھا میں نے اس کی اچھی طرح تیمارداری کی پھر (جب وہ مر گیا تو) میں نے اسے دفن کر دیا۔ ابوطالب نے کہا تم سے اسی بات کی امید تھی۔"

"کچھ دنوں کے بعد وہ شخص بھی جسے اس ہاشمی نے پیغام رسانی کی وصیت کی تھی، موسم حج میں پہنچا اور اس نے پکارا کہ اے آل قریش! لوگوں نے کہا یہ قریش ہیں۔ اس نے کہا اے آل بنی ہاشم! لوگوں نے کہا کہ یہ بنو ہاشم ہیں۔ اس نے کہا ابوطالب کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا یہ ابوطالب ہیں۔ اس نے کہا کہ فلاں شخص نے یہ وصیت کی تھی کہ میں تمھیں ایک پیغام پہنچا دوں کہ فلاں شخص نے اسے ایک ڈوری کی بابت قتل کر دیا۔"

"ابوطالب اس قریشی کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ ان تینوں باتوں میں سے ایک بات اختیار کر لے۔ اگر تو چاہے تو سو اونٹ دے دے کیونکہ تو نے ہی ہمارے ساتھی کو قتل کیا ہے۔ اگر تو چاہے تو پچاس آدمی تیری قوم میں سے اس بات کی قسم کھالیں کہ تو نے اسے قتل نہیں کیا۔ اگر تو یہ بات نہ مانے گا تو ہم تجھے اس کے عوض قتل کر دیں گے۔"

"وہ اپنی قوم کے پاس گیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم قسم کھالیں گے، پھر بنو ہاشم کی ایک عورت جو ان ہی لوگوں میں سے ایک شخص کی بیوی تھی اور اس کا ایک لڑکا بھی تھا، ابوطالب کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ اے ابوطالب! میں یہ چاہتی ہوں کہ تم میرے اس بیٹے کے منجملہ پچاس آدمیوں کو معاف کر دو، اور اس سے قسم نہ لو جب کہ قسم لی جائے۔ ابوطالب نے اسے معاف کر دیا۔ پھر ایک شخص آیا اور کہا کہ اے ابوطالب! تم سو اونٹ کے عوض پچاس آدمیوں سے قسم لینی چاہتے ہو تو ہر شخص کے عوض میں دو اونٹ آئے۔ پس یہ دو اونٹ مجھ سے لے لو، اور مجھ سے قسم نہ لو جب کہ قسم لی جائے گی۔ ابوطالب نے ان دو اونٹوں کو

لے لیا، اور اڑتالیس آدمی آئے اور انھوں نے قسم کھالی[1]

مسئلہ آبادی

ہر ملک میں محنت کی مقدار کا دار و مدار مزدوروں کی تعداد پر ہوتا ہے عرب میں آئے دن لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ سال میں صرف چار مہینے امن رہتا تھا۔ ماسوا اس کے باشندوں کے خیالات عام طور پر ہمیشہ آبادی کو گھٹانے کی طرف مائل تھے چنانچہ "جاہلیت کے لوگ فقر و فاقہ سے ڈر کر اپنے بچوں کو قتل کر دیا کرتے تھے[2]

مسلمہ کذاب جس نے آنحضرتؐ کے عہد میں نبوت کا یمامہ میں دعوی کیا تھا اور جو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں مارا گیا" اس نے اپنی جماعت کے لیے یہ قانون بنایا تھا کہ جس شخص کا ایک لڑکا ہو، جو اس کا وارث ہو سکے تو اسے اس لڑکے کے مرنے تک اپنی عورت سے ہم بستر نہ ہونا چاہیے۔ البتہ اگر وہ مر جائے تو پھر اولاد پیدا کرنے کے خیال سے ہم بستر ہو سکتا ہے اور اگر پھر بیٹا پیدا ہو جائے تو علحدگی اختیار کر لے۔ اس طرح اس نے ہر ایسے شخص پر جس کا لڑکا ہو ہم بستری حرام کر دی تھی[3]

اچھی نسل کے بچے پیدا کرنے کے لیے جاہلیت کے عربوں نے نکاحِ استبضاع کا جو طریقہ اختیار کر لیا تھا اسے ہم مکہ کے معاشرتی حالات میں بیان کر چکے ہیں۔

دختر کشی اور عزل

عرب کے بعض قبیلوں میں دختر کشی کا بھی رواج تھا۔ اس کی چند ایک وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ فقر و فاقہ کے خوف سے یہ بہیمانہ فعل کیا کرتے تھے[4] نیز ان عربوں میں عزل کا رواج تھا جو برتھ کنٹرول کی ایک شکل تھی۔

---

[1] ۔ بخاری پ ۲۸ قسامت نیز کتاب المحبر لمحمد بن حبیب صفحہ (۳۳۵ و ۳۳۶) کتاب المحبر میں اس واقعہ کو کچھ مزید تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور ابوطالب نے اس سلسلہ میں اشعار بھی کہے ہیں۔

[2] ۔ تفسیر طبری الجزء الخامس العشر صفحہ (۵۴) آیت لا تقتلوا اولادکم۔ [3] تاریخ طبری ۱۹۱۶/۱ عہد ابوبکرؓ

[4] ۔ تفسیر طبری الجزء الخامس العشر صفحہ (۵۴) آیت لا تقتلوا اولادکم۔

سودی کاروبار ملک شام کو کاروانوں کی روانگی کا وقت آتا تو دینار کی طلب بڑھ جاتی۔ مکہ کے تاجر موجودہ زمانے کے ساہوکاروں سے کچھ مختلف نہ تھے۔ وہ اولاً تو سکہ کی ہی تجارت کرتے موقع دیکھ کر وہ اپنے سرمایہ کو کاروبار میں لگاتے۔ اس طرح وہ بڑے بڑے کاروانوں کے کاروبار اور تاجروں کے لیے سرمایہ فراہم کرتے نیز جنھیں کاروبار شروع کرنے کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کے لیے بھی رقومات فراہم کرتے۔[1]

"مکہ ہنڈی گھر اور بنک کاری کا شہر تھا۔ اس لیے مکہ میں اس قسم کے کاروبار قائم ہونے سے اسی قسم کے رسم و رواج اور ادارے نمودار ہوئے، جو اس قسم کے کاروبار سے ظہور میں آئے ہیں۔ بعض وقت یہ ربوا یا سود تھا جو اپنی تمام برائیوں کا حامل تھا۔ دینار کے بدلے دینار، درہم کے بدلے درہم یعنے صد فی صد ۱۰۰٪ سود لیا جاتا تھا۔ جب قرآن نے اس کو حرام قرار دیا تو قریش نے حجت پیش کی کہ یہ بھی تو ایک تجارت ہے۔ "قَالُوٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا" وہ کہتے کہ سود تو تجارت کے جیسا ہی ہے، جہاں اصل کو کرایے پر چلایا جاتا ہے۔"[2]

سودی لین دین کا طریقہ "جاہلی عرب مدت معینہ کے لیے قرض دیتے چنانچہ جب قرض کی ادائی کا زمانہ آتا تو قرض خواہ مقروض سے قرض یا سود کا مطالبہ کرتا۔ اب اگر وہ قرض ادا نہیں کر سکتا تو اس پر قرض کو دوگنا کر دیا جاتا۔ مثلاً اگر ایک سال کی اونٹنی ہوتی تو اس کو دو سال کی اور اگر ایک پیمانہ غلہ ہوتا تو اس کو دو پیمانہ کر دیا جاتا تھا۔"[3]

"زمانۂ جاہلیت میں کچھ مدت کے لیے ایک شخص کا کچھ مال دوسرے پر واجب الادا ہوتا جب ادائیگی کا زمانہ پہنچتا تو قرض خواہ دریافت کرتا کہ آیا تو مال ادا کرتا ہے یا سود دیتا ہے؟ پس اگر وہ ادا کر دیتا تو اس کو لے لیتا ورنہ بصورتِ دیگر مدت بڑھا کر زیادتی طلب کرتا۔"[4]

---

[1] و [2] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد (۳) عنوان "مکہ" [3] تاریخ تشریع السلامی للعلامۃ محمد الخضری صفحہ [4] ۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۵۵) آیت: لا تاکلوا الربوا ۔

مورخ طبریؒ نے اپنی تفسیر میں مزید تفصیل سے زمانہ جاہلیت کے سودی لین دین کے طریقے کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ "جاہلیت میں جو ربوا کا طریقہ رائج تھا وہ یہ تھا کہ کسی شخص کا کچھ مدت تک کے لیے کسی پر قرض واجب الادا ہوتا جب مدت ادائیگی آپہنچتی تو وہ دریافت کرتا کہ آیا تو ادا کرتا ہے یا زیادتی دیتا ہے؟ اگر اس کے پاس کچھ چیز ہوتی تو وہ ادا کر دیتا ورنہ اس سے ایک سال اور آگے بڑھا دیتا چنانچہ اگر ایک سال کی اونٹنی واجب الادا ہوتی تو دوسرے سال دو سال کی اونٹنی طلب کرتا پھر تیسرے سال تین سال عمر والی اونٹنی طلب کرتا۔ پھر چوتھے سال چار سال کا اونٹ اور اسی طرح اس کے آگے"[1]

"اور زر میں بھی یہی طریقہ تھا کہ مقروض کے پاس رقم نہ ہوتی تو اس کو آئندہ سال دوگنا کر دیتا پھر اگر اس کے بعد کے سال ادا نہ ہوتا تو پھر اس کا دوگنا کر دیتا یعنے اگر سَو واجب الادا ہوتے دوسرے سال دو سَو طلب کرتا پھر بھی نہ دیتا تو اس کے بعد کے سال چار سَو طلب کرتا اس طرح ہر سال دوگنا طلب کرتا یا مقروض ادا کر دیتا"[2]

"ربوا کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) ربوا نسیہ (ادھار) اور (۲) ربوا فضل (نقد) ربوا نسیہ (ادھار) جو جاہلیت میں مشہور اور رائج تھا یہ تھا کہ وہ لوگوں کو مال دیتے اور ہر مہینہ کچھ مقررہ سود لیتے اور راس المال (اصل) طلب کرتے۔ اگر ادائیگی میں لیت ولعل کی جاتی تو رقم اور مدت میں اضافہ کر دیتے، اور اسی کو ربوا کہتے تھے۔ اور ربوا نقد یہ تھا کہ شئے کو شئے کے بدلے مثلاً گیہوں کو گیہوں کے بدلے یا جو کو جو کے بدلے نفع کے ساتھ فروخت کرتے"[3]

سود کس بات کا معاوضہ تھا؟

"عرب کے معمولات، عادات، اور احادیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو لوگ ادائی قرض کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ ان کے لیے قرض کی جو مدت مقرر کی جاتی تھی، سود اسی مدت انتظار کا

---

[1] ۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۵۶) آیت: لاتاکلوا الربوا اضعافاً۔
[2] ۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۵۶) آیت: لاتاکلوا الربوا اضعافاً۔

معاوضہ تھا[1]۔ چنانچہ بیہقی کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ "کسی شخص کا کسی پر قرض ہوتا۔ مقروض قرضخواہ سے کہتا کہ میں تجھے اتنا اتنا زیادہ دوں گا تو مجھے مہلت دے[2]۔" "زمانۂ جاہلیت میں کچھ مدت کے لیے ایک شخص کا کچھ مال دوسرے پر واجب الادا ہوتا، جب ادائیگی کا زمانہ آپہنچتا تو قرضخواہ دریافت کرتا کہ آیا تو ادا کرتا ہے یا سود دیتا ہے؟ پس اگر وہ ادا کر دیتا تو اس کو لے لیتا ورنہ بصورت دیگر مدت بڑھا کر زیادتی طلب کرتا[3]۔" مورخ طبری لکھتے ہیں کہ "کسی شخص پر کسی کا مال ایک مُدت تک کے لیے رہتا، جب مدتِ ادائیگی آپہنچتی تو قرضخواہ مقروض سے مال طلب کرتا۔ مقروض کہتا کہ تیرے قرض کو ادا کرنے کی مہلت بڑھا دے میں تیرے مال میں زیادتی کر دونگا۔ وہ دونوں ایسا ہی کرتے اور یہی سُود درسُود تھا[4]۔"

"جس ربوا سے خدا نے منع کیا وہ یہ تھا کہ کسی شخص پر کسی کا سُود ہوتا تھا وہ کہتا کہ میں تجھے اتنا اتنا دوں گا تو مجھے مہلت دے تو وہ مہلت دے دیتا[5]۔"

المختصر ایک فریق انتظارکشی کرتا اور مدتِ ادائیگی میں توسیع دے دیتا اور دوسرا فریق اس انتظارکشی کے معاوضے میں مال واجب الادا میں زیادتی کر دیتا۔

"مدتِ ادائیگی میں مقروض قرضخواہ کو کہتا کہ تو مدت میں توسیع دیدے میں مال میں اضافہ کر دوں گا[6]۔" ماسوا اس کے جاہلیت کے ساہوکار ــــ جیسا کہ آج کل بھی ہندوستان میں ہوتا ہے ــــ قرض دیتے وقت ابتدا سے سُود مقرر کرتے تھے۔

"وہ اپنا پیسہ دوسروں کو اس شرط پر قرض دیتے تھے کہ ہر مہینے میں مقدار معین (سود) لیں گے اور اصل رقم جوں کی توں برقرار رہے گی پھر جب میعاد قرض گزر جاتی تو

---

[1] ۔ تاریخ التشریع الاسلامی لعلامۃ محمد الخضری مطبوعہ مصر۔
[2] ۔ السنن الکبریٰ بیہقی، الجزء الخامس کتاب البیوع ص ۲۷۵، ابواب الربوا
[3] السنن الکبریٰ بیہقی، کتاب البیوع الجزء الخامس ص ۲۷۵، ابواب الربوا
[4] ۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۵۵) آیت: لا تاکلوا الربوا اضعافاً۔
[5] ۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۵۵) آیت: لا تاکلوا الربوا اضعافاً۔
[6] ۔ تفسیر خازن الجزء الاول صفحہ (۲۰۳) مطبوعہ مصر۔

قرضخواہ مقروضوں سے اپنی اصل رقم کا مطالبہ کرتے۔ اگر اس وقت قرضہ ادا نہ کر سکتے تو قرضخواہ اپنے حق میں اضافہ اور مدت میں توسیع کر دیتے۔ الغرض زمانۂ جاہلیت میں لوگ جس سود کا آپس میں کاروبار کرتے تھے وہ یہی سود تھا۔[1]

معاشرہ میں سود کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا

جاہلیت میں بھی بعض عرب سود کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور سود کے ذریعہ حاصل کردہ رقم کو ناپاک خیال کرتے تھے چنانچہ اس کی ایک مثال تاریخ طبری میں موجود ہے " ابو وہب نے قریش سے کہا کہ کعبہ کی تعمیر میں صرف اپنی پاک کمائی لگانا، کسی کسبی کا بھاڑا، سود کا روپیہ، ظلم کر کے حاصل کیا ہوا روپیہ نہ لگانا"[2]

مکہ کے اصل دار

یوں تو زمانۂ جاہلیت میں اہل مکہ کی ایک بڑی تعداد سودی کاروبار کرتی تھی لیکن حضرت عباسؓ، حضرت عثمانؓ، اور خالد بن ولید بڑے پیمانہ پر سودی کاروبار کرتے تھے" حضرت عباسؓ کا بہت سا روپیہ لوگوں میں پھیلا ہوا تھا[3] یہی وجہ تھی کہ سودی کاروبار کے امتناعی احکام کے بعد رسول اللہؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں تصریح فرمادی کہ" .... خدا نے فیصلہ کر دیا ہے کہ سود قطعی ساقط ہے اور پہلا سود جو میں ساقط کرتا ہوں وہ عباس بن عبدالمطلب کا ہے"[4]

حضرت عباسؓ اور خالد بن ولید زمانہ جاہلیت میں سودی کاروبار کو جس طریقہ سے چلا رہے تھے، اس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی یا" باہمی مشارکت" کے اصول پر ان کا یہ کاروبار جاری تھا۔ ان لوگوں کا یہ کاروبار صرف شہر مکہ تک محدود نہ تھا بلکہ دور دور کے علاقوں مثلاً طائف والوں کو بھی سودی قرض دیا کرتے تھے۔ " حضرت عباسؓ اور خالد بن ولیدؓ زمانۂ جاہلیت میں باہمی شرکت کے ساتھ سودی کاروبار کرتے تھے، اور خاندان بنو عمرو بن عمر جو قبیلہ ثقیف کے لوگ تھے،

---

[1] تفسیر کبیر رازی الجزالثانی صفحہ (۵۸)۔ [2] تاریخ طبری صفحہ ۱۱۳۶۔ [3] تاریخ طبری ص ۱۴۵۳ سنہ ۱۰ھ کے واقعات۔ [4] تاریخ طبری ص ۱۴۵۵ سنہ ۱۰ھ کے واقعات

ان لوگوں کو بھی سودی قرض دیتے تھے۔ پس جب اسلام آیا تو ان کے متعلق سود کی بہت بڑی رقم واجب الوصول تھی[1] لیکن سود حرام ہوتے ہی ایسے جملہ مطالبات ساقط ہو گئے۔

قرضخواہ اور مقروض کے نزاعات آئے دن قرضخواہ اور مقروض میں جھگڑے ہوتے رہتے تھے اور بعض وقت تو قبیلہ واری جنگ کی نوبت پہنچتی تھی، اس سلسلے میں ایک نرالا واقعہ درج کیا جاتا ہے
"کنانہ (قریش) کے ایک شخص پر بنو نصر بن معاویہ بن بکر بن ہوازن کے ایک شخص کا کچھ قرض تھا لیکن یہ کنانی مفلس ہو گیا اور اپنا قرض ادا نہ کر سکا اس لیے بنو نصر کا وہ شخص عکاظ کے میلے میں ایک بندر لایا اور میلے میں کنانی اور اس کی قوم کی تذلیل کے لیے پکار کر کہنے لگا کہ جو بندر میرے پاس ہے اگر ایسا بندر کوئی مجھے دے تو اس کے معاوضہ میں میں قرض منتقل کر دوں گا جو مجھے فلاں کنانی سے واجب الوصول ہے۔ ہے کوئی ایسا شخص جو ایسا بندر مجھے دیدے؟ اتفاقاً کنانہ کا ایک شخص ادھر آنکلا اور جب اس نے اپنی قوم کی یہ بے عزتی کی بات سنی تو اس نے براہ حمیت والغت قومی اس بندر کو مار ڈالا۔ نصری نے اپنی قوم قیس میں جا کر دہائی مچائی اور اس کنانی نے بھی اپنی قوم کنانہ میں جا کر فریاد کی آواز بلند کی نتیجۃً طرفین کے لوگ جمع ہو گئے اور نوبت باینجا رسید کہ جنگ ہو جائے لیکن لوگوں نے صلح کرا دی[2]"

مکہ کی دولت تجارتی کاروبار اور تجارتی سفر شروع کرنے سے پیشتر قریش نہایت تنگدستی اور مفلسی سے اپنی زندگی بسر کرتے تھے چنانچہ اس کے قبل تذکرہ ہو چکا ہے کہ سردار ہاشم کے زمانے میں مفلسی اور قحط نے آگھیرا تھا۔ اسی مفلسی اور قحط نے انھیں وطن سے تجارتی سفر کے لیے نکلنے پر مجبور کیا یہ فلسطین

---

[1] تفسیر خازن الجزء الاول صفحہ (۲۰۳) آیت: وذروا ما بقی من الربوا۔ نیز تفسیر طبری الجزء الثالث آیت مذکور۔ [2] معارف ابن قتیبہ صفحہ ۲۰۱ تاریخ الکامل لابن الاثیر الجزری الجزء الاول۔ الفجار الاول نیز واقدی۔

گئے اور وہاں سے بہت سا آٹا لیکر مکہ آئے اور شوربہ میں روٹیوں کو ترکرکے اپنی قوم کو کھلایا حتیٰ کہ اسی روٹی کو شوربہ میں ملاکر کھلانے سے (ہشم) ان کا نام ہی ہاشم ہوگیا۔ حالانکہ ان کا اصلی نام عمرو ہے۔ اسی کے متعلق مطرود بن کعب الخزاعی یا ابن الکلبی کے قول کے مطابق ابن الزبعری نے یہ شعر کہا ہے ؎

عَمرو الذی ھَشَمَ الثرید لقومہٖ ÷ وَرِجَالُ مَکَّۃَ مُسنِتُونَ عِجَافُ[1]

ترجمہ: عمرو وہ شخص ہے جس نے اپنی قوم کو روٹی چورکر (ھشم) کھلائی جبکہ مکہ والے سخت قحط میں مبتلا ہوگئے تھے۔

ان ہی تجارتی سفروں کی بدولت مکہ میں دولت سمٹ سمٹ کر آنے لگی ایک ایک وہ زمانہ تھا کہ کعبہ بنانے کے لیے بھی سرمایہ مہیا نہیں ہورہا تھا جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ فرماتی ہیں کہ "میں نے نبی کریم ﷺ کے متعلق دریافت کیا کہ کیا وہ بھی کعبہ میں داخل ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! میں نے عرض کیا کہ پھر ان لوگوں نے اس کو کعبہ میں کیوں نہ داخل کیا؟ آپ نے فرمایا: تمہاری قوم کے پاس خرچ کم ہوگیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ دروازہ کی کیا کیفیت ہے کہ اس قدر زمین سے اونچا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ تمہاری قوم نے اس لیے کیا تھا کہ جسے چاہیں (کعبہ کے اندر) داخل کریں اور جسے چاہیں روک دیں...."[3]

بہرحال مذکورۂ بالا روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ان ہی قریشیوں پر وہ بھی گزرا تھا کہ قوم کے پاس کعبہ بنانے کے لیے بھی خرچ کم تھا یا اب یہ حال کہ ایک ایک کاروان میں ہزاروں دینار لگانے لگے۔ اور یوں مکہ کے ساہوکاروں کے پاس دولت سمٹ سمٹ کر جمع ہونی شروع ہوئی قافلہ بدر کے منتظمین لکھ پتی تھے اور انھوں نے جو ہزاروں دینار لگائے تھے، اس سے ان کی اصل دولت کا پتہ پورا پورا نہیں ملتا۔ ولید بن مغیرہ جو کہ بنو مخزوم کے قبیلۂ کا رئیس تھا وہ بھی مکہ کے لکھ پتیوں میں شمار ہوتا تھا۔ خود ام المومنین حضرت خدیجہؓ حجاز کی مشہور و ممتاز سرمایہ دار تھیں۔ ابوالعاص بن الربیع

---

[1] ۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۰۸۹) نیز ابن سعد الجزء الاول صفحہ (۴۳)

[2] ۔ کعبہ سے پیوست زمین کا ایک خطہ جو دیوار سے گھرا ہوا ہے اس کو حطیم کہتے ہیں۔

[3] ۔ بخاری پ ۶ کتاب المناسک۔

بن عبدالعزیٰ بن عبدشمس بھی مکہ کے ان معدودے چند لوگوں میں تھے، جو بڑے مالدار، دیانت دار، اور معتبر تاجر تھے۔[1]

ان بڑے لکھ پتی ساہوکاروں، تاجروں کے علاوہ مکہ میں خوش باشوں کا ایک طبقہ تھا جس کی گزر بسر فارغ البالی سے ہو رہی تھی مثلاً عبدالرحمٰن بن عوف جن کا سرمایہ آٹھ ہزار دینار تھا۔ نیز حارث بن عمرو اور امیہ بن خلف بھی ان ہی لوگوں میں تھے اول الذکر نے ایک ہزار اور ثانی الذکر نے دو ہزار صرف بدر کے کاروان میں لگائے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی ان لوگوں میں تھے جو اچھے سرمایہ کے مالک تھے۔ اسی طرح حضرت عباسؓ کا بھی مکہ کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتا تھا۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ وہ تمام مکی یقیناً مالدار ہوں گے جنھوں نے بغیر چون چرا کے بدر کی شکست کے بعد مسلمانوں کو بہت بڑا تاوان جنگ ادا کیا۔ اور پھر بدر کا بدلہ لینے کے لیے پچیس ہزار درہم بلکہ دینار بھی جمع کیے۔ اس سلسلے میں طبقاتِ ابن سعد کی ایک عبارت ملاحظہ ہو، مورخ مذکور لکھتے ہیں کہ "مشرکین جو بدر میں آئے تھے جب مکہ کو لوٹے تو اس قافلہ کو جسے ابوسفیان بن حرب لایا تھا دارالندوہ کے پاس ٹھہرا ہوا پایا۔ سرداران قریش، ابوسفیان کے پاس گئے اور کہا کہ ہم لوگ نہایت خوش ہوں گے اگر تم اس قافلہ کے نفع سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف جانے کے لیے سامان سفر مہیا کرو۔ ابوسفیان نے کہا میں پہلا شخص ہوں جو اسے منظور کرتا ہے اور عبدمناف کی اولاد بھی میرے ساتھ ہے۔ مال فروخت ہو کر سونا جمع ہوا۔ کل ایک ہزار اونٹ تھے اور پچاس ہزار دینار کا مال تھا۔ قافلہ کے مالکوں کو اصل سرمایہ دیدیا گیا اور نفع نکال لیا گیا۔ معمول یہ تھا کہ ایک دینار پر ایک دینار (نفع) لیتے تھے۔[2]

مکہ کے اصلدار اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ دولت سے مزید دولت پیدا کی جاسکتی ہے چنانچہ مورخ طبری نے واقدی کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ "قریش

1۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۳۴۶) ۳ھ کے واقعات۔

2۔ طبقات ابن سعد الجزء الثانی صفحہ (۲۵)

کہنے لگے کہ محمدؐ نے ہماری تجارت بند کر دی ہے وہ ہمارے راستہ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابوسفیان اور صفوان بن امیہ نے کہا کہ اگر ہم اس طرح پڑے رہیں تو اپنا پورا سرمایہ ختم کر دیں گے اس پر زمعہ بن الاسود نے کہا کہ میں تم کو ایک ایسا آدمی بتاتا ہوں کہ وہ تم کو نجد کی ایسی راہ سے لیجائے گا کہ اگر اندھا بھی اس پر گامزن ہو تو وہ بھی راستہ نہ بھٹکے۔ صفوان نے پوچھا وہ کون ہے؟ چونکہ آج کل سردی کا موسم ہے ہمیں پانی کی ضرورت زیادہ نہیں ہے۔ زمعہ نے کہا فرات بن حیان، ابوسفیان اور صفوان نے اسے بلاکر نوکر رکھا۔ یہ سردی کے موسم میں انھیں ذات عرق کی راہ سے غزہ لایا......[1]

زر۔ سکے جیسا کہ گزر چکا قریش تجارت کی غرض سے یمن، شام، عراق، مصر اور حبشہ وغیرہ جایا کرتے تھے۔ لیکن ان تمام علاقوں میں کاروبار کے لیے جو سکے استعمال ہوتے تھے وہ وہی سکے تھے جو ان ملکوں میں مروج تھے۔ یہی سکے مکہ کے بازار میں بھی پہنچتے تھے۔ اسی لیے مکے میں جو سکے لائے جاتے تھے وہ مختلف قسم کے ہوتے تھے مثلاً بیزنطینیوں کے دینار (سونے کے سکے) اور ساسانیوں کے چاندی کے درہم نیز حمیری سکے بھی تھے چنانچہ مورخ بلاذری (المتوفی ۲۷۹ھ) لکھتے ہیں کہ "خرید و فروخت میں عام طور پر رومی دینار کسروی درہم اور کسی قدر حمیریہ (یمن کے سکے) کا چلن تھا[2] جاہلیت میں اہل مکہ کے پاس ہرقل کے دینار بھی آتے تھے۔ اور ایرانیوں کے دراہم بغلیہ بھی۔ عرب ان سکوں سے وزن کے اعتبار سے تول کر خرید و فروخت کرتے تھے[3]

"زمانہ جاہلیت میں درہم کئی طرح کے ہوتے تھے۔ جن میں زیادہ مکرے طبری اور بغلی تھے۔ جو آٹھ اور چار دانگ کے ہوتے تھے[4] بغلی پورے وزن کے ایرانی سکے ہوتے تھے۔ اس لیے قریش اپنی تجارت خارجہ کے معاوضہ میں عراق والوں سے یہی بغلی سکے وصول کرتے تھے۔

۱۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۳۷۴) غزوۃ القردۃ۔ ۲۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۴۶۸) نیز احکام السلطانیہ ماوردی باب ۱۳۔ ۳۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۴۶۷)
۴۔ مقدمہ ابن خلدون فصل ۳۶ منتصاۃ السلطانیہ وعلامتہا۔

"عہد فارس میں تین وزن کے درہم مضروب ہوتے تھے۔ ایک بیس قیراط کا دوسرا بارہ قیراط کا تیسرا دس قیراط کا۔[1]

"یہ سکے عموماً گھسے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ان پر حروف وغیرہ بھی اچھی طرح سے کندہ نہ ہوتے تھے۔ اور وزن میں بھی برابر نہ ہوتے تھے۔ نیز شکل بھی مختلف ہوتی تھی کیونکہ یہ مختلف دارالضربوں سے بن کر نکلتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ صرف تربیت یافتہ صراف ہی ان کی خرابیوں کو پہچان سکتے تھے۔ اور چلن میں جو سکے تھے ان کی معیاری قیمت کا تعین کرتے تھے۔[2] لیکن "اہل فارس کے نظم و نسق بگڑنے سے ان کے سکے بھی کھوٹے ہو گئے تھے مگر کھوٹ نظرانداز ہونے کی وجہ سے معاملات لین دین میں کھرے کے مساوی چلتے تھے۔"[3]

ناقص زر اور کامل زر کو پہچاننے کے علاوہ اور بھی پیچیدگیاں تھیں۔ جو کہ معیار کے اختلاف اور مبادلہ کے اتار چڑھاؤ سے پیدا ہوتی تھیں۔ بیزنطینی صوبہ شام اور مصر "اہل الذہب" کہلاتے تھے۔ یعنی ان ملکوں میں معیار طلاء رائج تھا۔ بابل "اہل الورق" تھا جہاں کہ چاندی کا رواج تھا جو کہ ساسانی معیار تھا۔[4] امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) نے بھی اپنی کتاب "موطا" میں جو حدیث کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے "اہل الذہب" اور "اہل الورق" کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

ان عمر بن الخطابؓ ضرب الجزیة علی اہل الذہب اربعة دنانیر و علی اہل الورق اربعین درہماً[5]	عمر بن الخطابؓ نے معیار طلاء والوں پر چار دینار اور معیار سیمیں پر چالیس درہم جزیہ عاید کیا ......

لیکن "مکہ کے بازار میں سکے زیادہ تعداد میں نہ چلتے تھے اس لیے ان کے پہلو بہ پہلو قیمتی دھاتیں سونے چاندی کے ڈلے، تبر (کچا سونا) اور مٹی میں ملا ہوا سونا بھی

۱۔ احکام السلطانیہ ماوردی باب ۱۳ ص ۔ ۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۳ عنوان "مکہ"
۳۔ احکام السلطانیہ ماوردی باب ۱۳ ص ۔ ۴۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۳ عنوان "مکہ"
۵۔ موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ باب الجزیہ قلمی نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن۔

چلتا تھا۔ صرف ترازو ہی ان کی قیمت کا تعین کر سکتی تھی[۱]

قریشی اوزان اور پیمانے جاہلیت میں قریش مکہ کے ہاں وزن تولنے کے مختلف اوزان بھی تھے۔ "اس وزن کا نام جس سے قریش چاندی تولتے تھے "درہم" تھا۔ اور جس وزن سے سونا تولتے تھے اس کا نام "دینار" تھا ـــــ ان دونوں اوزان میں دس اور سات کی نسبت تھی۔ یعنے دس درہم سات دینار کے مساوی ہوتے تھے ـــــ ان کے ہاں ایک وزن "شعیرہ" تھا۔ اور یہ درہم کا ساٹھواں حصہ تھا۔ ایک وزن اوقیہ (اونس) تھا یہ بیس درہم کے مساوی تھا۔ ایک وزن "نواۃ" تھا یہ پانچ درہم کے مساوی تھا۔ وہ ان ہی اوزان سے تول کر خرید و فروخت کرتے تھے۔ نبی مکرمؐ نے ان اوزان کو اسی طرح برقرار رکھا[۲] نیز "عربوں میں "مثقال" کا ایک وزن تھا۔ جو کسی قدر کسر کے ساتھ بائیس قیراط ہوتا تھا۔ اور دس درہموں کا وزن سات مثقال تھا۔ ایک رطل بارہ اوقیہ کا ہوتا تھا اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا۔ رسول اکرمؐ نے ان اوزان کو برقرار رکھا۔ ابوبکر، عمر، عثمان و علی (رضی اللہ عنہم) نے بھی اپنے اپنے زمانوں میں یہی اوزان برقرار رکھے اور امیر معاویہؓ نے بھی ان اوزان کو برقرار رکھا[۳]

امانتیں لوگ اپنے اندوختوں کی یا تو خود ہی حفاظت کیا کرتے تھے یا کسی معتبر شخص کے پاس بطور امانت رکھوا دیتے تھے مثلاً خود آنحضرتؐ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ "مکہ میں کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ جس کے پاس کوئی قابل حفاظت شئے ہو، اور اس نے اسے رسول اللہؐ کی امانت اور دیانت کی وجہ سے امانۃً آپ کے پاس نہ رکھوا دیا ہو"[۴]

۱۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد (۳) عنوان "مکہ"۔

۲۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۴۶۷) محمد بن سعد بروایت واقدی۔

۳۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۴۶۶)

۴۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۲۳۴) ـــ

رہن جاہلیت کے عربوں میں رہن کا بھی رواج تھا۔ جب کوئی سرمایہ دار کسی کو قرض دیتا تو اس کی کسی چیز کو بطور ضمانت کے اپنے ہاں رکھ لیتا۔[1]

لین دین کے طریقے مکہ کے تاجر طلب و رسد کے اصولوں سے بخوبی واقف تھے قیمتوں کے بڑھانے اور مال کو روک رکھنے میں جو چالبازیاں دغاباز تاجر کرتے رہتے ہیں یہ بھی کرتے رہتے۔ مثلاً مال روک رکھتے جس کو احتکار کہا جاتا تھا تاکہ قیمتوں میں اضافہ ہو، تب مال کی فروخت کی جائے۔ اسی طرح وہ طائف کے کسانوں کو سود پر قرض دیتے اور پوری پیداوار پر قبضہ کر لیتے تاکہ من مانے طریقہ سے فروخت کریں۔ نہ صرف یہی بلکہ ضروریات زندگی غلہ، لکڑی وغیرہ جو کاروانوں کے ذریعہ آتی سرمایہ دار تاجر شہر سے باہر ان کی پیشوائی کو جاتے اور پورے سامان کو خرید لیتے اور شہر میں لا کر من مانے نرخ سے فروخت کرتے۔ تخمین، سٹہ بازی کے طریقوں کو اختیار کرتے اسی طرح وہ مبادلہ کے اور بھی ایسے طریقے اختیار کرتے جس سے گاہک ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

جاہلیت میں بیع و شری کے بعض عجیب و غریب طریقے رائج تھے مثلاً ایک طریقہ بیع "حبل الحبلہ" تھا اور وہ ایک قسم کی بیع تھی۔ جو اہل جاہلیت کیا کرتے تھے ایک شخص اونٹنی اس وعدہ پر مول لیتا تھا کہ جب وہ جنے اور پھر اس کا بچہ جو پیدا ہو وہ جنے (تب میں اس کی قیمت ادا کروں گا)[2] "زمانہ جاہلیت کے لوگ اونٹوں کا گوشت حبل الحبلہ کے وعدہ پر بیچا کرتے تھے۔

نیز ان میں بیع منابذہ، بیع ملامسہ۔ بھی رائج تھی"۔ ...... بیع منابذہ یہ ہے کہ بائع یہ کہتے ہوئے کہ جب میں اس کپڑے کو تیری طرف پھینک دوں تو بیع لازم ہو گئی۔ اور ملامسہ یہ کہ جب ہاتھ سے چھوے تو بیع لازم ہو جائے گی نہ اس کو کھول سکے اور نہ الٹ سکے[3] نیز ان میں بیع محاقلہ و مزابنہ اور جانوروں کو

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر طبری الجزء الثالث آیت: اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ"۔

[2] بخاری کتاب البیوع۔ ص

[3] ابوداؤد کتاب البیوع ص۔

مُصَرّاۃ بنا کر بیچنے کا رواج تھا۔ ان کی تشریح ہم آئندہ مدینہ کے معاشی حالات میں کریں گے۔

جاہلیت کے عربوں کے تجارتی لوازم میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو خریدتا تھا تو بیچنے والے کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارتا یعنی اب یہ بیع لازم ہوگئی اسی وجہ سے اس قسم کی بیع کو بیع صفقہ کہتے تھے[۱] اور صفقہ تالی بجانے کو کہتے ہیں۔ نیز تاجر لوگ ــــ جیسا کہ آج کل بھی ہے ــــ جھوٹی قسم کھا کر خریدار کو یہ باور کراتے کو وہ سچ کہہ رہا ہے۔ اس طرح قسم کھا کر باور کرانے کو ہمیمہ کہا جاتا تھا[۲]

نرخ اشیاء حدیثوں اور تاریخوں کے تفصیلی مطالعہ سے چیزوں کے نرخوں کا بھی کچھ حال معلوم ہوتا ہے اور ان سے بعض نتائج بھی اخذ کیے جاسکتے ہیں مثلاً غلام کی قیمت سے اونٹ کی قیمت زیادہ اور کبھی برابر ہوتی تھی۔

غلام کی قیمت ”حکم بن حزام نے عکاظ کے بازار میں زید بن حارثہ کو حضرت خدیجہؓ کے لیے چار سو درہم میں خریدا تھا۔.......“[۳]

”ابوبکرؓ نے بلال کو پانچ اوقیہ میں خرید کر آزاد کردیا“[۴]

اونٹ کی قیمت برخلاف اس کے قصواء اور ایک دوسری اونٹنی آٹھ سو درہم میں خریدی گئی چنانچہ طبری نے لکھا ہے کہ ”رسول اللہ کی اونٹنی قصواء بنو الحریش کے اونٹوں میں تھی۔ اسے اور اس کے ساتھ ایک دوسری اونٹنی کو ابوبکرؓ نے آٹھ سو درہم میں خریدا تھا۔ رسول اللہؐ نے چار سو درہم میں قصواء کو ابوبکرؓ سے خریدا....... اسی پر سوار ہو کر آپ نے ہجرت فرمائی۔ جب آپ مدینہ آئے یہ چار سال کی تھی“[۵]

۱۔ مناجۃ الطرب فی تقدمات العرب نوفل افندی ص ۔ ۲۔ کتاب المحبر ص ۲۹۵
۳۔ تاریخ طبری ص ۴۔ تاریخ طبری ص ۵۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۷۸۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانوروں کا بیان۔

بکریاں چرانے کی اجرت رسول کریمؐ بھی اُجرت پر اپنے بچپن میں کچھ قیراط[1] پر بکریاں چراتے تھے یہ بیان ہو چکا ہے کہ ہر ایک بکری ایک قیراط پر چرائی جاتی تھی[2]

جہاز کا کرایہ جدہ کی بندرگاہ سے حبشہ پہنچانے کا کرایہ مورخ طبری نے نصف دینار نقل کیا ہے چنانچہ جو مہاجرین جدہ سے حبشہ گئے تھے ان کی بابت لکھا ہے کہ ـــ "دو تجارتی جہاز بندرگاہ آئے، یہ اُن کو نصف دینار پر حبشہ لے گئے"[3]

عرب کے میلے بازار عرب کی تاریخ میں وہاں کے میلوں کو خاص اہمیت ہے ان میلوں کے ذریعے عرب میں ایک معاشی وفاق عملاً قایم ہو گیا تھا۔ تمام سال مختلف مقامات پر بازار ہوا کرتے تھے جس میں تمام عرب کے لوگ جمع ہوتے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ عرب میں دس میلے ہوتے تھے جہاں لوگ اپنی تجارت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ ہر طرح کے لوگ اس میں شریک ہوتے تھے ان بازاروں میں لوگوں کا خون اور ان کا مال محفوظ رہتا تھا[4] دومۃ الجندل میں جو شام و حجاز اور عراق کے مابین ہے یکم ربیع الاول کو میلا لگتا اور مہینہ بھر چلتا تھا۔ پھر برخاست ہو کر آئندہ سال اسی زمانے میں لگتا تھا۔ پھر ہجر میں مشقر کا بازار تھا جو جمادی الاول میں لگتا تھا۔ اور دومۃ الجندل کی طرح یہاں بھی مقامی حکمراں کو عشر یعنے دس فیصدی چنگی دینی پڑتی تھی۔ ایران تک سے تاجر سامان لے کر یہاں آتے۔ اس کے بعد یہاں سے یکم رجب کو چلتے تو عمان کے شہر صحار کو آنے میں بیس دن لگتے اور جو پہلے نہ آسکے ہوں وہ اب آتے اور یہاں پانچ دن تک میلہ لگتا اور یہاں کا عشر بادشاہ جلندی کو ملتا۔

---

[1] ایک قیراط دو رتی کے مساوی تھا۔ [2] بخاری نیز ابن ماجہ ۔ [3] تاریخ طبری صفحہ ۱۱۸۲ نیز ابن سعد جزو اول صفحہ (۱۳۶)۔ [4] تاریخ یعقوبی الجزو الاول صفحہ (۳۱۳) اسواق العرب۔

نوٹ: چند سال پیشتر عرب کے میلے بازاروں پر ایک دلچسپ کتاب "اسواق العرب" کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس کے مصنف سعید الافغانی ہیں مطبوعہ المطبعۃ الہاشمیہ بدمشق ۱۳۵۶ھ م ۱۹۳۷ء۔

"اس کے بعد دبا کا میلہ رجب کے آخر میں لگتا۔ یہ عرب کی دو بندرگاہوں میں سے ایک تھا۔ یہاں سندھ اور ہند اور چین اور مشرق اور مغرب کے لوگ آیا کرتے اور برّی و بحری سامان لاتے، یہاں کا عشر بھی بادشاہ جلندی کو ملتا۔"

"اس کے بعد مہرہ کے مقام شحر میں وسط شعبان میں میلہ لگتا جہاں برّی اور بحری تاجر سب دبا سے چل کر آتے یہاں کھالیں، کپڑے وغیرہ فروخت کیے جاتے۔ اور ایلوہ، لوبان اسی قسم کی مقامی پیداواروں کی خرید و فروخت ہوتی۔ پھر یکم رمضان سے بیس دن تک میلہ لگتا۔ یہاں بڑا اچھا انتظام تھا۔ کسی محافظ دستہ کی یہاں ضرورت نہ رہتی۔ یہاں کا عشر ایرانی نوآبادکار افسر" الابناء" وصول کرتا تھا۔ یہاں سمندری راہ سے لوگ جو دبا اور مہرہ آتے وہ نہ آتے بجز اس کے کہ کسی کے پاس کچھ سامان بچ رہا ہو۔ اور اس سے پہلے کے میلوں میں شرکت کا موقع وغیرہ اسے نہ ملا ہو۔"

"عدن کے بعد یمن میں صنعا کا میلہ تھا۔ جو وسط رمضان سے آخر رمضان تک ہر سال لگتا۔ یہاں روئی، زعفران مختلف قسم کے رنگ لوہے وغیرہ کا سامان بکتا۔ یہاں کا عشر بھی ایران کے نوآبادکار افسر لیتے۔ ان مختلف میلوں میں لوگ وہ سامان خریدتے، جن کی ان کے اپنے ملکوں میں مانگ ہوتی۔ اس کے بعد رابیہ واقع حضرموت اور عکاظ قریب عرفات و مکہ میں بیک وقت وسط ذیقعدہ سے آخر ماہ تک میلہ لگتا۔ کچھ لوگ تو عکاظ آتے اور کچھ لوگ رابیہ جاتے۔ عکاظ ہی کے قریب ذوالمجاز بھی ہے۔ چنانچہ عکاظ کے بعد یکم ذی حجہ سے دس دن تک میلہ لگتا۔ پھر منیٰ میں جو مکہ کے مضافات میں ہے حج کے سلسلے میں میلہ جمتا۔ یہاں سے فارغ ہو کر لوگ خیبر یا یمامہ جاتے جہاں محرم کی دسویں تک میلے لگتے۔[۱]

اس کے بعد جنوبی فلسطین اور اذرعات کے میلے لگتے۔ ان کے علاوہ بدر، حباشہ، مجنہ وغیرہ سینکڑوں مقامی، ہفتہ وار یا دیگر قسم کے ہاٹ بھی لگتے تھے۔ چنانچہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ" ایام جاہلیت میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز میں بازار

---

[۱] کتاب المحبر صفحہ ۲۶۳ نیز الازمنہ والامکنہ للمرزوقی جلد (۲) صفحہ (۱۶۳) اسواق العرب۔
نوٹ: جغرافیہ دان الہمدانی نے صفتہ جزیرۃ العرب میں تقریباً تیس بازاروں کے نام گنائے ہیں۔

تھے۔ ان ایام حج میں برابر خرید و فروخت ہوا کرتی تھی۔۔۔۔[1] اسی طرح مورخ طبری نے لکھا ہے کہ "عرب کے تیرتھ گاہوں میں ایک بدر تھا۔ یہاں سالانہ بازار بھرتا تھا۔"[2] اور ایک جگہ مورخ موصوف لکھتے ہیں کہ "عہد جاہلیت میں بمقام بدر ہر سال آٹھ روز تک بازار لگتا تھا۔"[3]

خفارہ یا محافظ دستہ مکے کے قریشیوں نے ایک فوج قائم کر رکھی تھی جو اور قبیلوں کو محافظ دستوں کا کام دیتی کیونکہ عرب میں قبیلہ داری اور مقامی حکومتیں ہوتی تھیں، اور بعض جگہ نراج کی کیفیت رہتی۔ "سال میں صرف چار مہینے امن رہتا[4] اور لڑائی نہیں ہوتی تھی۔ قریش کے محافظ دستہ کی کیفیت ابن قتیبہ کے استاذ محمد بن حبیب (المتوفی ۲۴۵ھ) کی زبانی درج کی جاتی ہے "جو تاجر بھی یمن یا حجاز سے نکلتا تو وہ اس وقت تک قریشی خفارے یعنے محافظ دستہ کا محتاج رہتا جب تک کہ وہ مضری قبائل کے علاقے میں رہتا کیونکہ ایک مضری قبیلہ دوسرے مضری قبیلے کے تاجروں کو نہ ستاتا۔ مزید برآں مضریوں کی حلیفی جن جن قبائل سے تھی، ان کے ہاں بھی ان کو امن رہتا اور یہ باہمی حفاظت کے اصول پر مبنی تھا چنانچہ قبائل کلب ان کو مضری قبیلہ بنو اسد سے حلیفی کے باعث نہ چھیڑتے اور مضری قبائل کہا کرتے تھے کہ قریش نے ہمارا وہ فرض ادا کر دیا جو حضرت اسمٰعیل سے ہم کو وراثتاً مذہب کی صورت میں ملا ہے جب یہ آگے بڑھ کر عراقی سمت میں جاتے اور بنو امرو بن مرثد سے خفارہ حاصل کر لیتے تو تمام قبائل ربیعہ کے لیے وہ کافی ہوتا تھا۔۔۔۔ "جو تاجر دومۃ الجندل جاتے ان کو بھی قریش ہی سے خفارہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ رابیعہ جو حضرموت میں واقع ہے اگر وہاں جانا ہوتا تو قریش وہاں کے قبیلہ بنو اکل المرار سے خفارہ حاصل کرتے اور باقی لوگ آل مسروق سے لیکن قریشی حلیفی کے باعث اکل المرار نے

---

[1] بخاری پ کتاب البیوع نیز کتاب المناسک نیز تفسیر طبری الجزء الثانی صفحہ (۱۵۰) آیت ہلیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم۔ [2] تاریخ طبری صفحہ ۱۳۰۰ سلسلہ کے واقعات نیز ابن سعد الجزء الثانی صفحہ ۔ [3] تاریخ طبری صفحہ (۱۴۶۰) [4] تاریخ طبری

غلبہ اور حکومت اور سطوت حاصل کرلی اور سب کو زیر کرلیا۔[1]

مالیہ - سردار کی آمدنی قبیلہ کے سردار کی کوئی مستقل آمدنی نہ ہوتی تھی۔ البتہ مال غنیمت میں ایک بڑا حصہ قبیلہ کے سردار کو ملتا تھا، اور ما بقی شرکاء جنگ آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔ چنانچہ جاہلیت کا ایک شاعر عبداللہ ابن غنمہ اپنے سردار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

لكَ المِربَاعُ مِنهَا وَالصَّفَايَا ÷ وَحُكمُكَ وَالنَّشِيطَةُ وَالفُضُولُ

ترجمہ: اے سردار تیرے لیے مال غنیمت کا چوتھائی حصہ منتخب اشیاء اور نشیطہ اور فضول ہے اور تیرا حکم مثل ایک فیصلہ کے ہے۔

"صفی" سے وہ نفیس عمدہ چیز مراد تھی جو سردار اپنے لیے منتخب کر لیتا تھا۔ مثلاً کوئی تلوار یا گھوڑا یا لونڈی[2] اور نشیطہ سے وہ مال مراد تھا جو جنگ سے پہلے شرکاء جنگ کے ہاتھ آتا تھا اور فضول سے وہ کسر مراد ہے جو تقسیم ہو جانے سے رہ جاتی تھی۔

مکہ میں نظام مالیہ قصی بن کلاب ہر سال قریش کے مال سے کچھ حصہ رضامندانہ طور پر وصول کرتے، اور اس رقم کے ذریعہ سے حاجیوں کا انتظام ان کے کھانے پینے رہنے سہنے کا انتظام کرتے تھے۔ اس انتظام کو رفادہ کہتے تھے۔ چنانچہ "رفادہ کا انتظام اس طرح ہوتا تھا کہ ہر سال حج کے زمانہ میں قریش کچھ مال اپنی آمدنی سے نکال کر قصی بن کلاب کو دیتے تھے۔ یہ ان سے حاجیوں کے لیے کھانا پکواتے۔ جو حاجی غیر مستطیع ہوتے یا ان کے پاس زادِ راہ نہ بچا ہوتا وہ اس کھانے سے کھاتے۔ قصی بن کلاب نے یہ چندہ ان پر فرض کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اے قریش! تم اللہ کے ہمسایہ اور اس کے گھر والے ہو۔ حاجی اللہ کے مہمان اور بیت اللہ کے زائر ہیں۔ اس لیے وہ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ عزت کے ساتھ ان کی مہمان داری کی جائے۔ تمہیں چاہیے کہ زمانۂ حج میں ان کے لیے

۱؎ - کتاب المحبر محمد بن حبیب صفحہ (۲۶۳) ۲؎ - کتاب المبسوط شمس الائمہ السرخسی الجزو العاشر صفحہ (۹) کتاب السیر مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۴ھ نیز تاج العروس۔

کھانے اور پینے کا انتظام کردو۔ انھوں نے قصی کا کہنا مانا اور اس کے لیے وہ ہر سال اپنے مال میں سے کچھ حصہ علیحدہ کر کے قصی کو دیتے تھے۔ وہ اس سے منیٰ کے قیام کے دنوں میں حاجیوں کے لیے کھانا پکواتے یہ دستور ان کی قوم میں تمام زمانہ جاہلیت میں برابر قایم رہا اور اس کے بعد عہد اسلام میں بھی جاری رہا۔ چنانچہ آج (زمانۂ طبری) تک جاری ہے۔ اور یہ وہ کھانا ہے جو تمام زمانہ حج میں حکومت وقت حاجیوں کے لیے ہر سال منیٰ میں پکواتی ہے۔[1]

لاوارث مال

قصی بن کلاب کو لاوارث مال کا بھی مستحق تسلیم کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ جو اجنبی مکہ میں لاوارث مر جاتا اس کا مال قصی ہی کو مل جاتا تا۔[2]

محصول درآمد خراج۔ مکس

جو کوئی تاجر مکہ میں آتا تھا اس سے محصول درآمد وصول کیا جاتا تھا چنانچہ ازرقی نے اپنی کتاب اخبار مکہ میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "روم والوں کا ایک جہاز شعیبہ (جدہ) کے ساحل پر ٹوٹ گیا اور قریش نے جہاز کی لکڑی خرید لی اور جہاز والوں کو اجازت دی کہ مکہ میں داخل ہوں اور اپنے مال ومتاع کو فروخت کریں اور یہ کہ ان سے کوئی محصول نہ لیا جائے گا۔ راوی کا بیان ہے کہ رومی (بیزنطینی) تاجروں سے جب کہ وہ مکہ میں داخل ہوتے تو مکہ والے محصول وصول کرتے تھے جیسا کہ روم والے ہر اس شخص سے جو ان کے شہروں میں داخل ہوتا تھا محصول وصول کرتے تھے۔"[3]

"کہتے ہیں کہ مکہ میں زمانہ ماقبل تاریخ کے عمالقہ بھی عشر لیا کرتے تھے جرہم اور قطورا کے دو قبیلوں نے مکہ میں مشترکہ یا وفاقی حکومت قائم کی تھی۔

۱۔ تاریخ طبری صفحہ (۱۰۹۹) نیز سیرت ابن ہشام نیز ازرقی اخبار مکہ صفحہ ۱۴۴ اطعام اہل الجاہلیۃ۔ ۲۔ ڈاکٹر حمید اللہ: عہد نبوی میں نظام حکمرانی جلد ۱ صفحہ (۷۰) مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی بحوالہ انساب الاشراف تالیف بلاذری۔ ۳۔ ازرقی اخبار مکہ صفحہ (۱۰۷)۔

انھوں نے شہر کے دو حصے کر کے آپس میں بانٹ لیے تھے۔ اور جس حصے سے جو تاجر آتا اس کا عشر اسی حصے والے قبیلے کو حاصل ہوتا تھا۔ "قصی کے زمانے میں اس تقسیم کی ضرورت نہ تھی اور پورے شہر کا وہ سردار تھا۔ ظاہر ہے کہ خود شہر مکہ کے باشندے محصول درآمد سے مستثنٰی تھے۔"

"محصول درآمد لینے کا یہ رواج عام طور پر عرب کے دوسرے شہروں میں بھی نظر آتا ہے اور وہ عموماً سامان کی مالیت کا دسواں حصہ ۱/۱۰ ہوا کرتا تھا"[۱]

عرب میں ہر سال جو میلے لگتے تھے ان میں ہر وہ سردار جس کی عملداری میں وہ میلے کا مقام ہوتا محصول وصول کرتا چنانچہ قبیلۂ ہوازن کا یہ دستور تھا کہ عکاظ کے میلہ میں ہر سال وہ زہیر بن حذیمہ کو آتا وہ (خراج۔ محصول) دیا کرتے تھے۔[۲]

بازار تحصیلی کی رسم جاہلیت میں بھی تھی چنانچہ سودا فروخت کرنے والے جو آیا کرتے تھے ان پر بطور محصول کے چند درہم مقرر کیے جاتے تھے جو انھیں دینے پڑتے تھے۔ ان کی زبان میں اس ٹیکس کو مکس کہتے تھے[۳] حدیث کی کتابوں میں بھی مکس کا تذکرہ پایا جاتا ہے یہ عموماً مال کا ۱/۱۰ ہوتا تھا۔[۴]

اوپر ہم نے بیان کیا ہے کہ شہری مملکت مکہ میں قصی بن کلاب لوگوں سے رضاکارانہ طور پر محصول وصول کرتے تھے۔ آج بھی "بعض حضرات کے خیال میں ٹیکس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ خود ہی اپنی مرضی کے مطابق محصول ادا کرے۔ گو یہ محض خیالی اور ناقابل عمل تجویز ہے تاہم زمانۂ گزشتہ میں کم و بیش اسی قسم کا ایک طریقہ متعدد چھوٹی چھوٹی شہری مملکتوں میں مروج تھا۔ ھامبرگ، زورج اور بال کی مملکتیں ایک زمانہ میں اپنی

۱۔ مزید تفصیل اور حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو عہد نبوی میں نظام حکمرانی از ڈاکٹر حمید اللہ صفحہ ۷۵ جامعہ ملیہ دہلی۔ ۲۔ کامل ابن الاثیر الجزء الاول صفحہ (۲۰۱) ذکر قتل زہیر۔
۳۔ صناجة العرب فی تقدمات العرب نوفل افندی فصل ۴ باب ۔ ۴۔ تفصیل کے لیے کتاب المحبر صفحہ (۲۶۵) اسواق العرب ملاحظہ ہو۔

آمدنی کا کثیر ترین حصہ رعایا کی ذاتی امداد سے جو برضا و رغبت دی جاتی تھی حاصل کرتی تھیں۔ اس طریقے کی کامیابی کا مدار اس بات پر ہے کہ لوگ جمہوری طریقہ حکومت کی محبت میں سرشار ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک نہایت قابل تعریف صفت ہے۔ لیکن وہ بہت محدود رقبہ میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اور اس کی نوعیت قومی نہیں بلکہ شہری ہے۔ اب بھی وقتاً فوقتاً اس طریقہ کی حمایت کی جاتی ہے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ وہ حکومت کی آمدنی کا ایک بہت ہی مشتبہ ذریعہ ہوگا۔ اور زمانۂ موجودہ کی حکومتوں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی صورت میں جو موازنہ بنایا جائیگا وہ ایک نہایت ناقابل اعتبار موازنہ ہوگا۔[1]

تیسری فصل: مدینہ

ایام جاہلیت میں مدینہ کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور معاشی حالت

آبادی "جس وقت کہ رسول اللہؐ مدینہ منورہ تشریف فرما ہوئے، اُس وقت وہاں ہر طرح کے لوگ ملے جلے رہتے تھے۔ بعض ان میں مسلمان تھے بعض مشرکین تھے، جو بتوں کو پوجتے تھے اور کچھ یہودی تھے، جو آنحضرتؐ اور آپؐ کے اصحاب کو بہت ستاتے تھے"[2]

ابتدائی قدیم ایام میں یہاں یثرب[3] نامی ایک آبادی تھی جس میں چند محلے اور بازار وغیرہ تھے۔ بنی اسرائیل کے چند یہودی قبائل اس میں بستے تھے۔ بنو قریظہ بنو نضیر، بنو قینقاع، بنو ماسلہ اور زعورا وغیرہ ان یہودی قبائل کے نام تھے۔[4]

---

[1] اصول وطریق محصول۔ آر میلیچ اسمتھ دوسری فصل صفحہ (۲۴) [2] ابو داؤد کتاب الخراج والامارۃ بروایت کعب بن مالک انصاری [3] جو اب بھی مدینے کے ایک مضافاتی محلہ کا نام ہے۔

[4] کامل ابن الاثیر الجزری الجزء الاول صفحہ (۲۴۰) ایام الانصار۔

بعد میں اوس اور خزرج کے قبائل یمن سے نکل کر مدینے میں آ بسے۔ اوس و خزرج کا قصہ یہ ہے کہ یہ دونوں قبیلے درحقیقت یمن کے قبیلہ بنو ازد کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے "یمن کا شہر مارب بنو ازد کا وطن تھا جو اپنے مشہور سد (کٹہ یا بند) کی وجہ سے خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے) کہتے ہیں کہ کاہنوں نے عمرو بن عامر مزیقیا جو وہاں کا سردار تھا خبر دی کہ ایک بڑا سیلاب آنے والا ہے جس میں مآرب کا سد ٹوٹ جائے گا جس کی وجہ سے بڑی تباہی پھیلے گی۔ باشندے غرق آب ہو جائیں گے، آبادیاں اجڑ جائیں گی۔ عمرو بن عامر کو کاہنوں کی زبانی جب یہ پیشین گوئی معلوم ہوئی تو سننے کے ساتھ ہی عمرو بن عامر مال و اسباب اور اراضی کھیت وغیرہ کو فروخت کر دیا اور اپنے پیرودں کو ساتھ لے کر مآرب سے چل پڑا۔ پھر تو لوگ جگہ جگہ ملکوں میں متفرق ہو گئے۔ ہر ایک بطن (قبیلہ کی شاخ) نے ایک ایک طرف کا ملک پسند کر لیا۔ اور وہاں رہنے لگے۔ خزاعہ حجاز میں رہے۔ غسان شام میں جا بسے۔ ثعلبہ بن عمرو بن عامر اپنے لوگوں کو لیے ہوئے مدینہ سے گزرا جسے اس وقت یثرب کہتے تھے اور وہاں اوس اور خزرج حارثہ بن عمرو بن عامر کے دونوں بیٹے اپنے ساتھیوں کو لے کر رہ گئے[1]"

"انصار اوس اور خزرج ہی کے دو قبیلوں کا لقب ہے۔ ان کا لقب انصار (مدد دینے والے) اس لیے ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مہاجرین اصحاب کی انھوں نے ہجرت مدینہ کے بعد نصرت و مدد کی تھی[2]" ان انصاریوں کے مختلف گھرانے تھے مثلاً بنی نجار۔ بنی عبدالاشہل اور بنی حارث اور بنی ساعدہ وغیرہ چنانچہ بخاری اور مسلم وغیرہ کی ایک حدیث میں ان مختلف خاندانوں کا تذکرہ ملتا ہے مثلاً ابو اسیدؓ کہتے ہیں انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ "انصار کے گھروں میں سب سے بہتر گھرانے بنو نجار، بنو عبدالاشہل، بنو حارث اور بنو ساعدہ کے ہیں[3]"

---

[1] کامل ابن اثیر ایام الانصار صفحہ ۲۴۰ [2] تاریخ کامل ابن اثیر: اوس وخزرج۔ [3] بخاری پ ۱۵ مناقب الانصار و مسلم الجزء سادس

مذہبی حالت مشرف بہ اسلام ہونے سے پیشتر اوس اور خزرج عموماً مشرک بت پرست تھے[۱] البتہ یمن سے اوس اور خزرج کے یہ قبیلے جب یہاں شروع شروع میں پہنچے تھے تو ان میں بعضوں نے یہودی مذہب بھی اس لیے اختیار کر لیا تھا کہ قرب وجوار میں ان کے پڑوسی خیبر کے یہودی قریظہ اور بنو النضیر رہتے بستے تھے[۲]

سیاسی حالت جیسا کہ بیان ہوا ابتدائے یثرب میں چند یہودی قبائل آباد تھے بعد میں اوس خزرج بھی یہاں آ بسے لیکن عرصے تک سیاسی اقتدار اور حکومت یہودیوں کے قبضہ میں تھی۔ ان یہودیوں نے وہاں گڑھیاں تعمیر کیں تھیں اور بدامنی کے وقت ان میں پناہ لیتے تھے۔ جب اوس وخزرج یہاں آئے تو انھوں نے بھی اپنے گھروں کے سوا گڑھیاں بنائیں[۳]

فطیون نامی یہودی بادشاہ اوس وخزرج پر اور خود اپنے یہودیوں پر بھی بڑا ظلم ڈھایا کرتا تھا۔ بعد میں خزرج کے ایک نوجوان نے اپنی بہن کے انتقام میں اس کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد اوس اور خزرج کا مدینہ پر سیاسی اقتدار قایم ہو گیا۔ نخلستان اور گھروں میں وہ یہودیوں کے برابر کے شریک ہو گئے[۴]

"پھر انصار ایک مدت تک باہمی اتحاد واتفاق سے رہے۔ لیکن پھر آپس میں ہی نااتفاقی ہو گئی"[۵]

یہودی جو ان کے علاقوں میں آباد تھے وہ اہل کتاب اور تعلیم یافتہ تھے اور اوس وخزرج مشرک بت پرست تھے اور یہودیوں نے ان کے علاقوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ جب ان میں کوئی جھگڑا پیدا ہوتا تو یہودی ان سے کہتے کہ ٹھہر جاؤ۔ بہت جلد ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ اس کا زمانہ قریب

۱۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۲۱ ۲۔ تاریخ یعقوبی الجزء الاول صفحہ (۲۹۹) ادیان العرب۔
۳۔ کامل ابن الاثیر الجزء الاول صفحہ (۲۴۰) ایام الانصار۔ ۴۔ کامل ابن الاثیر الجزء الاول صفحہ (۲۴۱) ذکر غلبۃ الانصار علی المدینۃ ۵۔ کامل ابن الاثیر الجزء الاول صفحہ (۲۴۱) حرب سمیر۔

آگیا ہے۔ ہم اس کے ساتھ ہو کر تمھارا اسی طرح قلع قمع کر دیں گے جس طرح کہ عادؔ اور ارمؔ ملیا میٹ ہو گئے ہیں[1]

ہجرت نبوی کے وقت مدینہ کی سیاسی حالت

رسول کریمؐ کی ہجرت کے وقت مدینہ میں بالکل نراج کی کیفیت تھی چنانچہ "جس وقت کہ رسول خداؐ (مدینہ میں) تشریف لائے تو ان (انصار) کی جماعتیں مختلف تھیں اور ان کے سردار قتل ہو چکے تھے"[2] البتہ یہودی قبائل میں ہر ہر قبیلہ کا ایک ایک سردار تھا چنانچہ "سلام بن مشکم اس عہد میں بنو النضیر کا رئیس اور ان کا خزانچی تھا"[3] ان ہی بنو النضیر میں عروۃ الصعالیک بن الورد العبسی بھی تھا جو عمرو بن عوف کا حلیف تھا۔ یہ شخص بہت اچھا شاعر تھا۔ اس نے ایک طویل قصیدہ میں کہا ہے ؎

دَعِيْنِي لِلْغِنٰى اَسْعٰى، فَاِنِّي ۞ رَاَيْتُ النَّاسَ شَرُّهُمُ الْفَقِيْرُ[4]

ترجمہ:۔ اے میری معشوقہ! مجھے جانے دے کہ دولت حاصل کر دوں، کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ سب سے بُرے انسان وہی ہیں جو فقیر اور محتاج ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

یہودی اس بات کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے کہ عبداللہ بن اُبی ابن السلول کو یثرب کا بادشاہ بنا دیا جائے چنانچہ "اس شہر کے لوگوں نے اس امر کا اتفاق کر لیا کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کے سر پر اپنا تاج رکھیں اور اسے اپنا والی اور رئیس بنائیں[5]" اور بقول مورخ طبری تصفیہ ہو چکا تھا، اور اب "اس کی

---

[1] ۔ تاریخ طبری بروایت ابن اسحاق صفحہ ۱۲۱ نیز بلاذری نیز ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۱۸۰۔

[2] بخاری پ ۱۵ مناقب الانصار، نیز بخاری پ ۱۵ قسامت بخاری پ ۱۵ ہجرت۔ [3] تاریخ طبری صفحہ ۱۳۶۵ غزوہ السویق [4] التنبیہ الاشراف صفحہ ۲۲ مطبوعہ لیڈن: غزوۃ بنو نضیر عیون الاخبار ابن قتیبۃ الدینوری میں بجائے "دعینی" کے "ذرینی" لکھا ہے (الجزء الثالث صفحہ ۲۴۲ مطبوعہ قاہرہ)

[5] ۔ بخاری پ ۱۵ آیت: ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم نیز بخاری پ ۲۴ کتاب الاستیذان نیز بخاری پ ۲۵ کتاب الادب۔

تو م اس کے لیے گھونگوں کا تاج بنا رہی تھی[۱]

معاشرتی حالت

معاشرہ میں اونچ نیچ:۔ رسول کریم کی مدینہ میں تشریف آوری کے وقت مکہ کے مثل یہاں کے معاشرہ میں بھی اونچ نیچ تھی چنانچہ "سہل بن سعد بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا کے پاس سے ایک شخص گزرا آپ نے اپنے پاس والے شخص سے پوچھا کہ یہ شخص کیسا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ ذی عزت لوگوں میں سے ہے۔ واللہ یہ اس قابل ہے کہ اگر کسی کے پاس پیغام نکاح بھیجے تو قبول کر لیا جائے۔ اگر کسی کی سفارش کرے تو سفارش مان لی جائے۔ رسول خدا یہ سن کر چپ ہو رہے۔ پھر ایک اور شخص گزرا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا۔ یا رسول اللہ! یہ مسلمان فقیر لوگوں میں سے ہے، اور یہ اس قابل ہے کہ اگر کسی کو پیغام بھیجے تو قبول نہ کیا جائے۔ اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش نہ مانی جائے اور اگر کوئی بات کہے تو بات نہ سنی جائے۔ آپ نے فرمایا یہ شخص ساری دنیا کے امیروں سے بہتر ہے[۲]۔

معاشرہ میں اونچ نیچ کے سوا مدینہ والوں کے پاس بھی مکہ والوں کے مثل باندی غلام تھے۔ مزید بحث باب دوم میں پیش ہوگی۔

عورت کی حیثیت

مدینہ کے قدیم جاہلی معاشرہ میں عورتوں کی حیثیت بہت پست تھی، اور وہ مثل مال منقولہ کے سمجھی جاتی تھیں۔ "زمانہ جاہلیت میں مدینہ والوں میں سے جب کوئی مرجاتا تو متوفی کا کوئی رشتہ دار اس کی بیوی پر ایک کپڑا ڈال دیتا اور اس کا وارث ہو جاتا اور اس سے نکاح کر لیتا۔ اگر خود یا کوئی دوسرا اس سے نکاح نہ کرتا تو اس کو اپنے پاس روک لیتا۔ یہاں تک کہ وہ جان چھڑائی کے لیے اس کو کچھ فدیہ دیدیتی[۳]" میراث مدینہ کی کچھ مزید تفصیل ہم نے تقسیم دولت کے باب میں کی ہے۔

۱۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۵۱۳ غزوۂ بنی المصطلق نیز سیرت ابن ہشام ص ۷۲۷

۲۔ بخاری پ۲ کتاب الرقاق نیز بخاری پ۲۱ کتاب النکاح۔ ۳۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ (۱۹۳) آیت: یا ایہا الذین آمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھاً۔

تعلیمی حالت اسلام سے قبل "اوس وخزرج میں ایسے افراد بہت کم تھے جنھیں لکھنا آتا ہو۔ یہودیوں میں سے کسی نے انھیں کتابت سکھائی اسلام سے قبل اہل مدینہ کے بچے یہ فن سیکھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اوس وخزرج میں متعدد لکھنے والے موجود تھے۔ سعد بن عبادہ، اُبی بن کعب زید بن ثابت عسربی اور عبرانی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے"[1]

جو لوگ لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ تیر اندازی، پیراکی جانتے تھے انھیں کامل کہا جاتا تھا چنانچہ سعد بن عبادہ، اسید بن حضیر اور عبداللہ بن ابی اور اوس بن خولی کامل تھے یعنے کتابت کے ساتھ تیر اندازی اور شناوری بھی جانتے تھے۔ اہل یثرب میں جن لوگوں نے جاہلیت میں یہ تینوں چیزیں جمع کیں وہ سوید بن صامت اور حضیر الکتائب تھے"[2]

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم بالغان اور عام تعلیم کا جو انتظام کیا اُسے ہم نے "پیدائش دولت" کے باب میں کارکردگی کے تحت بیان کیا ہے۔

معاشی حالت

مدینہ، کسانوں کی بستی مدینہ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ خاص طور پر کسانوں کا شہر تھا۔ جب مکہ کے مہاجرین مدینہ آئے تو انھوں نے اپنے تجارتی کاروبار ہی جاری رکھے اور انصار زراعت ہی میں مشغول رہے چنانچہ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ "میرے بھائی مہاجرین بازاروں کے اندر خرید وفروخت میں مشغول رہتے تھے۔ اور میرے بھائی انصار اپنی کھیتی اور باغات کے کاموں میں مصروف رہتے تھے"[3]

مدنی بڑے اچھے کاشتکار تھے اور زیرگی[I] وغیرہ سے بھی واقف تھے۔

---

[1] - فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۴۷۴ خط کی ابتداء

[2] - فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۴۷۴ — [3] بخاری پ ۹ کتاب المزارعۃ

[I] - زیرگی = زرگل چھڑکنا، زردانہ پہنچانا (پالینیشن) اصطلاح نباتیات

چنانچہ رافع بن خدیجؓ انصاری کہتے ہیں کہ "جس وقت رسول اکرمؐ مدینہ تشریف لے آئے تو اس زمانہ میں لوگ کھجور پر زیرگی کیا کرتے تھے[1]"

مدینہ کے یہودی بھی علاوہ تجارتی کاروبار کے صنعت وحرفت میں بھی مشغول رہتے تھے۔

لگان ادا کرنے کے طریقے مدینے میں لگان ادا کرنے کے جو طریقے رائج تھے، اس کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں کتاب المزارعت کے تحت ملتی ہے۔ محدثین نے عموماً اور امام بخاری نے خصوصاً حضرت رافع بن خدیجؓ کی ہی روایتیں درج کی ہیں کیونکہ مدینہ میں لگان ادا کرنے کے جو طریقے رائج تھے اس کے یہی ماہر سمجھے جاتے تھے۔ وجہ یہ کہ جیسا کہ خود ان ہی کا بیان تھا "سب سے زیادہ کھیتی مدینہ میں ان ہی کے ہاں ہوتی تھی[2]"

طلوع اسلام کے وقت مدینہ میں لگان ادا کرنے کے تین چار طریقے رائج تھے۔

(۱) پہلا طریقہ تو یہ تھا کہ زمیندار سے کاشتکار کچھ زمین حاصل کرتا اور لگان کے معاوضے میں زمیندار کی کچھ زمین پر بھی خود ہی محنت کرتا اور دیگر قطعہ پر جو کچھ اُگتا وہ زمیندار حاصل کرتا چنانچہ "رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ "ہمارے ہاں تمام مدینہ والوں سے زیادہ کھیتی ہوتی تھی اور ہم میں سے کوئی شخص اپنی زمین کرایہ پر دیدیتا تھا اور کہہ دیتا تھا کہ یہ ٹکڑا زمین کا میرا ہے اور یہ تیرا ہے۔ پس کبھی تو اس ٹکڑے میں پیداوار ہوتی تھی اور کبھی اس میں۔ لہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا[3]"

(۲) کبھی خشکی کا حصہ کاشتکار کے لیے مختص ہوتا اور تری کی کاشت زمیندار کو ملتی چنانچہ "رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ لوگ نبی کریمؐ کے زمانے میں نہر کے کناروں اور نالیوں کے سروں پر جو پیداوار ہوتی ہے اس کے بدل میں

---

[1] مسلم الجزء السادس۔ [2] بخاری پ ۹ کتاب المزارعۃ

[3] بخاری پ ۹ کتاب المزارعۃ۔

اور کبھی دیگر حصۂ پیداوار کے معاوضہ میں زمین کو لگان پر چلاتے تھے۔ بعض وقت ایک چیز تلف ہو جاتی اور دوسری بچ جاتی اور کبھی یہ تلف ہو جاتی اور وہ بچ جاتی پھر بعضوں کو کچھ لگان نہ ملتا مگر وہی جو بچ رہتا۔ اس لیے آنحضرتؐ نے اس سے منع فرمایا لیکن اگر لگان میں کوئی شئے معین ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے[1]

(۳) تیسرا طریقہ یہ تھا کہ پیداوار کا کچھ معین حصہ زمیندار لے لیتا تھا اور مابقی کاشتکار کے حصے میں آتا تھا چنانچہ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ لوگ تہائی۔ چوتھائی اور نصف (پیداوار) پر زراعت کیا کرتے تھے ....[2]

(۴) کاشتکار کبھی تو لگان میں پیداوار کا کچھ حصہ ادا کرتا اور کبھی زمین کے معاوضہ میں دوسری قسم کی پیداوار مثلاً کھجور وغیرہ اپنے گھر سے ادا کر دیتا چنانچہ "رافع بن خدیج بن رافع اپنے چچا حضرت زہیر سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا اور فرمایا کہ تم اپنے کھیتوں کو کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا ہم ان کو چوتھائی پیداوار پر اور کبھی کھجور کے چند وسق کے بدلے لگان پر دیدیتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو........[3]"

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ زر یا سونا چاندی لگان میں ادا کرنے کا طریقہ اس وقت مدینہ میں رائج نہ تھا چنانچہ "حضرت رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ تمام اہل مدینہ سے زیادہ کھیتی ہمارے ہاں ہوتی تھی۔ ہم کھیت لگان پر لیا کرتے تھے۔ لگان کے طور پر اس کھیت کا ایک خاص جز مالک زمین کے لیے نامزد کر دیا جاتا تھا تاکہ جو کچھ اس میں پیداوار ہو اس کو وہ اپنے لگان میں لے لے۔ صورت یہ کہ کبھی اس حصہ میں کوئی آفت آجاتی تھی اور باقی کھیت سالم رہتا اور کبھی باقی پر کوئی آفت آجاتی تھی اور وہ حصہ سالم رہتا تھا۔ بہرحال سونا چاندی لگان میں ادا کرنے کا اس وقت رواج نہ تھا[4]" مزید تفصیل ہم نے تقسیم دولت کے باب میں لگان کے تحت بیان کی ہے۔

---

[1] مسلم الجزء الرابع کتاب البیوع۔ [2] بخاری پ ۹ کتاب المزارعۃ۔
[3] بخاری پ ۹ کتاب المزارعۃ۔
[4] بخاری پ ۹ کتاب المزارعۃ۔

مدینہ کی زرعی اراضی علاوہ بارش اور کنوؤں کے نہروں سے بھی سینچی جاتی تھی۔ حدیث کی کتابوں میں جا بجا اس کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔[1]

زرعی پیداوار

مدینہ اور اس کے قرب و جوار میں علاوہ نخلستان کے جو اور گیہوں کی کاشت ہوتی تھی۔ سوارقیہ کے متعلق جو مدینہ کی نواحی کا علاقہ تھا جغرافیہ داں یاقوت (المتوفی ۶۲۶ھ) نے لکھا ہے کہ وہاں "بہت سے کھیت تھے اور نخلستان اور باغات تھے۔ جن میں موز۔ انجیر۔ انگور۔ انار۔ بہی (سفرجل) اور شفتالو (خوخ) ہوتے تھے"۔[2]

صنعت و حرفت

مدینہ میں بعض صنعتیں مثلاً پارچہ بافی، تلوار سازی، چوبینہ کے سامان وغیرہ کی صنعتیں چھوٹے پیمانہ پر جاری تھیں سہل بن سعد کہتے ہیں "ایک عورت ایک حاشیہ دار چادر لے آئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے یہ چادر اپنے ہاتھ سے بُنی ہے......"[3]

حضرت سہل بیان کرتے ہیں کہ ایک دن "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین میں سے کسی کے پاس یہ کہلا بھیجا کہ تم اپنے غلام سے یہ کہہ دو کہ وہ ہمارے لیے منبر کے تختے بنا دے۔ اس نے غلام سے کہہ دیا چنانچہ وہ گیا اور اس نے جھاؤ کے (درخت کو) کاٹا، اور آپؐ کے لیے منبر بنا دیا......"[4]

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ "ایک انصاری عورت نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! کیا میں آپ کے لیے کوئی ایسی چیز بنوا دوں جس پر آپ بیٹھا کریں۔؟ کیونکہ میرا ایک غلام بڑھئی ہے۔ آپ نے فرمایا جیسا تمہارا جی چاہے"۔[5]

۱۔ تفصیل کے لیے بخاری پ۹ کتاب المساقاۃ (آبپاشی) نیز قرآن کی آیت: فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم کی تفسیر۔ بخاری کا باب کتاب تفسیر القرآن اور نیز تفسیر طبری الجزء الخامس آیت مذکورہ میں ملاحظہ ہو ۲۔ معجم البلدان یاقوت الجزء الخامس صفحہ (۱۶۴) مطبوعہ مصر ۳۔ بخاری پ۸ کتاب البیوع۔ ۴۔ بخاری کتاب کتاب الھبۃ نیز بخاری پ۸ کتاب البیوع نیز بخاری پ۱ کتاب الصلوٰۃ۔ ۵۔ بخاری پ۸ کتاب البیوع۔

شراب سازی مدینہ میں مختلف قسم کی شراب بھی بنائی جاتی تھی۔ اور "شراب پانچ چیزوں سے بنتی تھی انگور۔ کھجور۔ گیہوں۔ جَو اور شہد"[1]

لیکن جس وقت شراب حرام کی گئی مدینہ میں انگور کی شراب کے سوا اور کوئی شراب تیار نہ ہوتی تھی[2]۔ عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ آیت (انما الخمر والمیسر) حرمت شراب کی جس وقت مدینہ میں نازل ہوئی اس دن پانچ قسم کی شرابیں بستی میں موجود تھیں، جن میں انگوری شراب شامل تھی[3]

مدینہ میں عموماً کھجور کی شراب خاصی مقدار میں بنتی تھی جس کو فضیخ کہتے تھے چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ "جس زمانہ میں شراب حرام کی گئی وہ کچی پکی کھجوروں کی بنتی تھی[4]۔ حضرت انسؓ ہی کہتے ہیں کہ "میں ایک قبیلے کے پاس ٹھہرا ہوا اپنے چچاؤں کو کچی پکی کھجوروں کی شراب پلا رہا تھا اور میں سب سے چھوٹا تھا (یکایک یہ خبر آئی) کہ شراب حرام ہوگئی ہے۔ مجھ سے انھوں نے کہا کہ اس شراب کو پھینکدو، چنانچہ میں نے پھینک دی۔ (راوی) کہتے ہیں میں نے انسؓ سے دریافت کیا کہ شراب کس چیز سے بنی تھی؟ آپ نے فرمایا کچی پکی کھجوروں سے۔۔۔۔۔[5]۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت ہم پر شراب حرام کی گئی مدینہ میں انگور کی شراب کم ملتی تھی اور اکثر شرابیں کچی پکی کھجوروں کی ہوتی تھیں[6]"

مدینہ میں بہت بڑے پیمانہ پر اور بڑی مقدار میں کھجور کی شراب کشید کی جاتی ہوگی جب ہی تو حرمت شراب کے حکم پر مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی تھی جیسا کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ "میں ابوطلحہؓ کے گھر میں تھا۔ اس زمانہ میں لوگوں کے

---

[1] ۔ بخاری پ۱۸ تفسیر الفرقان۔ آیت: انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس۔ [2] ۔ بخاری پ۲۳ کتاب الاشربۃ۔

[3] ۔ بخاری کتاب تفسیر الفرقان آیت: انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس۔ [4] ۔ بخاری پ۲۳ کتاب الاشربۃ [5] ۔ بخاری پ۲۳ کتاب الاشربۃ

[6] ۔ بخاری پ۲۳ کتاب الاشربۃ ۔

پاس شراب فضیح تھی ۔ پس رسول کریمؐ نے ایک منادی کو حکم دیا کہ وہ اس بات کا اعلان کر دے کہ شراب حرام کر دی گئی تو مجھ سے ابو طلحہؓ نے کہا کہ جاؤ اس شراب کو پھینک دو چنانچہ میں نے باہر نکل کر اس کو پھینک دیا ۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (اس دن) مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی تھی[1]۔

تجارت مدینہ

مدینہ میں قینقاع نامی ایک بازار تھا جس میں خرید فروخت ہوتی تھی چنانچہ عبدالرحمن بن عوف نے جو ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے سعد بن ربیع انصاری سے پوچھا کہ "تمھارا بازار کہاں ہے؟ انھوں نے ان کو قینقاع (نامی) بازار بتا دیا ۔ پس جب وہ (بازار سے) لوٹے تو ان کے ہمراہ کچھ پنیر اور گھی تھا ....[2] "عبدالرحمن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ مدینہ میں آئے تو میں نے پوچھا کہ کیا یہاں کوئی بازار ہے جس میں تجارت ہوتی ہو؟ لوگوں نے کہا ہاں! قینقاع (نامی) بازار ہے[3]"

"آپ (نبی کریمؐ) بنو قینقاع کے بازار میں تشریف لے گئے[4]"

تجارت میں یہودیوں کا دخل

احادیث کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مدینہ کی بہت بڑی تجارت یہودیوں کے ہاتھ میں تھی حتیٰ کہ نبی کریمؐ کو بھی ضرورۃً ایک دفعہ ان ہی کے پاس اپنی ذرہ کو بطور رہن رکھوانا پڑا تھا۔

یہودی نہ صرف مدینہ کی تجارت، ساہوکارہ وغیرہ پر چھائے ہوئے تھے بلکہ بعض یہودیوں کی تجارت تو پورے صوبہ حجاز پر پھیلی ہوئی تھی ۔ ابو رافع یہودی مدینہ کے ایک تاجر کو پورے حجاز کے تاجر کا لقب دیا گیا تھا چنانچہ اس کے انتقال پر "موت کی خبر سنانے والا قلعہ کی دیوار پر کھڑے ہو کر کہنے لگا کہ میں ابو رافع تاجر اہل حجاز کے مرنے کی خبر سناتا ہوں[5]" ...... یہاں تک کہ میں (عبداللہ بن

---

[1] ۔ بخاری پ ۹ کتاب المظالم والقصاص نیز بخاری پ ۱۸ کتاب تفسیر الفرقان آیت: لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصالحات جناح فیما طعموا [2] بخاری پ ۸ کتاب البیوع [3] ۔ بخاری پ ۸ کتاب البیوع ۔ [4] ۔ بخاری پ ۸ کتاب البیوع [5] بخاری پ ۱۶ کتاب المغازی نیز تاریخ طبری صفحہ ۱۳۷۰ سنہ ۳ کے واقعات ۔

عتیک انصاریؓ) نے ابورافع تاجر اہل حجاز کے رونے والوں کی آواز سن لی۔[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کی پیداوار وہاں کی آبادی کے تناسب سے بالکل ناکافی تھی جیسا کہ خود حضرت عائشہؓ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ "جس وقت خیبر فتح ہوا تو ہم نے کہا کہ اب ہم پیٹ بھر کر کھائیں گے"[2] نیز ابن عمرؓ کہتے ہیں "ہم نے فتح خیبر سے پہلے پیٹ بھر کر نہیں کھایا"[3]

چونکہ پیداوار ناکافی تھی اس لیے غلہ باہر سے آیا کرتا تھا جیسا کہ ابن عمرؓ ہی کے بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ قافلہ والوں سے غلہ مول لیتے تھے[4]......"

• قافلے عموماً شام سے ہی آیا کرتے تھے کیونکہ یہ قریبی علاقہ تھا۔ چنانچہ کعب بن مالک غزوہ تبوک کے زمانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ایک دن میں مدینہ کے بازار میں چل رہا تھا ناگاہ شام کے نبطی جو مدینہ میں غلہ لاکر فروخت کرتے تھے ان کا ایک شخص آیا اور کہنے لگا کون میری (کعب بن مالک کی) طرف رہبری کرتا ہے، تو لوگ میری طرف اشارہ کرنے لگے۔ پھر وہ شخص میرے پاس آیا اور شاہ غسان کے ہاں سے ایک خط لے آیا اور میں پڑھا لکھا تھا پس میں نے اس کو پڑھا[5]......"

مبادلے کے طریقے مدینہ ایک زرعی شہر تھا اس لیے قدرۃً اس کی خرید و فروخت مویشی، غلہ اور دیگر زراعتی پیداوار سے ہی متعلق تھی

مدینے میں خرید و فروخت کے جو طریقے اس وقت رائج تھے، ان میں سے دو ایک قابل ذکر ہیں۔

۱۔ بیع محاقلہ:۔ بالیاں پکنے سے پیشتر لوگ کھیتوں کی پیداوار کو خرید کر قبضہ کر لیتے تاکہ بعد میں خود من مانے دام پر فروخت کریں۔

۲۔ بیع مزابنہ۔ ٹوٹی ہوئی کھجوروں سے درختوں میں لگی ہوئی کھجوروں کا تبادلہ

---

[1] بخاری پ۱۲ کتاب الجہاد۔ [2] بخاری پ۱۷ کتاب المغازی۔ [3] بخاری پ۱۷ کتاب المغازی۔
[4] بخاری پ۸ کتاب البیوع۔ [5] تفسیر طبری الجزء الحادی والعشر صفحہ ۴۸۔ آیت؛
وعلى الثلاثة الذين خلفوا حتى إذا ضاقت عليهم الأرض۔

کیا جاتا تھا اسی کا نام مزابنہ تھا۔

جس وقت رسول کریمؐ مدینہ تشریف فرما ہوئے تھے اس وقت وہاں کے تاجر ناپ تول میں یا سنگ مارتے تھے چنانچہ عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ "جس وقت رسول کریمؐ مدینہ تشریف لائے تو وہاں کے لوگ ناپنے میں بڑے ہی خبیث تھے"[1] چنانچہ قرآن میں بھی اس کا تذکرہ ہے کہ

الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ۔ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ (پ۳۰ التطفیف ۸۳ع۱) ترجمہ۔ جب ناپ کر لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔

ابوجہینہ نامی ایک تاجر تھا جو کم ناپ تول کرنے میں ساری بستی میں مشہور تھا چنانچہ جب رسول اللہؐ مدینہ تشریف لائے تو ابوجہینہ کے پاس دو پیمانے تھے۔ جب خود خریدتا تو ایک پیمانے سے خریدتا اور جب فروخت کرتا تو دوسرے پیمانہ سے فروخت کرتا تھا[2]

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ "اہل مکہ اشیاء کو تول کر فروخت کرتے تھے، اور اہل مدینہ اشیاء کو ناپ کر فروخت کرتے تھے"[3]

اہل مدینہ میں دودھ دینے والے مویشیوں کو فروخت کرنے کے لیے جانوروں کو "مصراۃ"[4] بنانے کا رواج تھا جو فریب دہی کی ایک شکل ہے یعنی جانوروں کا دودھ تھنوں ہی میں ایک دو دن ایک دو وقت چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ خریدار سمجھے کہ جانور بڑا دودھیل ہے حالانکہ واقعی مقدار دودھ کی کم ہوتی تھی۔ ہندوستان میں اب بھی گوالے دودھیل جانوروں کو خرید و فروخت کرتے وقت یہ چال چلتے ہیں۔

---

[1] ۔ تفسیر طبری ج ۳۰ صفحہ ۴۹ آیت: ویل للمطففین۔

[2] ۔ تفسیر خازن ج ۴ صفحہ (۳۵۹) نیز کشاف زمخشری ج ۲ آیت: ویل للمطففین۔

[3] ۔ کشاف زمخشری ج ۲ آیت: ویل للمطففین۔

[4] ۔ ملاحظہ ہو بخاری پ۸ کتاب البیوع۔

نرخ اشیاء ذیل میں ہم چند اشیاء کی قیمتیں درج کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو اس زمانے کے بازار کے نرخ کا ایک سرسری سا اندازہ ہو جائے۔

غلام کی قیمت مدینہ کے بازار میں اونٹ، بکری، گھوڑے، گدھے کی طرح غلام بھی فروخت ہوتے تھے حسب حیثیت غلاموں کی قیمتیں مختلف ہوتی تھیں۔ حدیث اور تاریخ کے تفصیلی مطالعے سے مدینہ میں ان کی قیمتوں کا پتہ چلتا ہے۔

"جابرؓ کہتے ہیں کہ انصار کے ایک شخص نے اپنے (قبطی) غلام کو مدبر کیا یعنی معاہدہ کیا کہ معینہ رقم داخل کرنے پر وہ آزاد ہو سکتا ہے۔ اس شخص کے پاس اس غلام کے سوا کچھ اور مال نہ تھا۔ نبی کریمؐ کو یہ خبر پہنچی آپ نے فرمایا کہ مجھ سے اس غلام کو کون خریدتا ہے؟ نعیم بن نحام نے آٹھ سو درہم میں خرید لیا[1]"

ایک دوسری حدیث میں باندی کی قیمت نو اوقیہ بیان کی گئی ہے چنانچہ

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میرے پاس بریرہ آئیں اور انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے مالک سے (۹) اوقیہ پر کتابت کی ہے کہ ہر سال ایک اوقیہ دونگی۔ پس آپ مجھ پر عنایت کیجئے۔ میں نے کہا کہ اگر تمھارا مالک منظور کرے تو میں سب رقم اسے دیدوں (اور میں تمھیں آزاد کر دوں) بشرطیکہ تمھاری ولا مجھے ملے[2] یعنی میں تمھاری وارث سمجھی جاؤں۔

اونٹ کی قیمت اونٹ کی قیمت اس کی خصوصیات کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتی تھی چنانچہ بخاری شریف میں ایک جگہ اونٹ کی قیمت چار دینار بتائی گئی ہے۔ "رسول کریمؐ نے حضرت جابر کا اونٹ چار دینار میں مول لیا۔ پھر جب ہم مدینہ پہنچ گئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اے بلال! انھیں (اونٹ کی قیمت) دیدو چنانچہ انھوں نے چار دینار اور ایک قیراط قیمت دیدی۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ وہ اضافہ جو رسول خداؐ نے عطا فرمایا (کبھی) مجھ سے جدا نہیں ہوا چنانچہ وہ قیراط حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی تھیلی میں ہمیشہ رہا کرتا تھا[3]"

---

[1] بخاری پ۲۸ کتاب الاکراہ۔
[2] بخاری پ۸ کتاب البیوع نیز بخاری پ۱۰ کتاب المکاتب
[3] بخاری پ۹ کتاب الوکالت۔

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنا اونٹ جس کا نام عُصیفر تھا بیس اونٹوں کے بدلے ایک مدت کے وعدہ پر بیچا تھا[1] بعد ازآں اس قسم کی بیع ممنوع قرار دیگئی۔

گھوڑے کی قیمت

مدینہ میں ایک گھوڑا دس اوقیہ چاندی میں رسول اللہ ﷺ نے خریدا تھا چنانچہ مورخ طبری کا بیان ہے کہ "سب سے پہلے آپؐ نے مدینہ میں بنو فزارہ کے ایک اعرابی سے گھوڑا دس اوقیہ چاندی میں خریدا آپؐ نے اس کا نام سکب رکھا۔ اس گھوڑے کے خریدنے میں حزیمہ بن ثابت گواہ تھے اور جس اعرابی سے آپؐ نے گھوڑا خریدا تھا وہ بنو مرہ سے تھا[2]"

بکری کی قیمت

بکری کی قیمت نصف تا ایک دینار بتائی جاتی ہے چنانچہ "عُروہ بارقی کا بیان ہے کہ نبی کریمؐ نے انھیں ایک دینار دیا تاکہ وہ اس کے عوض میں ایک بکری آپ کے لیے خرید لیں۔ پھر انھوں نے اس کے عوض میں آپ کے لیے دو بکریاں خرید لیں پھر انھوں نے ان دو میں سے ایک بکری ایک دینار کے عوض میں فروخت کر ڈالا۔ اور آپ کے پاس ایک دینار اور ایک بکری لے آئے۔ آپ نے ان کے لیے انکی تجارت میں برکت کی دعا کی پس اگر وہ مٹی بھی مول لیتے تو اس میں بھی انھیں فائدہ ہو جاتا تھا[3]"

مذکورہ بالا حدیث سے نہ صرف بکری کی قیمت کا پتہ چلتا ہے بلکہ خود صحابۂ کرام کی تجارتی صلاحیت کا بھی ایک سرسری سا اندازہ ہو جاتا ہے۔

کجاوہ کی قیمت

کجاوہ کی قیمت تیرہ درہم ہونے کا بخاری شریف میں تذکرہ ملتا ہے "حضرت ابوبکرؓ نے (براء کے والد) عازب سے ایک کجاوہ تیرہ درہم میں مول لیا[4]......"

ڈھال کی قیمت

بخاری شریف کی بعض احادیث میں ڈھال کی قیمت تین درہم بتائی گئی ہے[5]۔

---

[1] ۔ موطا امام مالک بیع الحیوان بعضہ ببعض بروایت حسن بن محمد بن علی کرم اللہ وجہہ۔
[2] ۔ طبری صفحہ ۱۷۸۲ رسول اللہؐ کے گھوڑوں کا نام۔ [3] بخاری پ۱۴ کتاب المعجزات نیز ابوداؤد و ترمذی کتاب البیوع۔ [4] ۔ بخاری پ۱۴ باب مناقب المہاجرین۔
[5] ۔ تفصیل بخاری پ۲۷ کتاب الحدود۔

مدینہ کی زندگی میں مہر کی مقدار

"انس رضؓ کہتے ہیں کہ جب عبدالرحمن بن عوف رضؓ نے ایک انصاری عورت سے نکاح کیا تو آنحضرت صلعم نے پوچھا کہ تم نے کتنا مہر دیا؟ بولے ایک گٹھلی کھجور کے وزن کے برابر سونا دیا۔"[1]

یہ تو مدنی زندگی کا ایک ابتدائی واقعہ ہے ورنہ اسلامی ماخذات سے مہر کی قلیل وکثیر مختلف مقداریں ملتی ہیں۔

دیگر پیشے

ایک چھوٹے سے پانچ دس ہزار آبادی والے شہر میں جو پیشہ ور عموماً پائے جاتے ہیں، وہی مدینے میں بھی پائے جاتے تھے چنانچہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں تو ایک باب ہی قایم کیا ہے اور تفصیل وار مدینہ میں جو پیشے اس وقت رائج تھے انھیں بیان کیا ہے۔ مدینہ میں قصاب۔ بڑھئی۔ درزی سنار۔ لوہار وغیرہ سب ہی موجود تھے۔

ابومسعود انصاری رضؓ فرماتے ہیں کہ "انصار میں ایک شخص تھا جسے ابوشعیب کہتے تھے۔ اس کا ایک غلام قصاب تھا......[2]"

حضرت انس رضؓ روایت کرتے ہیں کہ "ایک درزی نے رسول خداؐ کو کھانے پر بلایا......[3]"

ایک انصاری عورت نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ "میرا ایک غلام بڑھئی ہے......[4]"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ "میں نے بنو قینقاع کے ایک سنار کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ میرے ہمراہ چلے اور ہم دونوں اذخر (ایک قسم کی گھاس) لائیں۔ میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اس کو سناروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالوں......[5]"

حضرت انس بن مالک رضؓ کہتے ہیں کہ "ابو طیبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

۱۔ بخاری پ۲۱ کتاب النکاح۔

۲۔ بخاری پ۲۲ کتاب الطعام نیز بخاری پ۹ کتاب المظالم والقصاص۔

۳۔ بخاری پ۸ کتاب البیوع۔

۴۔ بخاری پ۸ کتاب البیوع۔

۵۔ بخاری پ۸ کتاب البیوع۔

پچھنے لگائے تو رسول اللہؐ نے ایک صاع دینے کا حکم دیا اور اپنے عمال کو یہ ارشاد فرمایا کہ ان کے خراج میں کمی کر دیں[۱]

جاہلیت کے عرب میں اخلاق سے گرا ہوا اور ایک طریقہ تھا اور وہ لونڈیوں کے ذریعہ روپیہ کمانا تھا۔ چنانچہ جاہلیت کے لوگ اپنی باندیوں کو زنا کے لیے مجبور کرتے اور ان کی اُجرت حاصل کر لیتے[۲] خود مدینے میں عبداللہ بن ابی بن سلول (منافق) کے ہاں چند لڑکیاں تھیں جن کے ذریعے وہ روپیہ کماتا تھا[۳]

سودی کاروبار یہودی سرمایہ دار مدینہ کی آبادی میں بسے ہوئے تھے، اور مدنی کسانوں کو قرض دیا کرتے تھے۔ مدینے میں سود کا بہت رواج تھا چنانچہ سعد بن ابی بردہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ "جب میں مدینہ گیا تو عبداللہ بن سلام سے ملا...... انھوں نے کہا کہ تم ایک ایسے ملک میں رہتے ہو جہاں سود کا بہت رواج ہے[۴]"

مکے اور طائف میں سودی کاروبار کا جو طریقہ رائج تھا مدینے میں بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ جاہلیت میں سود اس طور پر ہوتا تھا کہ ایک شخص کا قرض میعادی دوسرے پر ہوتا تھا۔ جب میعاد گزر جاتی تو قرضخواہ قرضدار سے کہتا کہ یا تو تو میرا قرض ادا کر یا سود ادا کر۔ اس نے قرض ادا کیا تو بہتر نہیں تو قرضخواہ اپنا قرض بڑھا دیتا اور پھر مدت میں توسیع دیدیتا[۵]

امام مالک (المتوفی ۱۷۹ھ) عموماً مدینہ اور اہل مدینہ کے ہی رواجات

۱۔ بخاری پ۸ کتاب البیوع نیز بخاری پ۹ کتاب السلم۔ ۲۔ تفسیر طبری الجزء الثامن عشر صفحہ (۹۳) آیت: و لا تکرهوا فتیاتکم علی البغاء۔ (سورۃ النور ۲۴ ع ۱)۔

۳۔ تفسیر طبری الجزء الثامن عشرہ صفحہ ۹۲-۹۳۔ آیت مذکور نیز بیضاوی الجزء الثانی صفحہ (۸) مطبوعہ نولکشور آیت مذکور۔

۴۔ بخاری پ۱۵ مناقب عبداللہ بن سلام۔

۵۔ موطا امام مالک کتاب البیوع باب الربوا۔

اور واقعات خاص طور پر قلمبند کرتے تھے۔ اس لیے اغلب ہے کہ مذکورۂ بالا طریقہ مدینہ سے ہی متعلق ہو۔

رہن کے طریقے عموماً جب کوئی شخص مدینہ میں کسی سے کچھ شئے ادھار لیتا تو رقم کے ادا ہونے تک اپنی کوئی چیز ساہوکار کے ہاں رہن کروا دیتا تھا۔ چنانچہ "حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مدت کے وعدہ پر کچھ غلہ ایک یہودی سے مول لیا تھا اور اس کے پاس اپنی زرہ گروی کرا دی تھی"[1]

بعض حدیثوں سے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مدینہ میں اسلام سے پہلے بیوی بچے بھی ـــــ جو کہ مثل مال ہی کے سمجھے جاتے تھے ـــــ رہن کرائے جا سکتے تھے۔ ذیل میں بطور مثال ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔ "محمد بن مسلمہ وغیرہ ایک مرتبہ کعب بن اشرف (یہودی) کے پاس گئے۔ اور اس سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ تو ہمیں ایک وسق یا دو وسق (غلہ) قرض دیدے۔ کعب بن اشرف نے کہا تم اپنی بیویاں میرے ہاں رہن کر دو (تو میں تمھیں قرض دوں گا) محمد بن مسلمہ اور ان کے ساتھ والوں نے کہا کہ ہم اپنی بیویاں تیرے پاس کیسے رہن کر دیں؟ اور تو تو تمام عرب میں خوبصورت ہے۔ کعب نے کہا کہ اچھا تم اپنے بیٹے میرے ہاں رہن کر دو۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم اپنے بیٹے تیرے ہاں کیسے رہن کریں! لوگ انھیں طعنہ دیں گے کہ یہ ایک وسق یا دو وسق میں رہن کیا گیا تھا اور یہ ہمارے لیے باعث عار ہے بلکہ ہم تیرے پاس ہتیار رہن کیے دیتے ہیں"[2] بیوی بچے رہن کرانے کا دستور رہا[3] گا جب ہی تو آپس میں اس قسم کی گفتگو ہوئی۔

امانت مدنی امانت میں خیانت کرنے کو بہت برا سمجھتے تھے شہزادۂ امرا القیس

---

[1] بخاری پ ۹ کتاب السلم نیز بخاری پ ۹ کتاب الرہن [2] بخاری پ ۱۰ کتاب الرہن نیز بخاری پ ۱۶ کتاب المغازی نیز تاریخ طبری ۱۴۹۱

[3] ملتان سے ایک برادر محترم لکھتے ہیں: "ملتان وغیرہ کے سماجی حالات دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہو کہ کوئی شخص انسانی پستی حد سے گزرنا دیکھنا چاہتا تھا تو وہ ملتان اور سندھ آتا، یہاں غریب طبقہ مویشی کے مماثل تھا اور چونکہ زیادہ تر مسلمان ہی غریب طبقے کی صف میں شامل تھے لہٰذا وہی حد درجہ مفلوک الحال تھے، ان کے ہاں اپنے ساہوکار کو تن بخشی کا عمل رائج تھا اور وہ اپنی بیوی بچی اور بہو کو ساہوکار کے سپرد کر کے شکم پری کا سامان کرتا تھا اور قانون نے بھی اسے قبول کر لیا تھا۔ ان حالات میں غیرت حق کو حرکت ہوئی اور ایک غیر پاکستانی جو پیدا تو پاکستان میں ہوا مگر جلد ہی وہاں سے باہر چلا گیا مامور کیا گیا جس نے ان کو ظلم و ستم سے نجات دلائی، ان کے استحصال کو ختم کر دیا"

جو کہ عرب کا سب سے بڑا شاعر گزرا ہے اس نے سموال بن عادیا یہودی کے پاس اپنی زرہیں امانت رکھوائی تھیں" جب امرؤالقیس کا انتقال ہوگیا تو حارث بن ابی شمرالغسانی سموال بن عادیا کی طرف چلا اور اس سے امرؤالقیس کی زرہیں مانگیں جن کی تعداد سو تھی اور نیز اس کا جو مال تھا وہ بھی طلب کیا، لیکن سموال نے نہیں دیا، کیونکہ حارث اس امانت کا حقدار نہ تھا۔ اس پر حارث نے سموال کے بیٹے کو پکڑ لیا اور سموال سے کہا کہ یا تو زرہیں مجھے دیدے یا میں تیرے بیٹے کو قتل کردوں گا۔ سموال نے کہا میں امانت سے کچھ بھی نہ دوں گا حارث نے سموال کے بیٹے کو مار ڈالا جس کا تذکرہ سموال نے خود اپنے اشعار میں کیا ہے۔

وَفَیتُ بِادرعِ الکندِیِ اِنّی ؛ اِذا مَا ذُمَّ اقوامٌ وَفیتُ

ترجمہ: میں نے امرء القیس الکندی کے زرہوں کے معاملے میں جو عہد کیا تھا اُسے پورا کیا (کہ غیر حقدار کو مال نہ لینے دیا) اگرچہ مختلف اقوام (عہدشکنی کے باعث) مذمت کے مستوجب قرار پاتے ہیں مگر میں نے اپنا عہد پورا کر دکھایا۔

اور اعشیٰ نے بھی اس حادثے کا ذکر کیا ہے ؎

کن کا سموال اذطاف الھمام بہ ؛ فی جحفل کسواد اللیل جرار

سموال کی طرح ہو جا کہ جب (شاہ غسان) اس کثرت سے لشکر جرار لے آیا جو رات کی تاریکی کی مثل ملک پر چھا گیا۔ تو سموال نے بے دھڑک کہہ دیا ؎

اُقتلْ اَسیرکَ ؛ اِنّی مَانعٌ جَارِی[1]

تو اپنے قیدی کو قتل کرلے میں اپنے پناہ گیر کی حمایت کروں گا۔

مدنی زندگی کی ایک جھلک مدینہ کاشتکاروں کی بستی تھا۔ یہ کاشتکار عموماً افلاس میں گزربسر کرتے تھے۔ یہودیوں کے پاس خاصی دولت تھی اور انصاریوں میں ابوطلحہؓ سب سے زیادہ مالدار تھے چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ "مدینہ میں ابوطلحہؓ انصاری سب سے زیادہ مالدار تھے[2]"

---

[1] ۔ کامل ابن الاثیر الجزری ج ۱ صفحہ (۱۸۵)

[2] ۔ بخاری پ ۹ کتاب الوکالۃ نیز بخاری پ ۱۱ کتاب الوصیت ۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "...... سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ میں تمام انصار کے اعتبار سے زیادہ مالدار ہوں"[1]

اس موقع پر حضرت سعد کے اس واقعہ کو درج کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لے گئے انھوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نئے کپڑے پہنائے اور ایک خوبصورت کسا کسایا گدھا سواری کے لیے نذر کیا جس سے مدینہ والوں کی رفاہیت کا پتہ چلتا ہے۔

کعب بن مالک کا انگوروں کا باغ تھا جس کے نیچے وہ گرمیوں میں بسر کرتے تھے۔ یہ خوشحال لوگ دعوتیں بھی دیتے تھے۔ موضوع دوسرا ہے ورنہ ایک خاص باب مدینہ والوں کی زندگی کی تفصیل میں درج کیا جا سکتا تھا۔ المختصر وہ اپنے ان باغوں میں اپنے بال بچوں کے ساتھ مہینوں رہتے خصوصاً جب کہ کھجوروں کے پکنے کے دن قریب آتے تھے۔ مدینہ کے ارباب ثروت کے پاس اکثر متعدد باغ ہوتے تھے مثلاً مخریق یہودی جو مسلمان ہو کر شہید ہوئے، ان کے چند باغ تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہادت سے پہلے ان باغوں کا اختیار دیا تھا۔ انھوں نے اپنے باغوں کے دلپسند نام رکھے تھے[2]

مدینہ کے باغوں میں بڑی بڑی باولیاں پختہ بنی ہوئی تھیں[3] جن سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی باغ میں پہنچتا رہتا تھا۔ لوگ پکی ہوئی کھجوریں درختوں سے توڑ توڑ کر کھاتے۔ دنبے اور بکرے ذبح کرتے اور ان کے کباب لگائے جاتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی ان باغوں میں تشریف لاتے اور تازہ کھجوریں تناول فرماتے اور باؤلی کا ٹھنڈا پانی پیتے۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں مختلف واقعات حدیثوں میں موجود ہیں۔

---

[1] بخاری کتاب البیوع۔ [2] "واقدی کہتے ہیں کہ مخریق نامی ایک شخص جو بڑے عالم اور دانشمند تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے انھوں نے اپنا سارا مال خدمت اقدس میں پیش کر دیا یہ سات باغ تھے جو آپ نے تقسیم فرما دیے"۔ بلاذری صفحہ ۱۸۔ اموال بنی النضیر۔ [3] زمانہ جاہلیت کے ایسے بعض پختہ کنوئیں آج کل مدینہ منورہ میں باقی ہونا سیاح بیان کرتے ہیں۔ یہ کنوئیں قید خانوں کا بھی کام دیتے رہے ہیں۔

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ عید الفطر یا عید الضحیٰ کے دن ان کے ہاں آئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے پاس دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں، اور ان اشعار کو گا بجا رہی تھیں، جو انصار نے بطور رجز کے بعاث کے دن پڑھے تھے۔ ان سے ابوبکرؓ نے دو مرتبہ کہا کہ یہ شیطانی گانے باجے اور نبی کریمؐ کا گھر! تو حضور انورؐ نے فرمایا کہ اے ابوبکر! انھیں رہنے دو۔ اے ابوبکر! ہر قوم کی عید ہوتی ہے، اور آج کا دن ہماری عید کا ہے[1]"

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ خدا کی قسم! میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کمرہ کے دروازے پر کھڑا دیکھا اور حبشی مسجد میں نیزوں سے کھیل رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنی چادر میں چھپائے ہوئے تھے کہ میں حبشیوں کے کھیل کو دیکھوں۔ چنانچہ میں آپؐ کے کان اور کندھے مبارک کے بیچ میں سے ان کا کھیل دیکھنے لگی اور جب تک کہ میں خود نہیں پھری آپؐ میرے لیے کھڑے رہے۔ اب تم اندازہ کر لو کہ نو عمر اور کھیل کود کی خواہشمند لڑکی کس قدر کھیل کود کی آرزومند ہوتی ہے۔ (بس یہ حال میرا تھا) اور میں بہت دیر تک تماشا دیکھا کی اور رسول کریمؐ میری خاطر کھڑے ہی رہے[2]"

"رسول اللہؐ ایک غزوہ میں تشریف لے گئے جب واپس ہوئے تو ایک سیاہ فام عورت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے نذر مانی تھی کہ آپ صحیح سلامت واپس آئیں تو میں آپ کے روبرو دف بجاؤں گی اور گانا گاؤں گی آپ نے اس سے کہا اگر تو نے نذر مانی ہے تو بجانا ورنہ نہیں[3]"

"پس وہ بجانے لگی حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے وہ بجاتی رہی۔ پھر حضرت علیؓ آئے وہ بجاتی رہی، پھر حضرت عثمانؓ آئے اور وہ بجاتی ہی رہی۔ پھر حضرت عمرؓ آئے تو وہ دف کو نیچے ڈال اس پر بیٹھ گئی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا

---

[1] بخاری ۵۴۱ ہجرت نیز بخاری ۴۵ کتاب العیدین [2] بخاری ۴۵ کتاب العیدین نیز مسلم۔

اے عمر! تم سے تو شیطان بھی ڈرتا ہے۔ میں موجود تھا وہ بجا رہی تھی، ابوبکرؓ آئے وہ بجاتی رہی، پھر علیؓ آئے اور وہ بجاتی رہی، اسی طرح عثمانؓ آئے اور وہ بجاتی رہی، لیکن اے عمرؓ! جب تم آئے تو اس نے دف کو ڈال دیا۔[1]

"حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے ایک شور اور لڑکوں کی آواز سنی۔ رسول اللہؐ اٹھ کر گئے۔ دیکھا کہ ایک حبشی عورت ناچ رہی ہے اور لڑکے اس کے گرد کھڑے ہیں آنحضرتؐ نے مجھے پکارا کہ اے عائشہ! آؤ تم بھی دیکھ لو چنانچہ میں گئی اور میں اپنا رخسار آنحضرتؐ کے کندھے پر رکھکر آپ کے کندھے اور سر کے درمیان سے میں اس عورت کو دیکھنے لگی اور دیکھتی رہی پھر آپ مجھ سے پوچھتے رہے کہ تمھارا پیٹ دیکھنے سے بھرا کہ نہیں؟ تمھارا پیٹ بھرا کہ نہیں اور میں یہی کہتی رہی "نہیں" تاکہ میں آپ کے نزدیک اپنا مرتبہ دیکھوں (کہ میری کس قدر رعایت اور خاطر کرتے ہیں) پھر ناگاہ حضرت عمرؓ نکل آئے۔ اس وقت سب لوگ اس عورت سے جدا جدا ہو گئے۔ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جنوں اور آدمیوں کے شیطانوں کو دیکھ رہا تھا کہ عمر کی وجہ سے سب بھاگ گئے۔ عائشہؓ کہتی ہیں کہ پھر میں بھی چلی آئی۔[2]

"بی بی عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں ایک سفر میں رسول کریمؐ کے ساتھ تھی۔ فرماتی ہیں کہ میں آپؐ کے ساتھ اس قصد سے دوڑی کہ دیکھوں کون آگے نکل جاتا ہے چنانچہ دوڑ میں میں آپؐ سے آگے نکل گئی۔ لیکن جب میں تنومند فربہ اندام ہوئی تو پھر میں آپؐ کے ساتھ دوڑی اور اس مرتبہ آپؐ مجھ سے آگے نکل گئے اور فرمانے لگے یہ میرا بازی لے جانا اس بازی لے جانے کے بدلے میں ہے۔[3]

"عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑ دوڑ کرائی اور وہ گھوڑے جو تیار کیے گئے تھے ان کی حد حفیا سے لیکر ثنیۃ الوداع تک تھی اور وہ گھوڑے جو تیار نہیں کیے گئے تھے ان کی حد ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک تھی،

1۔ احمد و ترمذی۔ 2۔ ترمذی بحوالہ مشکواۃ فضائل عمرؓ۔ 3۔ ابوداؤد۔

اور عبداللہؓ ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے گھوڑے دوڑائے تھے (یعنے جہاد کے فرائض انجام دئے تھے)[1]

مدنی زندگی کی ابتداء میں مسلمانوں کی معاشی پست حالی

اسلام کے معاشی اصول پر آگے چل کر مسلمانوں کو جو خوش حالیاں حاصل ہوئیں ان کا تذکرہ کرنے سے پہلے ضرور ہے کہ مدنی زندگی کی ابتداء میں مسلمانوں کی جو معاشی پست حالی تھی، اس پر بھی ایک نظر ڈال لیں تاکہ نتائج کے اخذ کرنے میں سہولت ہو۔

جس وقت مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے بالکل مفلس و نادار ہو کر آئے تھے، چنانچہ "حضرت انس انصاریؓ کا بیان ہے کہ جب مہاجرین مکہ سے مدینہ آئے تو ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اور انصار زمین اور اسباب والے تھے"[2]

ذیل میں ہم بخاری سے چند اقتباسات پیش کریں گے تاکہ ہمیں مدنی زندگی کی ابتداء میں مسلمانوں کی جو عام معاشی پست حالی تھی اس کا کچھ حال معلوم ہو سکے۔

حضرت ابومسعود انصاریؓ خود اپنا ہی حال یوں بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہؐ جب صدقہ کا حکم دیتے تو کوئی شخص ہم میں سے بازار جاتا اور بوجھ اٹھاتا تا اسے ایک مد (غلہ وغیرہ) مل جاتا اور اسی سے صدقہ وغیرہ دیتا اور آج ان میں سے بعض آدمیوں کے پاس ایک لاکھ درہم موجود ہیں۔ شقیق (جو کہ راوی حدیث ہیں) کہتے ہیں کہ میں خیال کرتا ہوں کہ ابومسعودؓ نے یہ اپنا ہی حال بیان کیا ہے"[3]

"سعد بن ابی وقاصؓ (فاتح ایران) کا بیان ہے کہ میں نے سب عربوں سے پہلے راہ خدا میں تیر چلایا ہے۔ پہلے ہم جہاد کرتے تھے اور ہمارے پاس کچھ کھانے کو نہ ہوتا تھا بجز جبلہ کے پتوں کے اور ہمارے ہر آدمی کو بکریوں کی سی مینگنیاں آتی

---

[1] - بخاری پ۳۰ کتاب الاعتصام [2] - بخاری پ۱۰ کتاب الھبۃ -
[3] - بخاری پ۹ کتاب السلم نیز بخاری پ۶ کتاب الزکواۃ -

تنیس [1]

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا کہ کیا تم لوگوں کے پاس فرش قالین ہیں؟ میں نے عرض کیا ہم لوگوں کے پاس فرش قالین کہاں ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ "آگاہ ہو جاؤ کہ عنقریب تمھارے پاس فرش قالین ہوں گے" حضرت جابر کہتے ہیں بس اب میں اپنی بی بی سے کہتا ہوں کہ اپنے فرش قالین میرے پاس سے ہٹا لو تو وہ کہتی ہیں کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمایا تھا کہ عنقریب تمھارے پاس فرش قالین ہوں گے بس میں انھیں رہنے دیتا ہوں" [2]

• "ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھے کھانے کو خمیر اور پہننے کو حریر میسر نہ تھا۔ میں پیٹ بھرنے کے واسطے آنحضرتؐ کو لپٹا ہوا رہتا تھا۔ کوئی لونڈی یا غلام بھی میری خدمت کو نہ تھا اور میں اپنے پیٹ سے پتھر باندھے رہتا تھا اور باوجود جاننے کے ہر ایک سے میں آیت کے معنے پوچھتا تھا کہ وہ مجھے لیجا کر کھانا کھلا دے اور مسکینوں کے حق میں جعفر بن ابی طالب بہت اچھے تھے۔ ہمیں لیجا کر ان کے پاس جو کچھ ہوتا تھا کھلاتے تھے۔ اگر کچھ نہ ہوتا تو ہمیں خالی برتن ہی دیدیا کرتے تھے ہم اُسے توڑ کر جو کچھ اس میں (گھی۔ شہد وغیرہ) ہوتا وہی چاٹ لیا کرتے تھے" [3]

"محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ ہم ابو ہریرہؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور وہ کتان کے دو کپڑے گیروے رنگ میں رنگے ہوئے پہنے تھے انھوں نے ناک صاف کی اور پھر کہا واہ واہ! ابو ہریرہ کتان کے کپڑوں سے ناک صاف کرتے ہیں (ایک وہ زمانہ تھا) میں اپنے تئیں منبر اور حجرۂ شریف کے درمیان بے خود پڑا ہوا دیکھتا تھا اور آنے جانے والے لوگ میری گردن پر پیر رکھ دیتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں دیوانہ ہوں، حالانکہ میری وہ حالت دیوانگی سے نہیں بلکہ بھوک سے ہوتی تھی" [4]

---

[1] ۔ بخاری پ۲۶ کتاب الرقاق نیز بخاری پ۱۵ مناقب سعد بن ابی وقاصؓ [2] ۔ بخاری پ۲۰ نیز بخاری پ۲۸ ۔ [3] ۔ بخاری پ۲۲ کتاب الطعام نیز بخاری پ۱۵ مناقب جعفر بن ابی طالب ۔

[4] ۔ بخاری پ۳۰ کتاب الاعتصام ۔

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے فرزند ابراہیم بیان کرتے ہیں کہ ایک دن "عبدالرحمن بن عوفؓ کے پاس کھانا لایا گیا، اور وہ روزہ دار تھے۔ عبدالرحمن بن عوفؓ کہنے لگے مصعب بن عمیرؓ جو مجھ سے بہتر تھے شہید ہوئے۔ اور وہ ایک ایسی چادر میں کفنائے گئے کہ اگر ان کا اس سے سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے تھے اور اگر پاؤں ڈھانکے جاتے تھے تو سر کھل جاتا تھا۔ (ابراہیم کہتے ہیں کہ) میں گمان کرتا ہوں کہ عبدالرحمن نے کہا اور حمزہؓ بھی شہید ہوئے جو مجھ سے بہتر تھے۔ پھر ہم پر دنیا کشادہ کی گئی۔ جس قدر کہ کشادہ ہے یا یہ کہا کہ ہمیں دنیا دی گئی جتنی کہ دی گئی ہے اور ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ (دنیا میں ہی نہ دید یا گیا ہو) پھر وہ رونے لگے یہاں تک کہ کھانا ہٹا دیا گیا"[1]

غریب مسلمان عموماً جو کے بن چھنے آٹے کی روٹی کھایا کرتے تھے چنانچہ "ابو حازم بیان کرتے ہیں کہ میں نے سہیل سے دریافت کیا کہ کیا آنحضرتؐ کے زمانے میں تم نے میدہ دیکھا تھا؟ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کیا تم جو (کے آٹے) کو چھانتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا نہیں بلکہ ہم منہ سے پھونک لیا کرتے تھے"[2]

بعض مسلمان مدنی زندگی کی ابتدا میں اتنے مفلس تھے کہ ان کے گھر میں ایک لوہے کی انگوٹھی تک نہ ہوتی تھی۔ سہیل نامی ایک صحابی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن "ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ اور کہا میں نے اپنے آپ کو آپ کے لیے بخشا اور دیر تک کھڑی رہی۔ آپؐ نے اس کی طرف دیکھا اور شرم سے سر جھکا لیا۔ جب اس کو کھڑے ہوئے بہت دیر ہو گئی تو ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! اگر آپ کو ضرورت نہیں ہے تو اس کا نکاح مجھ سے کرا دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اس کا مہر دینے کے لیے کیا تیرے پاس کوئی چیز ہے؟ اس نے کہا میرے پاس تو نہیں ہے۔ فرمایا: جا۔

---

[1] بخاری پ ۱۶ کتاب المغازی نیز بخاری پ ۱۵ کتاب الہجرۃ نیز بخاری پ ۲۶ کتاب الرقاق وغیرہ۔

[2] بخاری پ ۲۲ کتاب الطعام۔

گھر جا کر تلاش کر۔ وہ گیا اور پھر آیا اور کہا بخدا گھر میں کوئی چیز نہیں ملی۔ آپؐ نے فرمایا جا ڈھونڈ اگرچہ وہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ پھر گیا اور پھر آیا اور کہا کہ لوہے کی انگوٹھی بھی نہیں۔ وہ ایک تہہ بند باندھے ہوئے تھا۔ اس نے کہا یا رسولَ اللہ! اس کے مہر میں یہ تہہ بند ہی دے دوں گا۔ آپؐ نے فرمایا اگر اسے دیدیگا تو تو ننگا رہ جائیگا اور اگر نہ دیگا تو اسے کیا ملیگا؟ پھر وہ شخص ایک طرف پیٹھ پھیر بیٹھ رہا۔ آپؐ نے اس کی طرف دیکھا اور بلا کر کہا کہ کیا تجھے قرآن کی کوئی سورۃ بھی یاد ہے؟ اس نے کہا ہاں! فلاں فلاں سورۃ یاد ہے۔ آپؐ نے فرمایا اس عورت کا نکاح تجھ سے کر دیا بعوض ان قرآنی سورتوں کی تعلیم کے جو تجھے یاد ہیں[1]۔

رسول کریمؐ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد قریشی تجارت کو مفلوج کرنے کے لیے معاشی ناکہ بندی کا حربہ استعمال کیا اور اس کے لیے آپ فوجی دستے بھیجا کرتے تھے۔ منشاء یہ کہ کسی طرح کافروں کا زور ٹوٹے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "ہم تین سو سواروں کو نبی کریمؐ نے بھیجا۔ ابو عبیدہؓ ہمارے سپہ سالار تھے اور ہم قریش کے سوداگروں کی گھات میں رہتے تھے۔ ایک روز ہمیں ایسی سخت بھوک لگی کہ ہم نے کیکر کے پتے کھائے۔ اس لیے ہمارا لشکر لشکرِ خبط کے نام سے مشہور ہوا۔ پھر دریا نے ایک مچھلی پھینک دی جس کو عنبر (وھیل) کہتے ہیں۔ ہم نے پندرہ روز اس کو کھایا۔ اور اس کی چربی کو روغن بنا کر ملا۔ ہمارے بدن تندرست ہو گئے۔ پھر ابو عبیدہؓ نے اس کی ایک پسلی لے کر زمین پر گاڑ دی وہ اتنی بڑی تھی کہ نیچے سے سوار گزر جائے اور ہم میں ایک فیاض شخص تھا جو کہ شدت بھوک کے وقت تین تین اونٹ ذبح کر دیتا تھا لیکن ابو عبیدہؓ نے اس کو منع کر دیا[2] مبادا قافلے میں اونٹوں کی کمی پڑ جائے۔

---

[1] بخاری پ۲۴ کتاب اللباس، نیز بخاری پ۲۱ کتاب النکاح نیز بخاری پ۲۱ کتاب فضائل القرآن نیز مسلم وغیرہ۔ [2] بخاری پ۲۲ کتاب الذبائح۔

" ابن عمرؓ نے کہا کہ رسول خداؐ کے زمانے میں میں نے اپنے ہاتھ سے ایک مکان بنایا جس میں ہم دھوپ اور بارش سے محفوظ رہتے تھے اور میں نے کسی آدمی سے مکان بنانے میں مدد نہیں چاہی۔"[1]

مسلمان عورتوں کی معاشی حالت

مردوں کی طرح عورتیں بھی معاشی لپست حالی کا شکار تھیں۔ انھیں سخت مصائب برداشت کرنے پڑتے تھے۔" حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں میں چکی پیسنے سے چھالے پڑ گئے تھے۔"[2] ابو داؤد کی ایک حدیث پڑھیے خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان کرتے ہیں کہ" فاطمہؓ نے چکی پیسی یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں میں نشان پڑ گئے، مشکیں پانی کی بھریں یہاں تک کہ سینہ میں اس کا نشان نمایاں ہوگیا تھا۔ جھاڑو دی یہاں تک کہ ان کے کپڑے گرد آلود ہو جاتے اور کھانا پکایا یہاں تک کہ کپڑے میلے ہو جاتے۔"[3]

" حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ بیان فرماتی ہیں کہ جب مجھ سے زبیرؓ نے بیاہ کیا تو ان کے پاس کچھ مال نہ تھا۔ نہ زمین تھی نہ لونڈی تھی، نہ غلام تھا اور بجز پانی کھینچنے والے اونٹ اور گھوڑے وغیرہ کے کچھ بھی نہ تھا۔ میں ہی زبیرؓ کے گھوڑے کو چراتی تھی اور پانی پلاتی تھی۔ خود ہی پانی بھرتی تھی، اور آٹا بھی پیستی تھی۔ میں روٹی پکانی نہ جانتی تھی اور میری روٹی انصاری پڑوسنیں پکا دیتی تھیں، اور وہ بڑی نیک بخت عورتیں تھیں۔"

" میں خود ہی زبیرؓ کی اس زمین سے جو رسول اللہؐ نے انھیں دی تھی اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں اٹھا کر لایا کرتی تھی اور وہ جگہ مجھ سے دو میل دور تھی۔"

" ایک روز میں اپنے سر پر گٹھلیاں رکھے چلی آرہی تھی کہ ناگاہ مجھے رسول اللہؐ ملے، آپ کے ہمراہ چند صحابہؓ بھی تھے۔ آپ نے مجھے پکارا۔ پھر مجھے اپنے پیچھے بٹھانے کے واسطے اونٹ کو اخ اخ کہا۔ مجھے مردوں کے ساتھ چلنے میں شرم آئی۔

---

[1] ۔ بخاری پ۲۶ کتاب الاستیذان ۔

[2] ۔ بخاری پ۲۶ کتاب الدعاء نیز بخاری پ۱۴ مناقب حضرت علی کرم اللہ وجہہ ۔

[3] ۔ ابو داؤد پ۳ نیز ابو داؤد کتاب الخراج والمارۃ ۔

اور زبیرؓ کی غیرت مجھے یاد آئی کہ وہ بڑے غیرت دار ہیں۔ رسول اللہؐ نے یہ تاڑ لیا کہ اسماء کو شرم آتی ہے، اور آپ چل پڑے۔

"میں نے زبیرؓ سے آکر کہا کہ مجھے رسول اللہؐ ملے تھے، میرے سر پر گٹھلیوں کا بوجھ تھا، اور آپؐ کے ہمراہ چند صحابہ بھی تھے، آپؐ نے مجھے بٹھانے کے واسطے اونٹ کو ٹھہرایا۔ مجھے اس سے شرم محسوس ہوئی اور میں تو تمھاری غیرت کو جانتی ہوں انھوں نے کہا بخدا! مجھے تم کو سر پر گٹھلیاں لاتے ہوئے دیکھنا آپ کے ساتھ سوار ہو جانے سے زیادہ بُرا معلوم ہوتا ہے بعد ازاں حضرت ابو بکرؓ نے ایک خادم بھیجدیا تاکہ وہ گھوڑے کی نگہبانی کرے، گویا کہ انھوں نے مجھے آزاد کر دیا۔"[1]

جس طرح مستورات کی غذا معمولی قسم کی تھی، اسی طرح ان کا لباس بھی معمولی ہی قسم کا ہوا کرتا تھا چنانچہ ایمن کہتے ہیں کہ "(ایک دن) میں حضرت عائشہؓ کے پاس گیا اور ان (کے جسم) پر ایک کرتا قطر کا پانچ درہم کی قیمت کا تھا۔ انھوں نے کہا کہ (ذرا) میری اس لونڈی کی طرف آنکھ اٹھاؤ۔ اس کو دیکھو کہ یہ گھر میں اس (کرتہ) کو پہننے سے انکار کرتی ہے، اور رسول اللہؐ کے زمانے میں میرے ہاں اسی قسم کا ایک کرتا تھا اور جو عورت مدینہ میں آراستہ کی جاتی تو مجھ سے اس کرتہ کو منگوا بھیجتے تھے۔"[2]

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ "میں نے رسول خداؐ کے ہدی کے قلادے اپنے ہاتھ سے بٹے تھے۔ پھر رسول اللہؐ نے اسے اپنے ہاتھ سے پہنایا تھا۔"[3]

جنگ خندق کے زمانے کا واقعہ حضرت انسؓ یوں بیان کرتے ہیں کہ

"مہاجرین اور انصار مدینہ کی حفاظت میں خندق کھود رہے تھے اور اپنی پیٹھوں پر مٹی ڈھوتے تھے۔"

"لوگ ایک ایک مٹھی جو لاتے تھے اور وہ ایک بودار تیل میں پکا کر قوم کے

۱۔ بخاری پ۲۱ کتاب النکاح نیز بخاری پ۱۲ کتاب الجہاد۔ ۲۔ بخاری پ۱۰ کتاب الہبہ۔
۳۔ بخاری پ۹ کتاب الوکالۃ نیز بخاری پ۷ کتاب المناسک نیز مسلم وغیرہ۔

سامنے شدت بھوک میں رکھے جاتے اور وہ ان کے حق میں ناگوار اور بدبودار معلوم ہوتے تھے .... آپ (رسول کریمؐ) کے پیٹ سے پتھر بندھے ہوئے تھے۔ تین روز تک ہم بھوکے پیاسے ہی رہے"[1]

مدینے کی مسجد چھپر کی بنی ہوئی تھی اور جب کبھی پانی برستا تو چھت ٹپکتی چنانچہ ابو سعید انصاریؓ سے روایت ہے کہ "پھر اسی رات پانی برسا اور مسجد اس زمانے میں چھپر کی تھی لہٰذا اس کی چھت ٹپکی اور میری آنکھوں نے رسول اللہؐ کی پیشانی پر اکیسویں تاریخ کی صبح کو کیچڑ کا نشان دیکھا"[2]

"شروع شروع میں مسجد کھجور کی شاخوں سے بنی ہوئی تھی پس جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیتے تھے تو کھجور کے تنے سے کمر لگا لیتے تھے، پھر جب آپ کے لیے منبر بنایا گیا تو آپ اس پر رونق افروز ہوئے"[3]

جوں جوں مسلمانوں کی خوش حالی میں اضافہ ہوا ویسے ویسے مسجد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ "مسجد نبوی آنحضرتؐ کے زمانے میں کچی اینٹوں سے بنی ہوئی اور کھجور کی شاخوں سے پٹی ہوئی تھی۔ اس کے ستون کھجور کے تنوں سے بنے ہوئے تھے حضرت ابو بکرؓ نے اس میں کچھ اضافہ کیا"

"حضرت عمرؓ نے اس میں اضافہ کیا لیکن جیسی ہیئت رسول کریمؐ کے زمانے میں تھی ویسی ہی رکھی یعنے کچی اینٹوں اور کھجور کی شاخوں کی۔ البتہ اس کے ستون بدل دیے اور وہ لکڑی کے تھے"

"اور حضرت عثمانؓ نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور اس کی دیواریں پتھر اور چونے کی بنوائیں جس میں نقش بھی بنے ہوئے تھے اور اس کے ستون نقشی پتھروں کے بنائے اور چھت میں ساگوان (ساج) کی لکڑی لگائی"[4]

حاصل کلام یہ کہ حجاز کی جو حالت تھی، اس کی تین آبادیوں طائف۔ مکہ اور مدینہ کی مندرجہ بالا زندگی سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ بخاری پ۱۶ کتاب المغازی۔ ۲۔ بخاری پ۸ کتاب الصوم ابواب الاعتکاف۔

۳۔ بخاری پ۱۴ باب: اسلام میں نبوت کی علامتیں۔

۴۔ ابو داؤد کتاب الوضوء نیز بلاذری صفحہ (۷)۔

دوسرا باب

اسلام اور دیگر مذاہب کے معاشی اصولوں کا تقابلی مطالعہ

خلاصہ :۔ اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ مختلف مذاہب کے عقائد و احکام نے لوگوں کی معاشی زندگی پر ایک خاص اثر ڈالا ہے۔

آج ہی نہیں بلکہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے انسان اس سوال کے حل میں مصروف ہے کہ معاشی مشکلات کا اگر بالکلیہ خاتمہ نہ ہوسکے تو کم از کم ممکنہ حد تک ان دشواریوں میں کیا آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں؟ مختلف قوموں نے مختلف زمانوں میں اس کے مختلف حل پیش کیے ہیں اور آج تک دنیا اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی ہے۔

اس سلسلہ میں برہمنیت، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا معاشی نقطۂ نظر سے تذکرہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ

(۱) مذہب کا ایک نقطہ نظر تو یہ ہے کہ اپنی زندگی کی مثالوں سے دنیا کی جس جس چیز کو اپنے لیے بے کار ثابت کر دیا جائے اسی قدر مذہبی کمال ہے۔ کھانے پینے اوڑھنے اور پہننے کی چیزیں تو در کنار ہوا جس میں سانس لی جاتی ہے حبس دم وغیرہ کی مشقتوں سے جو اس کو تک بے کار قرار دے وہی سب سے زیادہ کامل انسان ہے۔

(۲) دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان مادہ پرست اور خونخوار درندہ ہو جائے کہ حق سب میرا ہے اور فریضہ مجھ پر کچھ بھی عائد نہیں۔

(۳) ان دونوں انتہا پسندیوں کے بین بین ایک اور نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان تو خدا کے لیے ہو لیکن خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز انسان کی خدمت گزار ہو۔ چنانچہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے، جس قدر اس کی ایک ایک چیز کو انسانیت کے لیے مفید ثابت کیا جائے اسی قدر آسمانی کتاب کی صداقت واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک جس مذہب کو پیش کرتا ہے وہ کھلے لفظوں میں اپنے ماننے والوں پر یہ فریضہ عائد کرتا ہے کہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے جب تک اس کے ہر ہر چیز کے متعلق یہ تحقیقات نہ کریں کہ وہ انسان کی کسی نہ کسی ضرورت میں کام آتی ہے، ان کی آسمانی کتاب کی تفسیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

پھر اسی باب میں بھائی چارے کے معاشی اثرات سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ باہمی قربانیوں اور برادرانہ الفت کے ذریعے سے چاہا جائے تو صارفین اور پیدا کنندوں کے درمیان خود غرضیوں کی جو خلیج حائل ہے، اُسے بہ آسانی اسلامی اصول معاشیات کی پابندی کر کے لوگ پاٹ سکتے ہیں۔ ورنہ جب تک موجودہ حالات ہیں خطرات سے معاشرہ کو بچانے کی مشکل ہی سے کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اور ہمیشہ وہی کساد بازاری، خوف و ہراس، اور بے روزگاری کا دور دورہ رہے گا۔ پھر آخر میں بتایا گیا ہے کہ نسل بندی جدید معاشی دنیا کی ضرریات کے منافی ہے۔

مذاہب کا پرتو لوگوں کی معاشی زندگی پر مختلف مذاہب کے احکام و تصورات نے لوگوں کی معاشی زندگی پر جو خاص اثر ڈالا ہے اس کے تقابلی مطالعے کے لیے تو ایک علیحدہ مقالہ کی ضرورت ہے۔ یہاں صرف چند خاص پہلوؤں کو واضح کرنا ہمارا مقصد ہے۔ اس مقالے کا مقصد تو محض اسلام کے معاشی اصولوں کی توضیح اور تشریح ہے لیکن اسلامی اصولوں کو بخوبی سمجھنے کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ دوسرے مذاہب کے متبعین بر زمانۂ حاضرہ جن اصولوں کو اپنی معاشی زندگی کا مدار ٹھیراتے ہیں ان سے تھوڑی بہت

آگاہی حاصل کر لی جائے۔ اسی سے اس بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ زندگی کے پُر مشقت احوال میں کونسے اصول عملی طور سے حقیقی اور برمحل افادیت کا مظہر ہوسکتے ہیں۔ اسی مقصد کی توضیح کے لیے یہ باب اور اس کی فصلیں مختص کی گئی ہیں۔

آج ہی نہیں بلکہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے انسان اس سوال کے حل میں مصروف ہے کہ معاشی مشکلات کا اگر بالکلیہ خاتمہ نہ ہو سکے تو کم ازکم ممکنہ حد تک ان دشواریوں میں کیا آسانیاں پیدا کی جا سکتی ہیں؟ مختلف قوموں نے، مختلف زمانوں میں اس کے مختلف حل پیش کیے ہیں، اور آج تک دنیا اسی ادھیڑبن میں لگی ہوئی ہے۔

ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جنھوں نے بجائے "باہر" کے خود انسان کے "اندر" کی طرف توجہ کرکے انسان کے معاشی مشکلات دُرد اور دکھ میں تخفت پیدا کرنے کی کوشش کی، چنانچہ برہمنیت، بدھ مت، یہودیت اور عیسائیت وغیرہ نے بھی مذکورہ بالا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ان مذاہب کے اصول پر آئندہ فصلوں میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلی فصل برہمنیت اور بدھ مت

الف۔ برہمنیت

گیتا کا ایک اشلوک ہے کہ "جیسے دھویں میں آگ چھپی رہتی ہے اور غبار سے آئینہ ڈھکا رہتا ہے اور جھلی میں بچہ پوشیدہ رہتا ہے، اسی طرح انسان خواہشوں سے لپٹا رہتا ہے[1]" نیز منوجی نے اپنی سمرتی میں لکھا ہے کہ "جس چیز کی خواہش مَن یعنے دل کو ہوتی ہے اس کے مل جانے پر بھی مَن آسودہ نہیں ہوتا، بلکہ خواہش اور زیادہ ہوتی ہے جس طرح گھی ڈالنے سے آگ تیز ہوتی ہے[2]" ان خواہشات کے حل کا

---

[1] بھگوت گیتا۔ ادھیائے سوم منتر نمبر (۳۸) صفحہ (۹۵) مترجمہ منشی شیام سندر لال مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۰۶ء۔

[2] منوسمرتی ادھیائے ۲ منتر نمبر (۹۴) صفحہ (۳۷) مترجمہ لالہ سوامی دیال۔

اس نے یہ طریقہ بتایا ہے کہ "انسان اپنے اپنے بیٹیوں (خواہشات) سے اندریوں (حواس خمسہ) کو روکے ۔ اس طرح جیسے رتھ بان گھوڑے کو لگام سے روکتا ہے[1]" یعنے آنکھ کو دیکھنے سے، زبان کو ذائقے سے، ناک کو سونگھنے سے، کان کو سننے سے، بدن کو چھونے سے روکے اور ایک خاص عمر میں پہنچ کر بن باس اختیار کرے ۔ اور "چمڑا یا کپڑے کا ٹکڑا پہن کر صبح و شام اشنان کرے ۔ ڈاڑھی، موچھ، بال اور ناخن بڑھائے یعنے حجامت نہ بنوائے[2]" "گرمی میں آگ تاپے، برسات میں میدان میں رہے، اور جاڑے میں گیلا کپڑا پہنے رہے[3]" یہی نہیں بلکہ "سکھ (راحت) کے واسطے کوشش اور تدبیر نہ کرے برہم چاری ہو کر زمین پر سوئے اور درخت کی جڑ میں قیام کرے اور قیام گاہ سے محبت نہ رکھے[4]"

ذات پات برہمنیت نے معاشرہ میں تقسیم عمل کا نقشہ بھی پیش کیا ہے ۔ یہ تقسیم عمل، ذات پات (کاسٹ سسٹم) کی صورت میں رونما ہوئی ہے ۔ برہمن کو معاشرہ میں خاص درجہ دیا گیا ہے ۔ کہ "براہمن اپنی پیدائش ہی سے دیوتاؤں کا دیوتا ہے[5]" اور برہما جی نے اپنی عبادت کے زور سے برہمن کو اپنے منھ سے پیدا کیا ہے[6]

جس طرح برہمن معاشرہ میں سب سے اعلیٰ ہے، اسی طرح اس کے برعکس شودر سب سے پست ہے کہ "وہ عضو حقیر یعنے پاؤں سے پیدا ہوا ہے[7]" برہمنیت کا معاشرہ پیشے کے لحاظ سے چار بڑی ذاتوں برہمن، چھتری، ویش،

---

[1] منوسمرتی ادھیائے ۲ منتر نمبر (۸۸) صفحہ (۳۶) ۔ [2] ۔ منوسمرتی ادھیائے ۶ منتر نمبر ۶ صفحہ (۱۹۰) ۔ [3] ۔ منوسمرتی ادھیائے (۶) نمبر ۲۳ صفحہ (۹۳) ۔

[4] ۔ منوسمرتی ادھیائے ۶ منتر نمبر (۲۶) صفحہ (۱۹۴)

[5] ۔ منوسمرتی ادھیائے ۱۱ منتر نمبر (۸۵) صفحہ (۴۳۳)

[6] ۔ منوسمرتی ادھیائے (۱) نمبر ۹۴ صفحہ (۱۱۷)

[7] ۔ منوسمرتی ادھیائے ۸ نمبر (۲۷۰) صفحہ (۲۹۹)

اور شودر پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں ایک وہ طبقہ ہے جو سوسائٹی سے باہر ہے جس میں چنڈال وغیرہ شامل ہیں۔ "چنڈال و سوپچ (نیچ قوم) یہ دونوں گاؤں کے باہر قیام کریں۔ برتن وغیرہ سے محروم رہیں۔ ان کی دولت سگ و خر ہے[1]۔" "چنڈال وغیرہ مردے کے کپڑے پہنیں اور ٹوٹے برتن میں بھوجن کیا کریں[2]۔"

ہر ایک ذات دوسری ذات سے بود و باش غذا آلات و ظروف لباس وغیرہ میں مختلف ہے۔ ایک ہی چیز جو ایک ذات کے ہاں غذا ہے تو دوسری کے ہاں خدا ہے۔ ایک ذات کے لوگ نہ تو دوسری ذات کے ساتھ کھا پی سکتے ہیں اور نہ اُٹھ بیٹھ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی شادی بیاہ کر سکتے ہیں۔ "نیچ ذات والا کسی ایسی دُکان میں داخل ہونے یا ایسی سڑکوں سے گزرنے کے قابل نہیں ہوتا جہاں اونچ ذات کے دُکاندار رہتے ہوں[3]۔"

---

[1] ۔ منوسمرتی ادھیائے ۱۰ منتر نمبر (۵۱) صفحہ (۳۹۹)۔ [2] منوسمرتی ادھیائے ۱۰ منتر نمبر ۵۲ صفحہ (۴۰۰)
[3] ۔ معاشیات ہند از جتھار و بیری جلد اول صفحہ ۱۰۴ ساتواں ایڈیشن ۱۹۴۲ء۔

ذات پات:۔ ذات پات کا تذکرہ ویدوں میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ رگ وید کا ایک اشلوک جو عام طور پر پرش کا بھجن کہلاتا ہے اس میں لکھا ہے کہ "جبکہ دیوتاؤں نے پرش کے جسم کو تقسیم کیا کتنے ٹکڑے اس کے جسم کے کیے؟ اس کے منہ سے کیا بنا؟ اس کے بازو سے کیا بنا؟ اس کی زانوں اور پاؤں سے کیا بنا؟ برہمن اس کے منہ سے پیدا ہوئے۔ راجنیا (چھتری) اس کے بازو سے، ویش اس کے زانو سے، اور شودر اس کے پاؤں سے پیدا ہوئے۔" (رگ وید باب دہم منتر نمبر (۹۰)۔ ویدوں کے علاوہ گیتا میں بھی ذات پات کا تذکرہ ملتا ہے "سری بھگوان نے فرمایا کہ گن اور کرم (پیشہ) کی رو سے ہم نے چار ورن پیدا کیے اس کا کرتا اور اکرتا بھی مجھ ہی کو کہ لازوال ہوں جانو۔" (گیتا ادھیائے ۴ منتر نمبر ۱۲ صفحہ ۱۰۶)

ذاتوں کا تذکرہ برہمیت کی رزمیہ نظموں مہابھارت اور رامائن اور پرانوں میں بھی موجود ہے۔ اور منوجی نے بھی اپنی سمرتی میں نہایت شدومد سے ذاتوں کا تذکرہ کیا ہے "ساکن اور متحرک چیزوں میں کیڑا افضل ہے۔ اس سے چارپایہ، اس سے آدمی اور اس سے برہمن افضل ہے۔" (منوسمرتی ادھیائے ۱ منتر ۹۶ صفحہ ۱۸)

جس طرح برہمن سب سے اعلیٰ ہے، اسی طرح اس کے برعکس شودر سب سے پست ہے کہ "اگر شودر، برہمن، چھتری یا ویش سے سخت زبانی کرے تو اس کی زبان میں سوراخ کیا جائے کیونکہ وہ عضو حقیر یعنے پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔" (منوسمرتی ادھیائے ۸ منتر نمبر ۲۷۰ صفحہ ۲۹۹)

مختصر یہ ہے کہ کسی شخص کی حیثیت اور پیشہ کا تعین سراسر اس کی ولادت کے ذریعہ ہوتا ہے[1] دھرم کی رو سے "نیچ ذات والا طمع سے بڑوں کے کرم (پیشہ) سے اوقات گزاری کرے تو راجہ اس کو بے زر کر کے جلد اپنے ملک سے نکال دے[2]" برہمن کی سیوا (خدمت) شودر کا بڑا کرم (عبادت) ہے۔ اس کو چھوڑ کر اور جو کچھ کرتا ہے وہ سب نسپھل (بےثمر) ہے[3]

"اے کنتی کے فرزند! اپنا کرم (پیشہ) اگر باعیب بھی ہو تو اس کو نہ چھوڑنا چاہیئے سب کاموں کے آغاز عیب سے لپٹے ہوئے ہیں۔ اسی طرح جیسے آگ دھوئیں سے لپٹی رہتی ہے[4]"

اس نظام میں اہل پیشہ کو عموماً حقیر اور ادنیٰ تصور کیا جاتا ہے[5]۔ "جو شودر اپنا خدمت گزار

---

[1] - برہمنیت میں ہر ذات کے لیے علیحدہ پیشہ مقرر کر دیا گیا ہے۔

(۱) برہمن کے فرائض - دان دینا اور دان لینا۔ شاستر پڑھنا اور پڑھانا وغیرہ (منوسمرتی، ادھیائے ۱ منتر ۸۸ نیز ادھیائے ۱۰ منتر ۷۵، گیتا ادھیائے ۱۸ منتر ۴۲)۔

(۲) چھتری کے فرائض - رعایا کی حفاظت کرنا۔ دان دینا۔ دنیا کی نعمتوں میں دل نہ لگانا۔ (منوسمرتی ادھیائے ۱ منتر نمبر ۸۹ نیز ادھیائے ۱۰ منتر ۸۰ گیتا ادھیائے ۱۸ منتر ۴۳)

(۳) ویش کے فرائض - تجارت، کاشتکاری، گلہ بانی۔ سود بیاج لینا دان دینا (منوسمرتی ادھیائے ۱ منتر ۹۰ صفحہ ۱۷ نیز ادھیائے منتر نمبر ۳۲۶۔ گیتا ادھیائے ۱۸ منتر ۴۴)

(۴) "شودر کے لیے ایک ہی کرم (پیشہ) پربھو نے ٹھہرایا ہے یعنی صدق دل سے ان تینوں ذاتوں کی خدمت کرے" (منوسمرتی ادھیائے ۱ منتر ۹۱ صفحہ ۱۶ نیز گیتا ادھیائے ۱۰ منتر ۴۴)

[2] - منوسمرتی ادھیائے ۱۰ منتر نمبر ۹۶ صفحہ ۴۰۹ - [3] - منوسمرتی ادھیائے ۱۰ منتر نمبر ۱۲۳ صفحہ ۴۱۴

[4] - گیتا ادھیائے ۱۸ منتر نمبر ۴۸ صفحہ ۴۹۰ -

[5] - حسب ذیل پیشہ در حقیر اور ناپاک تصور کیے جاتے ہیں "کھال۔ ہڈی اور بال کمانے سے جو تکلیف ہوتی وہی ان کے ساتھ بھوجن کرنے سے ہوتی ہے" (منوسمرتی ادھیائے ۴ منتر نمبر ۲۲۱ صفحہ ۱۵۲)

وہ پیشہ ور حسب ذیل ہیں :-

بڑھئی۔ وید (طبیب، ڈاکٹر) درزی۔ سنار۔ لوہار۔ ہتیار فروخت کرنے والا۔ رنگریز۔

اور اپنی پناہ میں ہے، اس کو جھوٹا غلہ اور پرانا کپڑا بغیر ساز کا دھانیہ چارپائی و گھر کا پرانا اسباب دینا چاہیئے[1]

عدم مساوات کی مزید مثالیں برہمنی معاشرہ میں خالص معاشی معاملات میں بھی امتیاز رکھا گیا ہے مثلاً قرض کی شرح سود برہمن سے فیصدی دو روپے۔ چھتری سے تین روپے، ویش سے چار روپے، اور شودر سے پانچ روپے سود ماہوار لیوے[2]۔ اسی طرح کسی برہمن کی چار بیبیاں چار مختلف ذاتوں کی ہوں تو "برہمن کا بیٹا چار حصے، کشتریہ کا بیٹا تین حصے، ویشہ کا بیٹا دو حصے اور شودر کا بیٹا ایک حصہ لیوے[3]" یہ بھی قاعدہ ہے کہ "شودر صرف اپنی ذات کی لڑکی سے اور ویش اپنی ذات اور شودر کی لڑکی سے اور کشتری اپنی ذات اور ویش اور شودر کی لڑکی سے اور برہمن چاروں ذات کی لڑکیوں سے نکاح کر سکتا ہے[4]" روزگار نہ ملنے کی صورت میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بیاج سے جینے والا۔ نٹ۔ گانے والا۔ دھوبی۔ معمار وغیرہ۔ (منوسمرتی ادھیائے ۴ منتر نمبر (۲۱۰ تا ۲۱۶) صفحہ ۱۵۰ تا ۱۵۱)۔

جن برہمنوں کو منوجی نے شرادھ میں بھوجن کرانے یا سوسائٹی میں بٹھانے کے لائق نہیں کہا وہ یہ ہیں: وید (طبیب۔ ڈاکٹر) بنیوں کے کرم سے جینے والا (تاجر) مزدوری لیکر رعیت یا راجہ کی فرماں برداری کرنے والا (یعنے ملازمین سرکار) سود بیاج سے اوقات بسر کرنے والا (بینکر ساہوکار) مزدوری لیکر پڑھانے والا (مدارس کے اساتذہ اور کالج کے پروفیسر) مزدوری دیکر پڑھنے والا (طلبا جو مدارس اور کالجوں میں فیس دیکر تعلیم حاصل کرتے ہیں) سمندر میں جانے والا پرند پالنے والا (پولٹری میجر) لڑائی کے لیے علم اسلحہ سکھانے والا۔ مزدوری لیکر درخت لگانے والا (باغبان ملازمین جنگلات وغیرہ) کتوں سے کھیل کرنے والا۔ باز وغیرہ پرند سے اوقات بسر کرنے والا۔ کاشتکار۔ گلہ بان وغیرہ۔

"سب دشٹوں میں بڑا دشٹ (بداعمال) سنار ہے جب وہ قصور کرے تو جرم کے موافق تھوڑے تھوڑے عضو کو چھری سے کاٹا جائے" (منوسمرتی ادھیائے ۹ منتر نمبر ۲۹۲ صفحہ ۳۷۹۔

۱؎ منوسمرتی ادھیائے ۱۰ منتر نمبر ۱۲۵ صفحہ ۴۱۴۔ ۲؎ منوسمرتی ادھیائے ۸ منتر نمبر (۱۴۲) صفحہ (۲۷۵)

۳؎ " " ۹ " ۱۵۳ " ۳۵۴۔ ۴؎ " " ۳ " (۱۳) " (۶۷)

بحالت مجبوری برہمن اور کشتری ویش کے بعض پیشے اختیار کرسکتے ہیں[1] اور "ویش اپنے پیشے سے اوقات گزاری نہ کرسکے تو شودر کے پیشے سے اوقات گزاری کرے اور جو چیز کرنے کے لایق نہیں ہے، اس کو نہ کرے[2]" لیکن اس کا الٹا نہیں ہوسکتا یعنے اگر "نیچ ذات والا طمع سے بڑوں کے کرم سے اوقات گزاری کرے تو راجہ اس کو بے زر کرکے جلد اپنے ملک سے نکال دے[3]"

دیہاتی زندگی پر برہمنیت کے اثرات

بعض میلانات زرعی اور صنعتی پیداوار میں اصلاح و ترقی کے بعض طریقوں کو استعمال کرنے کے خلاف پائے جاتے ہیں مثلاً ہڈی، مچھلی، اور فضلے کو زرعی زمین کے لیے کھاد کے طور پر استعمال کرنے میں اکثر ذاتوں کو اعتراض ہے[4]۔

الغرض نہ صرف پیشوں کے اختیار کرنے میں بلکہ بطور عام ہر کاروبار میں برہمنیت نے انسان کی آزادی سلب کرلی۔ کوئی انسان اپنے فطری رجحان کی بنا پر جس پیشہ کو چاہے اختیار نہیں کرسکتا۔

ذات پات کی اور خرابیوں کے منجملہ ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ طریقہ بڑے پیمانے کے کاروبار میں سدراہ بنا رہا۔ محنت طلب اور رسد کے اعتبار سے تقسیم نہیں ہوتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے پیشے چند ذاتوں کے اجارے میں آجاتے ہیں۔

ذات پات کے اس غیر فطری رواج نے زمانۂ مابعد کے ہندوستانی معاشرہ کو تلملادیا۔ گو ڈاکٹر ٹیگور نے ذات پات کا فلسفہ لکھکر اسے انسانی عمرانیات کی معراج قرار دی ہے لیکن ہندو اہل قلم نے ہی تسلیم کرلیا ہے کہ معاشرہ کی اس عدم مساوات کا وہی نتیجہ ہوا جو ہونا تھا۔ "محمد بن قاسم کو سندھ کی فتح میں جاٹوں اور دوسرے زراعت پیشہ فرقوں نے اچھی خاصی مدد دی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ صدیوں سے برہمنی نظام سے بیزار اور آزادی کے لیے تڑپ رہے تھے[5]"

---

[1] منوسمرتی ادھیائے ۱۰ منتر نمبر (۸۵ و نیز ۹۵) صفحہ (۴۰۶)۔ [2] منوسمرتی ادھیائے ۱۰ منتر نمبر ۹۸ صفحہ (۴۰۹)
[3] " " ۱۰ " (۹۶) " (۴۰۹) [4] معاشیات ہند از جتھار و بیری جلد اول صفحہ (۱۰۴)
[5] ہسٹاریکل رول آف اسلام از ایم، ان رائے صفحہ ۹۶۔

ہندو ارباب فکر نے "ذات پات کے طریقہ کو ملک کی ہر جہتی ترقی کے راستہ میں ایک ایسی عظیم مزاحمت قرار دی ہے کہ جسکو انسان کی گمراہ ہنرمندی نے خود اپنی تباہی کے لیے پیدا کیا ہے"[۱]

ہندوستان میں پیشہ کی عدم آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشی آزادی سلب اور ترقی کی خواہش دل سے گویا محو ہو گئی۔ ہر شخص کا پیشہ اور اس کی ذاتی اور شخصی ترقی کا معیار ابدی طور سے اس طرح قائم ہو گیا کہ سر مو اس سے تجاوز محض ناممکن تھا[۲]

مسٹر سی، بی فیسن نے اپنی کتاب "دی سائنس آف سولزیشن" میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ "کوئی نظام معاشی آزادی کی راہ میں اتنا سد راہ نہیں جتنا کہ ذات پات کا نظام ہے۔ اور نہ ہی کوئی تدبیر معاشی ترقی کی راہ میں اتنی حائل ہے جتنی کہ ذات پات ہے"[۳]

اس نظام کی خرابی ہندو مصلحوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ گاندھی جی نے اپنی زندگی کا مقصد چھوت چھات کے قدیم فرسودہ نظام کو ختم کر دینے کو بھی قرار دیا۔ ان کی مخلصانہ کوششوں کو عملاً کس قدر کامیابی حاصل ہوئی اس کو تو ابھی ایک دو صدیوں کے بعد مورخ ہی دہرا سکیگا لیکن ان کے متبعین ان کی تعلیم و تلقین سے متاثر ہو کر آزاد ہندوستان کے لیے جس دستور کا مسودہ مرتب کیا ہے وہ ہندو مت کا نہیں اسلام کا عکس ہے۔

ذات پات کا یہ مختصر تذکرہ ختم کرنے سے قبل اس بات کی توضیح غیر موزوں نہ ہو گی کہ قرآن مجید نے قوم نوح کی معاشرتی حالات کی تفصیل کرتے ہوئے اس عہد کے معاشرہ کی سب سے بڑی خصوصیت اسی "جات دچار" یا "ذات پات" کے مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ نوح علیہ السلام پر منجملہ دوسرے اعتراضوں کے ان کی

---

[۱] ۔ معاشیات ہند از جتھار ناتھ بیری جلد اول باب ۲ صفحہ ۱۰۱
[۲] تفصیل علم المعیشت ۔ الیاس برنی حصہ دوم باب دوم صفحہ ۹۱
[۳] ۔ ماخوذ از اے اسٹڈی آف انڈین اکنامکس ۔ بی بانرجی صفحہ ۴۲ چوتھا اڈیشن ۔

قوم کا بڑا اعتراض یہی تھا کہ تمھارا ساتھ وہی لوگ دے رہے ہیں جو کھلے بندول رذیل اور کمینے ہیں "ھم اراذلنا بادی الرائے"۔ حضرت نوح سے مطالبہ یہ تھا کہ ان شودروں اور نیچ ذات والے لوگوں کو اپنے ہاں سے نکال دو لیکن حضرت نوح علیہ السلام یہ شرط تسلیم نہیں کرتے تھے۔

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات پات کے جھگڑے کی ابتدا تاریخی طور سے نوح علیہ السلام کی قوم سے ہوئی اور اس کی یادگار اب تک ہندوستان کی سرزمین میں موجود ہے۔

ب۔ بُدھ مت

مہاتما بُدھ نے بھی معاشی مشکلات کو حل کرنے کا وہی طریقہ اختیار کیا جو برہمنیت نے پیش کیا بلکہ وہ برہمنیت سے بھی آگے بڑھ گیا چنانچہ مہاتما بدھ کی طرف یہ خیال منسوب کیا جاتا ہے کہ "نروانا اور نجات کا استحقاق کسی کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی فطرت کو "بے مدعا" بنانے میں کامیاب نہ ہو جائے"۔ یعنے ہر طرح کی آرزوؤں اور تمناؤں سے خود کو خالی کرلے۔ ظاہر ہے کہ انسانی فطرت پر بے مدعائی کا یہ آپریشن اگر کامیاب ہو جاتا تو جن معاشی مشکلات کو حل کرنے کی راہ باہر تلاش کی جارہی ہے کتنی آسانی کے ساتھ خود آدمی کے اندر اس ترمیم کے ذریعہ نکل آتی کہ اس کے بعد آدمی آدمی نہیں بلکہ قریب قریب وہ فرشتہ اور فرشتوں جیسا "بے حاجت وجود" بن جاتا۔

دنیا کے بعض اور مذاہب کی طرح بدھ مت میں بھی دنیاوی ترقی کی مذمت کی گئی ہے۔ کسی نے عالم کے موجودہ نظام کو "مایا" یا دام کا وہ دانہ قرار دیا ہے کہ جسے شکاری نے خوبصورت اور پوشیدہ پھندوں کے درمیان بکھیر دیا ہے گویا جس نے اس پر منھ مارا وہی پھنسا۔ لہٰذا انسان "دنیا کو سراب، پانی کا بلبلہ اور خواب" سمجھے اور اس سے کنارہ کش ہو جائے۔

مہاتما بُدھ نے تو چھوت چھات دور کرنے کے لیے آواز بلند کی لیکن

"بدھا نے درجہ بندی مٹانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے نیک چلنی کے ذریعہ روحانی مساوات پر زور دیا تاکہ نجات حاصل ہو"[1]

دوسری فصل۔ یہودیت اور عیسائیت

الف۔ یہودیت

یہودیوں کا مذہب، سرمایہ دار دولت مندوں کا مذہب ہے۔ چنانچہ "یہودی قانون کی لفظی معنیٰ میں جو توضیح کی جاتی ہے اس کی شدت کے لحاظ سے یہودیت ایک دولتمند شخص کا مذہب ہے، اس کے جو مطالبات ہیں، اس کو ایک غریب شخص پورا نہیں کرسکتا...... مذہبی پیشوا غربت کو یہ سمجھتے تھے کہ وہ خدا سے لو لگانے میں مانع ہے"[2]

ذات پات کا معاشی اثر

"یہودی خود کو اعلیٰ اور دوسروں کو ادنیٰ سمجھتے ہیں"۔ اس طرح ان میں نہ صرف ایک علیحدہ قومیت پیدا ہوئی بلکہ وہ دیگر لوگوں سے نفرت و عداوت بھی رکھنے لگے اور یہ کہ ان کے سماجی ادارے اور ان کا مذہب اوروں کے مقابلے میں سب سے اعلیٰ و ارفع ہے"۔ اسی عداوت اور نفرت کی بناء پر "حضرت عیسیٰ کے زمانے میں رومی، یہودیوں کو نسل انسانی کا دشمن قرار دیتے تھے"[3]

انجیل سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہودی غیر یہودیوں کے ساتھ کھانا دغیرہ

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد (۴) عنوان "کاسٹ" صفحہ ۹۷۸۔
[2] لارڈ اسٹامپ: کرسچیانٹی اینڈ اکنامکس صفحہ ۲۳۔
[3] ہائی لینڈ: ہسٹری آف سیویلیزیشن صفحہ ۳۔

نہیں کھاتے تھے۔ چنانچہ "سامریا کی اس عورت نے اس سے کہا کہ کیونکر تو جو یہودی ہے مجھ سے جو سامریا کی عورت ہوں پانی پینے کو مانگتا ہے، کیونکہ یہودی سامریوں سے صحبت نہیں رکھتے تھے"[۱]

مختصر یہ کہ یہودیوں کے مذہبی قوانین غیر یہودیوں سے اشیاء کا مبادلہ کرنے اور معاشی تعلقات قائم رکھنے میں مانع ہیں "ایک سید ھے سادھے یہودی کے لیے اس بات کی ممانعت ہے کہ وہ کسی ایسی شئے کو خریدے جو بُت پرستی سے کچھ تعلق رکھتی ہو۔ تہواروں کے تین دن پہلے سے ہی کافروں کے ساتھ کاروبار نہ کرے۔ انھیں نہ تو روپیہ قرض پر دے اور نہ زمین یا مکانات ہی کرایہ پر دے جوزفس کہتا ہے کہ یہودیوں نے کبھی بھی بین الاقوامی تجارت کا میلان ظاہر نہیں کیا"[۲]

یہودیوں میں ابتدا ہی سے اونچ نیچ اور دولت کے امتیازات پائے جاتے ہیں چنانچہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب طالوت نامی ایک غریب شخص کو اسکی لیاقت اور وجاہت کی بناء پر حکومت عطا کی گئی تو یہی سوال اٹھایا گیا کہ

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۔

انھوں نے کہا کہ وہ کس طرح ہم پر بادشاہت کر سکتا ہے؟ اور ہم زیادہ حقدار ہیں اور اس کو کچھ مالی وسعت بھی تو نہیں دی گئی۔

پ ۲۔ البقرہ ع ۱۶

اشیاء سے عدم افادیت گو یہودیت میں عیسائیت، برہمنیت اور بدھ مت کی طرح رہبانیت کی تعلیم تو نہیں دی گئی ہے تاہم یہودی مذہب کا جو موجودہ نظام ہے، اس کی بنیاد پر دنیا کی اکثر چیزوں کی عدم افادیت کا نتیجہ خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ یہاں ہم دو چار مثالیں توضیحاً پیش کرتے ہیں۔ مثلاً "تیرے گائے، بیل، بھیڑ بکری کے پہلے جو نر بچے پیدا ہوں ان سب کو خداوند اپنے خدا کے لیے مخصوص کر دے۔ تو اپنے بیل کے پہلے بچے سے کام نہ لے

۱۔ یوحنا کی انجیل باب نمبر ۹۔

۲۔ کرسچیانٹی اینڈ اکنامکس صفحہ (۱۱)۔

اور نہ اپنی بھیڑ کے پہلے بچے کے بال کترے[1]" اپنے تاکستان میں کئی طرح کے بیج نہ بو ایسا نہ ہو کہ تیرے بوئے ہوئے بیج کی پیداوار اور تاکستان کا حاصل دونوں ناپاک ہو جائیں[2]" تو مختلف بناوٹوں کا کپڑا جیسے اون اور مخمل ملا ہوا مت پہن[3]"

"اگر کوئی بیل کسی مرد یا عورت کو سینگ چبھو دے جس سے وہ مر جائے تو وہ بیل سنگسار کیا جائے، لیکن اس کا گوشت نہ کھایا جائے[4]"

یہودی سور کے علاوہ اونٹ اور خرگوش کا گوشت بھی نہیں کھاتے، اس کے ماسوا بیل بھیڑ بکری کی چربی بھی استعمال نہیں کرتے[5] چربی و گوشت کے عدم استعمال سے صرف معاشی نقطۂ نظر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس محلے میں فقط یہودی ہی یہودی آباد ہوں گے وہاں ان اشیا کی نہ تو خرید و فروخت ہو گی اور نہ ان کی دکانیں نظر آئیں گی۔

گناہوں کے کفارہ میں بیل، بھیڑ بکری یا ان کی عدم دستیابی میں کبوتر وغیرہ کو جلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کو ان کے ہاں جلانے کی بھینٹ، گناہوں کی بھینٹ وغیرہ کہا جاتا ہے[6] مذہبی حیثیت سے تو ہمیں بحث نہیں البتہ ایک معاشی ہی کہے گا کہ بجائے جلانے کے محتاجوں میں تقسیم کیجئے۔

نوکروں غلاموں کے ساتھ برتاؤ یہودیوں کے ہاں نوکروں اور غلاموں کے ساتھ بھی برتاؤ سخت ہے۔ بائبل کی دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:-

"اگر غلام کے آقا نے اسے ایک بیوی دی اور اس عورت کے بطن سے لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوں تو بچے اور اس غلام کی بیوی مالک کی ملک ہو جائے گی اور غلام اپنا راستہ لیگا۔ لیکن اگر وہ کہے کہ میں اپنے آقا، اپنی بیوی اور بچوں سے محبت

---

[1] بائبل استثنا باب ۱۵ نمبر (۱۹)۔ [2] بائبل استثنا باب ۲۲ نمبر ۹

[3] بائبل استثنار باب ۲۲ نمبر ۹۔ [4] بائبل ہجرت باب ۲۱ نمبر ۲۸

[5] بائبل استثنار باب ۱۴ نمبر ۷ ملاحظہ ہو۔

[6] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو لاوی ٹی کس باب ۴ نمبر ۲۱ نیز باب ۵ نمبر ۳۷ نیز باب ۱۲ نمبر ۸

کرتا ہوں تو اس صورت میں وہ اس کو ججوں کے پاس لے جائے اور اس کو دروازہ یا دروازے کی چوکھٹ کے قریب لے جائے اور اس کے کان میں سوا چھید کر اس کو دروازے میں ٹھکسا دے کہ وہ اس طرح ہمیشہ اس کی خدمت کرے[1]"

اسی طرح "اگر آقا اپنے خادم (سرونٹ) یا خادمہ کو ایک ڈنڈا رسید کرے اور وہ اسی وقت مر جائے تو اس کو سزا دی جائے گی لیکن اگر ایک دن یا دو دن زندہ رہے تو اس کو سزا نہ دی جائے گی کیونکہ وہ اس کا مال ہے[2]"

یہودی ایک سرمایہ دار ساہوکاروں کی قوم ہے" اور تو بہت سی قوموں کو قرض دیگا پر تو ان سے قرض نہ لے گا اور تو بہت سے گروہوں پر بادشاہت کرے گا وہ تجھ پر بادشاہت نہ کریں گے[3]" یہودیوں میں بادشاہت تو نہیں رہی البتہ اپنے سودی کاروبار کی وجہ سے تمام دنیا میں ضرب المثل بنے ہوئے ہیں اور خود حضرت موسیٰ کے الفاظ صادق آرہے ہیں" اور تو ان سب قوموں میں جہاں جہاں خداوند تجھے لے جائیگا حیرانی کا باعث، ضرب المثل اور لعن طعن کا نشانہ ہوگا[4]" اور اب فلسطین کے ایک ٹکڑے پر جو یہودی مملکت قائم ہوئی ہے وہ خود قوم کی ذاتی قابلیت سے بڑھ کر "حبل من اللّٰہ وحبل من الناس" کی مصداق ہے۔

ب۔ عیسائیت

واضح ہو کہ موجودہ عیسائیت کو حضرت مسیحؑ سے بہت دور کا تعلق ہے موجودہ مذہب اور عقائد تو سینٹ پال کے تخیلات ہیں۔ سینٹ پال نے تو حضرت مسیح کو دیکھا اور نہ ان سے کوئی استفادہ کیا۔ ابتدا میں سینٹ پال تو خود اس وقت کے

۱۔ بائبل ہجرت باب ۲۱ نمبر ۴ تا ۶۔

۲۔ بائبل ہجرت باب ۲۱ نمبر ۲۱ تا ۲۲

۳۔ بائبل استثناء باب ۱۵ نمبر ۶۔

۴۔ بائبل استثناء باب ۲۸ نمبر ۳۷۔

مختصر سے عیسائی گروہ ہر ستم ڈھانے میں پیش پیش تھے بعد میں چلکر عیسائیت اختیار کر لی۔"

"ان کا نام پہلے سال تھا عیسائیت اختیار کرنے کے بعد پال اپنا نام رکھ لیا۔"

"سینٹ پال اس زمانے کی یہودیت، ایران کی آتش پرستی، اور اسکندریہ کے مذہب سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے ان مذاہب کے بہت سے عقائد اور تصورات انجیل مقدس کے مذہب میں خلط ملط کر دیے اور دنیا میں اس کو عیسائیت کے نام سے پیش کیا۔"[1]

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی غرض سینٹ پال کی عیسائیت ایک ایسا نظام پیش کرتی ہے جس کو اس دنیا سے کچھ سروکار نہیں ہے "سینٹ پال خدائی سلطنت کی تلاش میں بھوک پیاس فقر و فاقہ محنت مشقت، شب بیداری، سردی اور برہنگی کو برداشت کرتا تھا۔[2] کیونکہ "عیسائیوں کے ہاں جسم کی خواہش روح کے مخالف ہے اور روح کی خواہش جسم کی، اور یہ ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔"[3]

انجیل والے تو ساری دنیا میں یہی منادی کرتے پھرتے ہیں کہ "دولت مند کا آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا اس سے آسان ہے کہ ایک دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔"[4] اور جب کلیسائی سدھار ہوا تب بھی ان میں کوئی معتدبہ فرق پیدا نہ ہوا کہ خود سدھار کے بانی لوتھر کے نزدیک معیشت کی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہ تھی۔ ایک جگہ کہتا ہے "اللہ میاں معمولاً دولت انھیں ٹھیٹ گدھوں کو

---

[1] ایچ جی ویلز: اے شارٹ ہسٹری آف دی ورلڈ صفحہ ۱۴۴ پلیکن سیریز۔

[2] انجیل، پولوس کا دوسرا خط قرنتیوں کو باب ۱۱ نمبر ۲۷ ملاحظہ ہو۔

[3] انجیل، پولوس کا خط گلاتیوں کو باب ۵ نمبر ۱۷۔

[4] انجیل متی باب ۱۹ نمبر ۲۳ و ۲۴ نیز انجیل مرقس باب ۱۰ نمبر ۲۴ و ۲۵ نیز انجیل لوقا باب ۱۸ نمبر ۲۵۔

دیتے ہیں جنھیں وہ کچھ اور ارزانی نہیں فرماتے ہیں[1]

"کلیسائی حلقوں میں بہت دنوں تک تجارت سے مخالفت کی رو جاری رہی بنیادی تصور یہ تھا کہ ہر قسم کی منفعت کو سود یا خانگی بیاج قرار دیا جائے۔۔۔"

"بعض مولفوں نے نہایت بیرحمانہ شدت کے ساتھ اس نظریہ کو ترقی دی کہ معاملہ کاروبار چاہے کسی قسم کا ہو ناجائز ہے۔ تیرھویں صدی (عیسوی) کے ابتدائی سالوں کی تالیف میں ہر تاجر کو سود خوار قرار دیا گیا ہے اور ہر مالدار تاجر کے بیٹے کے متعلق یہ تصور کر لیا جاتا تھا کہ وہ مال حرام پر جی رہا ہے۔ اس کتاب کا مولف روبیرڈ کورسون ہے، جو نوآیوں کا صدر پادری تھا۔ پھر کارڈینل بنا بظاہر ایک انگریز معلوم ہوتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اس برائی کا ایک علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج یہ ہے کہ ایک عمومی مجلس شوریٰ مذہبی منعقد ہو، جہاں اسقف اور حکمراں یہ فیصلہ کریں کہ ہر قسم کی ثروت کو بلکہ تمام زائد از استعمال چیزوں کو ممنوع قرار دیا جائے، اور عیسائی دنیا میں یا تو پادری زندہ رہیں، یا تنخواہ یاب نوکر جن میں سے ایک طبقہ اپنی روحانی خدمات کے معاوضہ پر بسر بود کرے تو دوسرا کشوری خدمات کی تنخواہ پر جیے"[2]

غرض عیسائیوں کے ہاں تجارتی اور ہر طرح کا کاروبار عرصہ تک حرام رہا۔ رفتہ رفتہ ضروریات زندگی گیہوں اور پھر شراب وغیرہ کی اجازت ملی "اکوئنیاس کے سینٹ ٹامس نے ان زیادتیوں کا ردعمل کیا۔ چنانچہ اس کی نظروں میں اگرچہ تجارت میں بذات خود ایک حد تک نفرت آمیز عنصر پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اسے اصولاً کوئی دیانتدارانہ مقصد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بلکہ وہ محض ایک انفرادی نفع اندوزی ہے لیکن بہرحال اس ممتاز ہستی نے یہ تسلیم کر لیا کہ تجارت کے ذریعے سے جو نفع حاصل ہو وہ کسی جائز مقصد کے تحت بھی ہو سکتا ہے اور اس

1۔ منہاج و مقصد از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صفحہ ۱۸۔

2۔ جدید قانون بین الممالک کا آغاز موفوار نست منس باب ۶ صفحہ ۲۸۰ مترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پروفیسر قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ۔

صورت میں تجارت جائز ہو جائے گی۔ اب دوسرے مولف اس کی پیروی کرنے لگے چنانچہ گیہوں، شراب اور دیگر تمام ضروریات زندگی کی تجارت کو پسندیدہ قرار دیا گیا۔ شرط صرف یہ رہی کہ نفع معتدل ہو۔[1]

اسی طرح بجائے تعیشات کے محض لابدی ضروریات پر قناعت کرنے کی تعلیم کلبی مکاتب خیال والے فلسفہ دانوں کی طرف سے تاریخ کے مختلف ادوار میں دنیا کے سامنے پیش کی گئی۔

ذات پات، بھائی چارہ

حضرت عیسیٰؑ نے اپنے زمانے میں "خدا کی بادشاہت" اور "انسان کی برادری" کا نظریہ پیش کیا۔ لیکن خود انجیل ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بھائی چارہ کا دائرہ خاص بنی اسرائیل کے لوگوں کے لیے ہی محدود تھا چنانچہ "ان بارھوں کو حضرت یسوع نے یہ فرما کر بھیجا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ بنو اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ"[2] اور ایک جگہ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں کہ "میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"[3]

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی طرف بعض عجیب و غریب کلمات بھی منسوب کیئے ہیں کہ "یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا ہوں صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں آدمی کو اس کے باپ اور بیٹی کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کرنے آیا ہوں"[4]

عملی حیثیت سے بھی عیسائیت کے بھائی چارہ کا دائرہ محدود ہے۔ جو لوگ عملی مشاہدہ کرنا چاہیں ان کے لیے بھی خاصے نظائر موجود ہیں کہ عیسائی اگر وہ یورپی ہے تو اس کا گرجا علیحدہ ہے اور غیر یورپی اقوام کے گرجا علیحدہ اور ہندوستان میں کوئی

---

[1] - جدید قانون بین الممالک کا آغاز مونوارنیست منس باب ۲ صفحہ ۲۰ مترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پروفیسر قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ۔

[2] - انجیل متی باب ۱۰ نمبر ۵۔ [3] - انجیل متی باب ۱۵ نمبر ۲۴۔

[4] - انجیل متی باب ۱۰ نمبر ۳۴ : ۳۵۔

ہندو عیسائیت قبول کرے تو اس کے بعد بھی اس کے ساتھ ذات پات کا تفرقہ، نیچ قوم اور اعلیٰ ذات کا امتیاز، گرجا کی کرسیوں تک پر برقرار رہتا ہے۔

عملی مشاہدے سے ہٹ کر بھی جو لوگ انسائیکلو پیڈیا یا سلطنتوں کے دساتیر میں نسلی امتیازات دیکھنا چاہیں تو اس کی بھی کمی نہیں ہے۔ مارشل اسموٹس نے ایک مرتبہ انگلستان میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ " کالے اور گورے نہ صرف رنگ میں مختلف ہیں۔ بلکہ دماغ میں بھی مختلف ہیں"[۱] نیز مارشل موصوف نے یہ بھی کہا کہ " بجائے اس کے کہ گوروں اور کالوں کو ملایا جائے جیسا کہ ہم نے کیا ہے اور ہر چیز میں ابتری پھیلائی ہے اور اس طرح کالوں کو سرفراز نہیں کیا بلکہ گوروں کا درجہ گھٹایا ہے، حتی الامکان اب ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ انھیں اپنے اداروں سے، زمین کی ملکیت سے حکومتی انتظام سے اور دیگر گوناگوں حیثیتوں سے علٰحدہ رکھا جائے، ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کو علٰحدہ رکھا جائے اس طرح ہم ایک ایسی پالیسی کی بنیاد رکھ رہے ہیں جو روبہ عمل ہونے میں ایک سو سال لیگی"[۲]۔۔

ممالک متحدہ امریکہ میں بھی " کلیسا اور حکومت میں گورے اور کالے کے درمیان مساوات نہیں برتی جاتی " نہ صرف یہ بلکہ " رنگ کا امتیاز ہر ایک پیشے اور نوکری میں کیا جاتا ہے"[۳]

خود یورپ میں جہاں صرف گورے ہی گورے آباد ہیں نسلی امتیازات زور و شور سے کارفرما ہیں " عیسائیت جنگوں کو روکنے یا رقیب اقوام کو متحد کرنے میں ناکام ہوئی ہے ...... گزشتہ پانچسو سال سے عیسائیت کی تاریخ ایک غم آلود داستان ہے یہ نہ صرف مختلف برسرپیکار اقوام کو متحد کرنے میں ناکام رہی بلکہ خود عیسائی چرچ کے اندر تفرقہ پڑ گیا"[۴]

۱۔ لارڈ اسٹامپ: کرسچیانٹی اینڈ اکنامکس باب ۲ صفحہ ۸۔
۲۔ لارڈ اسٹامپ: کرسچیانٹی اینڈ اکنامکس باب ۲ صفحہ ۸۔
۳۔ ایضاً بحوالہ دی لسنر مورخہ ۱۷؍ اپریل ۱۹۳۰ء المر کارٹر کا مضمون " ہاؤ امریکہ ٹریٹس دی نگرو "
۴۔ ہالی لینڈ: ہسٹری آف سیولیزیشن باب ۳ صفحہ ۸۰۔

ان سماجی تحدیدات کا مضر اثر معاشی کاروبار پر پڑنا لامحالہ ضروری ہے۔

نوکروں، غلاموں کے ساتھ برتاؤ

عیسائیوں میں نوکروں کے ساتھ برہمنیت اور یہودیت کی طرح بُرا برتاؤ تو نہیں لیکن "نوکر اس قابل بھی نہیں کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے[1]"

غلاموں کو آزاد کرنے کی بابت انجیل خاموش ہے بلکہ عیسائیت کے آنے پر غلاموں کی حالت یورپ میں پہلے سے بھی بدتر و ابتر ہوگئی[2]

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے کہ "کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی" اور رہبانی مذہب میں پیشے وغیرہ مفقود ہوتے ہیں۔ خدائی سلطنت کی تلاش میں گھر بار، بیوی بچے، اور پیشہ کو تک چھوڑ دینا ضروری ہے" پھر اس نے دوسرے سے کہا کہ میرے پیچھے ہولے، لیکن اس نے کہا کہ اے خداوند! مجھے اجازت دے کہ پہلے جاکر اپنے باپ کو دفن کروں، پر یسوع نے اس سے کہا کہ مُردوں کو اپنے مردے گاڑنے دے پر تو جاکر خدا کی بادشاہت کی خبر سنا، اور دوسرے نے کہا کہ اے خداوند! میں تیرے پیچھے آؤں گا لیکن پہلے مجھے اجازت دے کہ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو آؤں۔ اس پر یسوع نے اس سے کہا کہ جو کوئی اپنا ہاتھ ہل پر رکھکر پیچھے دیکھتا ہے وہ خدا کی بادشاہت کے لایق نہیں ہے[3]

عیسائیت میں کسی معاشی نظام کا فقدان۔

افسوس کہ حضرت عیسیٰؑ کو مہلت ہی نہ ملی اور ڈھائی سال کی مدت پریشانیوں سے گزری یہ کہتے ہوئے آپ دنیا سے ناکام ہی سدھارے کہ "میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنے "سچائی کی روح" آئیگی تو تمھیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی کیونکہ وہ اپنی نہ کہے گی، بلکہ جو کچھ سنے گی سو کہے گی[4]"

---

[1] تفصیل کے لیے انجیل لوقا باب ۱۷ نمبر ۷ تا ۹ ملاحظہ ہو۔ [2] رومی اور اسلامی ادارہ غلامی از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب۔ [3] لوقا باب ۹ نمبر ۵۹ تا ۶۲۔

[4] یوحنا انجیل باب ۱۶ نمبر ۱۲ و ۱۳۔ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ۔ (قرآن سورۂ نجم)

"پر اب اس پاس جس نے مجھے بھیجا ہے جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے؟ بلکہ اس لیے کہ میں نے تمھیں یہ باتیں کہیں تمھارا دل غم سے بھر گیا لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا ہی تمھارے لیے فائدہ مند ہے میں اگر نہ جاؤں تو تسلی دینے والا تمھارے پاس نہ آئے گا۔ پر اگر جاؤں تو اسے تمھارے پاس بھیج دونگا"[1]

آنجہانی لارڈ اسٹامپ نے اپنی کتاب "عیسائیت اور معاشیات" میں لکھا ہے کہ "معاشی امور میں انجیل سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش عموماً ناکام رہی ہے۔ عیسائیوں کی مذہبی کتاب کسی خاص معاشی نظام یا سیاسی جماعت یا معاشی زندگی کے لیے کسی لائحۂ عمل کو پیش نہیں کرتی"[2]

غرض برہمنیت، بدھ مت، اور عیسائیت وغیرہ نے معاشی مشکلات کے حل کی جو راہ بتائی ہے، ان سب پر غور کیا جائے تو یہ بات ہویدا ہوتی ہے کہ ان کا علاج " مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مصداق ہے۔

انھوں نے دنیا کو معاشی مشکلات سے نکالنے کی یہ تدبیر پیش کی کہ باہر اگر سلجھ نہیں سکتا تو آدمی اپنے اندر ہی کو سلجھائے گویا ان لوگوں نے ؎

مجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

کی راہ پر خود چلنا چاہا اور دوسروں کو بھی چلانے کی ناکام کوشش کی۔

تیسری فصل اسلام

مختلف مذاہب کے تعلق سے معاشی نظام کی ضروری توضیح گزشتہ دو فصلوں میں پیش کر دی گئی ہے۔ اس فصل میں اسلام کے چند بنیادی اصول کی توضیح پیش نظر ہے

---

[1] انجیل یوحنا باب ۱۶ نمبر ۵ تا ۷ [2] لارڈ اسٹامپ، کرسچیانٹی اینڈ اکنامکس باب ۵

تاکہ آئندہ ابواب میں اسلامی نظم معیشت کی جو تصویر ہم کھینچیں گے اس کا حقیقی پس منظر نگاہ میں رہے۔

معاشی نقطۂ نظر سے اسلامی معاشرہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "لَا رُهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ" اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔

قرآن مجید اس غیر فطری نظریہ کے متعلق جس کی تعبیر اس نے "رہبانیت" کے لفظ سے کی، اس واقعی ناقابل انکار حقیقت کا اعلان کیا کہ

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔ قرآن پ ۲۷ الحدید، ع ۴

ترجمہ:۔ ترک دنیا کو انھوں نے تراش لیا۔ ہم نے اس کو ان پر فرض نہ کیا تھا۔ صرف خدا کی رضامندی طلب کی تھی، انھوں نے اس کی رعایت ملحوظ نہ رکھی۔

اس طرح قرآن مجید نے رہبانیت کو اختراعی اور من گھڑت قرار دیا ہے، اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ انسانی فطرت کی یہ قدرتی راہ نہیں ہے، اور نہ قدرت نے آدمی کو اس جبلت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور نہ ہی اس سے کسی زمانے میں کبھی اس کا مطالبہ کیا گیا۔

مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ۔ ترجمہ۔ ہم نے اس کو ان پر فرض نہ کیا تھا۔

کے مختصر سے الفاظ میں یہ واقعہ ہے کہ اس نظریہ کی پوری تاریخ پوشیدہ ہے یعنے آج ہی نہیں بلکہ کسی زمانے میں، کسی ملک، کسی قوم سے خدا نے اپنے کسی سچے پیغمبر، کسی ہادی کسی اوتار کے ذریعے سے اس مسلک پر چلنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس سے پہلے "ابْتَدَعُوهَا" (انھوں نے تراش لیا) سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے انتہاپسندوں نے بقول شخصے وہی کیا جو زاہد کے متعلق کہا گیا ہے کہ ؎

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رُخاں
کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

(قتیل)

اس کے سوا بھی رہبانیت، جوگیت، بھکشویت، اور کلبیت وغیرہ کے پردہ میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ

كَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ۔ ان میں اکثر فاسق ہیں۔

کی حقیقی عملی تفسیر ہے۔

خلاصہ یہ کہ اکثریت اور وہ بھی اتنی بڑی اکثریت کے لیے اندر کا یہ "آپریشن" صرف ناکام ہی نہیں بلکہ آخر کار سخت مضر ثابت ہوا۔

معاشی مشکلات کا غلط اور غیر فطری علاج جو گویا قدرت سے جنگ کے مترادف ہے، اس کا انجام بہر حال وہی ہوتا ہے جو غیر طبعی کشمکش کا ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید کے معاشی نظام کا اصول

قرآن مجید نے مذکورۂ بالا طریقے کو مسترد کر کے جو معاشی نظام پیش کیا ہے اب ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ قرآنی الفاظ میں انسان لالچی اور بے صبر پیدا کیا گیا ہے۔

خُلِقَ الانسانُ ھَلُوعاً — انسان سخت لالچی اور بے صبر پیدا کیا گیا ہے۔

پ۲۹ المعارج۔ ر۱

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ	لوگوں میں عورتوں، بچوں، سونے چاندی کے ڈھیر
وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَۃِ مِنَ الذَّھَبِ	سدھائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی سے
وَالْفِضَّۃِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ وَالْاَنْعَامِ	محبت کرنے کی خواہش آراستہ کی گئی۔
وَالْحَرْثِ۔ پ۳ آل عمران ر۲	

مطلب یہ کہ انسان سونے چاندی کے ڈھیر کا دلدادہ ہے۔ اسی طرح عمدہ گھوڑے اچھی سواریاں، مویشی، کھیت، باغ وغیرہ کی چاہت اس میں پائی جاتی ہے اور ان کی تلاش و جستجو کا جذبہ اس پر مسلط رہتا ہے۔ قرآن مجید نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کیا ہے کہ یہ خود ساختہ خواہش یا اختیاری میلانات نہیں بلکہ جس نے انسان کو پیدا کیا اس نے اس کی فطرت کو بھی پیدا کیا ہے۔ اور اسی نے اس میں اشیاء کی طلب اور چاہت بھی پیدا کی ہے[۵]۔

اگر ایک طرف قرآن اس حقیقت کو آشکارا کرتا ہے تو وہ دوسری طرف

۵۔ اس کی مزید توضیح آئندہ "پیدائش دولت کے باب" میں آئیگی۔

بجائے اس کے کہ وہ ان جذبات اور خواہشات کی حوصلہ شکنی کرے وہ سونا چاندی ہی نہیں بلکہ جس کے پیٹ سے سونا چاندی اور دیگر ساری چیزیں نکلتی ہیں یعنی خود زمین ہی کے اس کرہ کو اٹھا کر آدمی کے دامن میں یہ کہہ کر ڈال دیتا ہے

خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ — خدا ہی نے تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے پیدا کیا۔

پ البقرہ ۲ غ ۳

غرض قرآن سے پہلے "مذہب" اس کا نام تھا کہ زمین اور زمین کی پیداوار سے آدمی جہاں تک دور بھاگ سکتا ہو، بھاگے لیکن قرآن پاک جس مذہب کو پیش کرتا ہے وہ کھلے لفظوں میں اپنے ماننے والوں پر یہ فریضہ عاید کرتا ہے کہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے جب تک اس کے ہر ہر چیز کے متعلق یہ نہ ثابت کریں کہ وہ انسان کی کس ضرورت میں کام آتی ہے، ان کی آسمانی کتاب کی تفسیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

اسی پر بس نہیں۔ قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" [۱] گویا کارخانۂ قدرت میں کوئی چیز بے کار پیدا نہیں کی گئی۔ ہے بلکہ دنیا کا ہر ایک ذرہ کسی نہ کسی کام کو انجام دینے کے لیے پابند ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمیں عالم ہستی میں سینکڑوں چیزیں بے کار نظر آتی ہیں اور ان کے وجود کا کوئی فائدہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن اگر ہم کسی شئے کے فوائد سے ناواقف ہوں تو یہ ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ چیز درحقیقت بے کار ہے۔ قدرت کے نزدیک اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہے [۲]

اس روشنی میں قرآن کی تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو قرآن یہ نہیں کہتا کہ یہ سب کچھ تمہارے سامنے اس لیے پھیلایا گیا کہ دیکھا جائے کہ تم اس سے کس حد تک بھاگتے ہو۔ علامہ اقبال نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "اسلام کی روح مادہ کے قرب سے نہیں ڈرتی" [۳] قرآن کا ارشاد ہے کہ

لَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا — تمہارا دنیا میں جو حصہ ہے اس کو نہ بھول جاؤ۔

---

[۱] پ ۴ آل عمران ع ۲۰ — [۲] اصول معاشیات از پروفیسر حبیب الرحمن صفحہ ۸ افادہ
[۳] اخبار مملکت حیدرآباد جلد ۲ نمبر ۱۴ مورخہ ۷ ر صفر ۱۳۶۲ھ م ۱۳ ر فروری ۱۹۴۳ء۔

اور زمین ہی کیا قرآن پاک پڑھتے جاؤ وہ بڑھتا ہی چلا جائیگا اور ہر وہ چیز جس پر قبضہ و تسلط کا آدمی خواہش مند ہے وہ اس کے قدموں پر ڈالتا چلا جائیگا اور اس سلسلے کی ہمہ گیری اور وسعت دامانی کی آخری حد یہ ہے کہ

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ پ۲۵ الجاثیہ ۲ع ۱۳ — اور تمہارے ہی لیے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے مسخر کیا۔

آیت بالا کے ذریعے سے تو اس نے زمین ہی کو کیا عالم محسوس کے پورے نظام کو انسانی خواہشات یا "ھلوعیت" کی خوراک بنا کر اس کے سامنے پھینک دیا ہے کہ زمین بھی تیری ہے، آسمان بھی تیرا ہے، ہوا بھی تیری ہے، پانی بھی تیرا ہے، چاند بھی تیرا ہے، سورج بھی تیرا ہے، تارے بھی تیرے ہیں غرض

سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ۔ پ۱۳ ابراہیم ۱۱ع — آفتاب و ماہتاب کو تمہارے لیے مسخر کیا۔

اسلام کی جامعیت

حاصل کلام یہ کہ اسلام نے دین و دنیا میں کوئی ایسی متصادم و تفریق قایم نہیں کی کہ دینداری میں دنیا ممنوع قرار پائے بلکہ انسان کی کامل ترقی میں دونوں کو جمع کرنا سکھایا چنانچہ قرآن کریم میں یہ دعا تلقین کی گئی کہ

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ پ۲ البقرہ ع — اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں نعمت عطا کر اور آخرت میں بھی نعمت عطا کر اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

تاہم انسان کی ایک خصوصیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ کہ بعض لوگ فطرۃً اس درجہ عبادت گزار ہوتے ہیں کہ دنیا سے ان کا دل بہت کم لگتا ہے، لیکن ان کی عبادت گزاری بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اخلاص سے مملو ہو۔ چنانچہ اسلام نے ایسے عبادت گزاروں کی بھی گنجائش رکھی ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک بلکہ حسن صحبت کی تاکید لکھی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ — جو لوگ کہ اپنے پروردگار سے صبح و شام مناجات کیا کرتے ہیں اور اسی کی ذات کے طالب ہیں انہیں تم اپنے پاس سے دور نہ کرو

شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ۔
پ انعام ۶ ع

نہ تو تم پر ان کا کچھ محاسبہ ہے اور نہ تمھارا کچھ محاسبہ ان پر ہے۔ پس اگر تم اپنے پاس سے دور کردوگے تو تم ظالموں سے ہو جاؤگے۔

نیز ارشاد ہوتا ہے کہ

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔
پ الکہف ۱۸ ع

تم اپنی ذات کو ان لوگوں کے ہمراہ رکھو جو صبح و شام اپنے پروردگار کو یاد کرتے ہیں اور اسی کی رضامندی چاہتے ہیں اور تمھاری آنکھیں ان کی طرف سے نہ پھیریں کہ تم صرف دنیا کی آرائش چاہنے لگو۔

منشا یہ ہے کہ دنیا داری میں اس درجہ مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ عبادت اور عبادت گزاروں سے غفلت یا مغائرت ہو جائے، بلکہ صحیح مسلک یہ ہے کہ انسان

رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ۔ پ النور ۲۴ ع

وہ لوگ جنھیں خرید و فروخت اور تجارت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

کا مصداق ہو جائے۔ چنانچہ عبادت گزاری میں قاعدین (بیٹھ رہنے والے) بھی قابل تعظیم و تکریم قرار دیے گئے ہیں تاہم مجاہدین کو ان پر فضیلت حاصل ہے کہ

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا۔
پ النساء ۴ ع

معذور لوگوں کے سوا جہاد کو چھوڑ کر گھر میں بیٹھ رہنے والے مسلمان اور راہ خدا میں جان و مال سے جہاد کرنے والے مسلمان رتبہ میں برابر نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے بیٹھ رہنے والوں پر ان لوگوں کو جو اپنی جان و مال سے جہاد کرتے ہیں رتبے میں بزرگی عطا فرمائی ہے۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی شان ہے

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
پ الاحزاب ۳ ع

بے شک تمھارے لئے رسول اللہ (کے طریقہ) میں ایک عمدہ پیروی ہے۔

روحی فداہ ان کا تو یہ مقام ہے کہ دل بیاد دوست بکار

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا۔
پ۲۹ المزمل ۳، ع

بے شک تمھیں دن میں بہت کام رہتا ہے تم اپنے پروردگار کا نام یاد کرو اور اسی کی طرف لو لگاؤ جو مشرق کا بھی پروردگار ہے اور مغرب کا بھی۔ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔

یہ تو ہوا اسلامی نظام معاشیات کا بنیادی اور اساسی اصول۔ لیکن اسلامی معاشی تنظیم میں اسلام کے چند دوسرے اساسی اصولوں کا بھی بہت ہی نمایاں اور عمیق ترین اثر روز روشن کی طرح صاف طور سے نظر آتا ہے۔ ان سے آگاہی اسلامی نظام معاشیات کے مطالعے کے لیے بہت ہی ضروری ہے۔ ذیل میں ان اساسی اصولوں کی صراحت کی جاتی ہے۔ لیکن اس سے قبل عرب قبل از اسلام میں بھائی چارہ کے اصول کے بارے میں جو عمل تھا اس کی توضیح نامناسب نہ ہوگی۔

اس پس منظر کے ساتھ اب اسلام کے انقلاب کو بھی دیکھیے۔

اخوت! اس مقالے کے گزشتہ باب میں اس بات کی کافی توضیح ہو چکی ہے کہ عرب کے قبیلہ قبیلہ میں باہمی تفریق اور اختلاف نے معاشرہ کو کس طرح پراگندہ کر دیا تھا۔ لڑنا ان کا وتیرا اور مارکٹائی ان کا شیوا تھا۔ اس کے برخلاف اسلام نے اخوت اور بھائی چارہ کی جو تعلیم دی اس کی دل آویزی آج بھی بجنسہٖ قائم ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ پ۲۶ حجرات ۱۳، ع   تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

دل آویز صدا بلند کر کے جو انقلاب پیدا کیا گیا وہ کوئی خونی ہولی کے بعد پیدا نہیں ہوا۔ مندرجۂ ذیل آیت پر غور کیجیے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا۔   پ۴ آل عمران ۱۱، ع

سب مل کر مضبوطی سے اللہ کی رسی پکڑے رہو، اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہو۔ تم پر خدا کا جو احسان ہے اسے یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر تمھارے دلوں میں الفت پیدا کی کہ اس کی عنایت سے بھائی بھائی ہو گئے۔

مورخ طبری اپنی تفسیر میں آیت مذکورۂ بالا کی یوں تشریح کرتے ہیں۔ کہ "اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے، اور ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور تمہارا طاقتور کمزور کو کھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اسلام آیا اور تم میں الفت پیدا کی۔ اور تمہارے گروہ کو اکٹھا کیا اور تمھیں ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔"[1] اور اپنی تاریخ میں یوں تبصرہ کرتے ہیں کہ "وراثتاً عداوت بدستور چلی آتی تھی، یہ کشیدگیاں اسلام کے شایع ہونے تک برقرار رہیں، مگر اللہ نے ان سب عداوتوں کا خاتمہ کر دیا۔"[2]

یہ تو قرآنی آیتوں سے استدلال تھا۔ اس کے ساتھ خود پیغمبر اسلام کے اقوال بھی موجود ہیں چنانچہ ایک مرتبہ یہ ارشاد فرمایا کہ

"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے مثل ایک عمارت کے ہے جس کا بعض حصہ بعض حصے کو تقویت دیتا ہے۔"

یہ کہکر آپ نے اپنی انگلیوں میں تشبیک فرمائی۔ یعنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیں کہ اس طرح قوت دیتا ہے۔[3]

حجۃ الوداع کے یادگار موقع پر آنحضرتؐ نے جس "منشور حقوق" کا اعلان فرمایا اس کا اختتام ان الفاظ پر ہوا تھا کہ

"اچھی طرح سمجھ لو کہ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی کے لیے اپنے بھائی کی کوئی چیز زبردستی لینی جائز نہیں سوا اس کے کہ وہ خود اپنی مرضی سے دیدے اپنے اوپر ظلم نہ کرنا۔ آگاہ ہو جاؤ میں نے اپنا پیغام پہنچا دیا۔"[4]

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسلام میں جغرافی حدود نہیں ہیں۔ اسلام

---

[1] ۔ تفسیر طبری الجزء الرابع صفحہ ۳۲ آیت: واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء
[2] ۔ تاریخ طبری۔ [3] ۔ بخاری
[4] ۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۷۵۵، ۱۰ھ کے واقعات

ان کو اضافی قرار دیتا ہے، کیونکہ یہ آئے دن تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح اسلام میں رنگ و نسل کا امتیاز نہیں ہے، غرض اسلام بین الاقوامیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے رسالت مآبؐ نے اعلان فرمادیا کہ

"میں شہادت دیتا ہوں کہ سارے انسان بھائی بھائی ہیں"[1]

خود رسول کریمؐ کی حیاتِ طیبہ میں اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں میں صرف حجازی ہی نہیں تھے یا صرف عرب ہی نہیں تھے بلکہ ان کے سوائے ایرانی بھی تھے، رومی بھی تھے، مصری اور حبشی وغیرہ بھی تھے اور سب مل کر شیر و شکر ہوگئے اور یوں رسول اللہؐ کی زندگی میں ہی اسلام بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

غرض عالمگیر" انسانی برادری قائم کرنے کے سلسلے میں اسلام نے جو اہم کارنامے ایک ہزار سال میں انجام دیے ہیں وہ مسیحیت اور بدھ مت نے دو ہزار سال میں بھی انجام نہیں دیئے۔ یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہندی مسلمان نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود مراکش پہنچ کر بھی اجنبیت محسوس نہیں کرتا"[2]

سر آرتھر کیتھ کی چھوٹی سی کتاب "مسئلہ نسل" میں ایک دلچسپ عبارت ہے جس کا اقتباس پیش کرنا بے محل نہ ہوگا کہ

> "اب انسان میں ایک قسم کا شعور پیدا ہو رہا ہے کہ فطرت کا ابتدائی مقصد یعنی نسل سازی، جدید معاشی دنیا کی ضروریات کے منافی ہے اور وہ اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ کیا نسل سازی کو ختم کر کے جس پر کہ فطرت اب تک عمل پیرا تھی، دائمی امن حاصل کیا جائے؟ یا فطرت کو اجازت دیدی جائے کہ وہ اپنی قدیم راہ اختیار کرے جس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے۔ انسان کو کوئی ایک راہ اختیار کرنی پڑے گی، کوئی درمیانی راستہ ممکن نہیں ہے"[3]

---

[1] ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ۔ [2] مقالہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم بہ حوالہ اخبار "مملکت" مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۴۳ء مطابق ۷ صفر ۱۳۶۲ھ۔ [3] ماخوذ از مقالہ مذکورہ بالا۔

معاشی تعمیر جدید میں بھی بھائی چارہ کی قوت تسلیم کر لی گئی ہے چنانچہ مشہور جاپانی ڈاکٹر کاگاوا نے جنھیں صنعتی اور تجارتی زندگی سے عملی اور نظری واقفیت حاصل ہے لکھا ہے کہ "برادرانہ الفت کے ذریعے صارفین اور پیدا کنندگان کے درمیانی خلیج کو پاٹنا چاہیئے ورنہ معاشرہ کو بچایا نہیں جاسکتا اور کساد بازاری، خوف و ہراس، اور بیروزگاری کا دور دورہ رہیگا"[1]

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ عملی طور سے کیا نمونہ پیش کیا جائیگا۔ مکے سے ہجرت کے موقع پر مدینے میں باہمی اخوت اور مواخاۃ کا جو عملی نمونہ پیش کیا گیا اس نے معاشی تنظیم پر جو اثر ڈالا ہوگا وہ ہر کوئی محسوس کر سکتا ہے۔

مساوات

گزشتہ باب میں واضح کیا گیا کہ قریشی قبائل جو مکے میں آباد تھے خود کو تو سب سے برتر اور دوسروں کو حقیر و کمتر سمجھتے تھے۔ اسی طرح مدینے کی معاشرتی زندگی میں واضح کیا گیا ہے کہ اس چھوٹی سی بستی میں بھی مالدار طبقے کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور نادار طبقے کو حقیر سمجھا جاتا تھا۔ تمام عرب خود کو عرب (فصیح۔ زباں داں) اور غیروں کو عجمی (گونگے) سمجھتے تھے۔

عرب پر ہی کیا منحصر ہے، عرب سے باہر یونان میں "ارسطو یہ کہتا تھا کہ وحشی یعنے غیر یونانی غلام بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس نے سکندر کو یہ مشورہ دیا کہ وہ یونانیوں کا قائد اور وحشیوں کا آقا کہلائے اور اول الذکر کے ساتھ دوستوں اور رشتے داروں کا سا اور ثانی الذکر کے ساتھ درندوں، درختوں کا سا برتاؤ کرے"[2] یہی حال قدیم رومیوں کا تھا۔ قدیم مصریوں کے ہاں پیشہ وروں خصوصاً گلہ بانوں کو حقیر سمجھا جاتا تھا اور وہ ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے، "کیونکہ ہر ایک چرواہا مصریوں کے نزدیک ذلیل سمجھا جاتا تھا"[3]

دوسرے مذاہب کے پیروں میں اونچ نیچ کا جو اصول رواج پا گیا اس کی گزشتہ

---

[1] لارڈ اسٹامپ، کرسچیانٹی اینڈ اکنامکس باب ۳ صفحہ ۸۹۔

[2] ٹوئین: اکنامک لائف آف دی اینشنٹ ورلڈ باب ۱ صفحہ ۸۲۔

[3] توریت پیدائش باب ۴۶ نمبر (۳۴)

فصلوں میں صراحت کر دی گئی ہے لیکن چونکہ آنحضرتؐ نے دعویٰ کیا کہ آپ تمام بنی نوع انسان کی راہ نمائی کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اور خود قرآنی الفاظ یہ ہیں:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

ترجمہ:۔ اے نبی! ہم نے تمھیں تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

پ ۲۲ السباء ۳۴ ع ۳

اس لیے آنحضرت نے اونچ نیچ اور گورے کالے کے فرق کو یہ کہتے ہوئے مٹا دیا کہ "نہ عربی کو عجمی پر فوقیت حاصل ہے، نہ عجمی کو عربی پر کہ تم میں سے ہر ایک آدم سے پیدا ہوا، اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے"[1]

اسلامی قانون میں امیر و غریب سب کو مساوی حیثیت عطا کی گئی ہے، چنانچہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ "قریشی قبیلے کی ایک شاخ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ قریش کو اس کا بہت خیال ہوا اور انھوں نے کہا کہ بجز اسامہ کے کون ہے جو اس بارے میں رسول اللہؐ سے گفتگو کی جرأت کرے؟ کیونکہ وہ رسول اللہؐ کے لاڈلے ہیں۔ چنانچہ اُسامہ بن زید نے حضور اکرمؐ سے اس بارے میں گفتگو کی آپؐ نے فرمایا کہ (اے اُسامہ!) کیا تو خدائی حدود میں سے ایک حد میں سفارش کرتا ہے؟ پھر آپ نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اس بات سے ہلاک ہوئے کہ جب کوئی شریف آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی غریب آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے تھے اور قسم ہے خدا کی! اگر فاطمہؓ محمد کی بیٹی بھی چوری کرے تو محمد اس کا ہاتھ کاٹے"[2]

اسی قسم کے بیسیوں نظائر اسلام کے عہد خیر القرون اور اس کے مابعد زمانہ کی مستند تاریخوں سے پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے واضح ہوگا حکومت کی نظر میں

---

[1] ۔ مسلم۔

[2] ۔ بخاری پ ۲۷ کتاب الحدود و نیز بخاری پ ۱۶ کتاب المغازی، نیز بخاری مناقب اسامہ بن زید بخاری کے علاوہ مسلم ابو داؤد وغیرہ میں بھی یہ حدیث درج ہے۔

ہر شخص کی مساوی حیثیت تھی۔ یہاں ہم ایک اور واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں "جبلہ بن الایہم غسانی شام کا مشہور رئیس بلکہ بادشاہ تھا، اور مسلمان ہو گیا تھا۔ کعبے کے طواف میں اس کی چادر کا گوشہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آگیا جبلہ نے اس کے منہ پر تھپیڑ کھینچ مارا، اس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ جبلہ غصے سے بے تاب ہو گیا اور حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی شکایت سن کر کہا کہ تم نے جو کچھ کیا اس کی سزا پائی اس کو سخت حیرت ہوئی اور کہا کہ "ہم اس رتبہ کے لوگ ہیں کہ کوئی شخص ہمارے ساتھ گستاخی سے پیش آئے تو قتل کا مستحق ہوتا ہے"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا"۔ اس نے کہا کہ اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں شریف و ذلیل کی کچھ تمیز نہیں تو میں اسلام سے باز آتا ہوں غرض وہ چھپ کر قسطنطنیہ چلا گیا لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی خاطر سے قانون انصاف کو بدلنا نہیں چاہا[۱]"

امیر المومنین حضرت عمرؓ فرمایا کرتے "میں بھی تم جیسا ہی ایک فرد ہوں[۲]"۔ مساوات کے اصول نے معاشی نظام پر جو اثر ڈالا وہ تقسیم دولت کے باب ۵ میں بیان ہوگا۔

غرض "اسلام کو یہ جو لاثانی ترقی ہوئی تو اس کی وجہ اسلام کی انقلابی قابلیت تھی، جس نے عامۃ الناس کو اس مایوس کن حالت سے نکال لیا جو نہ صرف یونان و روما بلکہ چین، ایران اور ہندوستان کے قدیم تمدنوں میں پیدا ہو گئی تھی[۳]"

آزادی "اسلام آزادی اور مساوات کے لیے کھڑا ہوا اور یہ ایسی چیزیں تھیں جو دنیا کے تمام حصوں میں انحطاط شدہ تمدن میں بھلائی جا چکی تھی[۴]"

اسلام ہر قسم کی غلامی کو خواہ وہ معاشرتی ہو یا معاشی سیاسی ہو یا ذہنی غرض ہر قسم کے انحطاط کو دُور کر دینا چاہتا ہے۔ خود قرآن پاک میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا

۱۔ الفاروق شبلی نعمانی صفحہ ۸۰ مطبوعہ نامی پریس کانپور نیز کتاب الاغانی صفحہ (۴۰) نیز فتوح البلدان صفحہ ۱۳۶ یرموک کا دن۔ ۲۔ امام ابویوسفؒ: کتاب الخراج صفحہ ۲۵۔

۳۔ ایم۔این رائے: ہسٹاریکل رول آف اسلام باب ۱ صفحہ (۷)۔

۴۔ یم۔این رائے: ہسٹاریکل رول آف اسلام باب ۱ صفحہ ۵۳۔

خاص طور پر یہ وصف بیان کیا گیا ہے کہ

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ پ ۹ الاعراف، ع ۱۹

وہ لوگوں سے اس بوجھ کو اور بیڑیوں کو جو ان کے اوپر تھیں اتار پھینکتا ہے۔

اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس ایک شخص نے فاتح مصر عمروؓ بن العاص کی کچھ شکایت کی تو حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے دریافت کیا کہ "تم نے انھیں کب سے غلام بنا لیا در آنحالیکہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا تھا"[1]

پھر صدی دو صدی بعد ہی امام شافعیؒ نے اسی تعلیمات کو دوہرایا کہ

إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَكَ حُرًّا فَكُنْ كَمَا خَلَقَكَ ۔

خدا نے تجھے آزاد پیدا کیا آزاد ہی رہو۔

اور ان ہی صداؤں کی صدائے بازگشت تھی کہ انقلاب فرانس کے وقت روسو نے یہ صدائے آزادی بلند کی کہ

"انسان آزاد پید ہوتا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے"[2]

اسلامی جمہوریت کے عہد زریں میں ایک بڑھیا بھی خلیفۂ وقت پر تنقید کر سکتی تھی اور یہی تنقید اور تقریر کی آزادی تھی کہ حضرت فاروق اعظمؓ سے بھرے مجمع میں ایک شخص نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ امیر المومنین کو دو کپڑے ملیں اور مجھ غریب کو ایک ہی کپڑا ملے؟ کوئی معمولی انسان ہوتا تو اس کا چہرہ شکن آلود ہو جاتا لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے پہلے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ ملت اسلامیہ میں ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو خلیفۂ وقت پر بھی تنقید کرتے ہوئے نہیں جھجکتے پھر اپنے صاحبزادے کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس تنقید کا جواب دیں۔ آپ کے صاحبزادے نے کھڑے ہو کر نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا کہ امیر المومنین کو بھی عام مسلمانوں کی طرح ایک ہی کپڑا ملا تھا لیکن چونکہ امیر المومنین طویل قامت ہیں لہذا میں نے اپنا کپڑا انھیں دیدیا۔

---

[1] ۔ حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ ۔ ج ۲ صفحہ ۱

[2] ۔ روسو کی کتاب "معاہدہ عمرانی" مذکورۂ بالا جملہ سے شروع ہوتی ہے۔

آزادی پیشہ اسلام نے اہل پیشہ کو خاص عزت بخشی ہے۔ چنانچہ اہل پیشہ کو خدا کا دوست قرار دیا گیا ہے "اَلکَاسِبُ حَبِیبُ اللّٰہِ"

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق بخاری میں ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے کسب کر کے کھاتے تھے۔" غرض اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے ذات کے فرق کو مٹایا اور پیشہ وروں کا رتبہ بڑھا کر ہر ایک کو بلا تکلف پیشہ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ اسلامی تاریخ کا سب سے درخشاں حصہ مسلمانوں کی آزادی، آزادی پیشہ گری ہی خاص طور سے نمایاں نظر آتی ہے[1]۔ اس کی تفصیل ہم نے آئندہ پیدائش دولت کے باب میں "محنت" کے تحت بیان کی ہے۔

جہل سے آزادی اسلام نے اپنے پیرووں پر خواہ مرد ہوں یا عورت تعلیم لازمی قرار دیا ہے کہ "علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے[2]"۔

اسلام نے تعلیم پر جو زور دیا ہے، اس کی تفصیل ہم نے آئندہ پیدائش دولت کے باب میں کارکردگی کے تحت بیان کی ہے۔

حقوق نسواں اسلام ہی وہ مذہب ہے، جس نے عورتوں کی تعلیم پر زور دیا۔ عورتوں کو بھی وراثت میں حصہ دلوایا[3] اور خلع کی آزادی عطا کی مستورات کو اپنے مال وجائداد اور اپنے نفس پر کامل اختیار عطا کیا۔ اس کی وجہ سے کاروباری دنیا میں جو انقلاب انگیز تبدیلی ہوئی اس کا خاطر خواہ احساس ابھی دنیا نے نہیں کیا ہے ابھی مہذب دنیا میں عورتیں ان حقوق کو حاصل کرنے کے لیے آج تک سرگرداں ہیں۔

ازالۂ غلامی غلاموں کے ساتھ اسلام نے جو سلوک روا رکھا ہے، معاشرتی تاریخ عالم میں اس کی خاص اہمیت ہے۔ طلوع اسلام سے کے وقت ——— دنیا کے اور حصوں کی طرح ——— عرب میں بھی غلامی کا رواج تھا۔ لونڈیوں کی اولاد عرب میں حقیر سمجھی جاتی تھی۔ اور آزاد شخص کی اولاد معزز

۱۔ علم المعیشت از پروفیسر الیاس برنی صاحب ص۲۰۲ ۲۔ ابن ماجہ کتاب العلم

۳۔ تقسیم دولت کے باب میں اسلامی قانون وراثت ملاحظہ ہو۔

سمجھی جاتی تھی۔ گو بظاہر اسلام نے غلاموں کے طبقے کو کچھ عرصہ کے لیے بحال رکھا، تاہم رضا کارانہ طور پر متعدد طریقوں سے غلاموں کی آزادی کی قرآن نے جا بجا ترغیب دی مثلاً یہ کہ انسان اپنے خالق کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا چاہے تو غلام آزاد کرے۔

وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ — تمہیں کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ گھاٹی غلام کو آزاد کرنا ہے۔

پ۳۰ سورۃ بلد۹۰ ع۱

اسی طرح بعض جرائم کی پاداش میں جو کفارہ واجب ہوتا ہے، ان میں غلام کی آزادی کو مقدم رکھا گیا۔ چنانچہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو غلطی سے قتل کرے تو ایک غلام آزاد کرے

مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ۔ — جو شخص غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کرے تو ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے رشتہ دار کو خون بہا دے۔

پ۵۔ النساء۴ ع۱۳

اسی طرح قرآن میں کفارہ ظہار اور قسم توڑ دینے کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے[1]۔

دوسری تفصیلات ہم نے "اسلامی مالیات" کے باب میں بیان کی ہیں۔

اس سے قطع نظر غلام بنانے کے متعلق قرآن مجید میں ایک آیت بھی نہیں ہے یعنی قرآن مجید میں کہیں بھی یہ حکم نہیں ہے کہ لڑائی کے سوا غلام بنا لیے جائیں[2]۔ پھر ان کو بھی موقعہ حاصل رہتا تھا کہ اپنا فدیہ ادا کر کے آزادی حاصل کر لیں برخلاف اس کے یہودیوں کے ہاں دشمنوں کو قتل کر دیا جاتا اور ان کی بیوی بچے لونڈی غلام بنا لیے جاتے تھے چنانچہ "جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر دے، مگر عورتوں، بچوں اور مویشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لیے لے لے[3]"

۱۔ ظہار کے کفارہ کی تفصیل قرآن پ۲۸ المجادلۃ ۵۸ ع۱ ملاحظہ ہو۔ قسم کے کفارہ کی تفصیل قرآن پ۷ المائدہ ۵ ع۱۲۔ ۲۔ تاریخ تشریع الاسلامی علامہ محمد الخضری مرحوم ص۹۶ اردو ترجمہ شائع کردہ معارف اعظم گڑھ۔

۳۔ توریت باستثناء باب ۲۰ نمبر ۱۳۔

گزشتہ صدی میں شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ میں صرف اس بات پر خانہ جنگی بپا رہی کہ آیا غلاموں کو آزاد کرنا چاہیے یا غلام رکھنا چاہیے؟۔

غرض قرآنی آیتوں اور حدیثوں کا ایک سرسری مطالعہ کیا جائے تو عیاں ہو گا کہ اسلام، معاشرۂ انسانی سے بتدریج غلامی کو مٹا دینا چاہتا تھا ؎

نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں باقاعدہ اعلان فرمادیا کہ "کوئی عرب، کسی عرب کی غلامی میں نہ رہے" اور یہ حدیث نبوی ہے[1]۔

اسلامی تاریخ میں بکثرت غلاموں کو اعلیٰ سے اعلیٰ دینی اور دنیوی مدارج پر فائز ہونے اور ترقی کرتے کرتے ولی اللہ اور سلطان وقت بننے کی نظائر موجود ہیں[2]۔ حتیٰ کہ حضرت عمر فاروقؓ اپنے بستر مرگ پر فرمارہے تھے کہ

لَوْ کَانَ سَالِمٌ مَوْلَی اِبِی حُذَیْفَۃَ حَیًّا اِسْتَخْلَفْتُہٗ۔ اگر سالم ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام زندہ ہوتے تو میں انھیں خلیفہ بناتا[3]۔

غلاموں، نوکروں اور مزدوروں کے ساتھ برتاؤ

اسلامی معاشرہ میں غلاموں کو ایک فردِ خاندان کی حیثیت دی گئی تھی، غلاموں کے بارے میں اسلامی تعلیم کا لب لباب ابوذر غفاری کی اس حدیث سے معلوم ہو گا کہ

"رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ تمھارے بھائی تمھارے خدمت گار ہیں۔ خدا نے انھیں تمھارے قبضے میں دیا ہے۔ پس جس شخص کا بھائی اس کے قبضے میں ہو، اُس کو چاہیے کہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے، اور جو خود پہنے وہی اس کو بھی پہنائے اور تم ان سے اس کام کو نہ کہو، جو ان سے نہ ہو سکے۔ اور اگر تم اس کام کے لیے ان سے کہو تو خود بھی ان کی مدد کیا کرو"[4]۔

---

[1] مبسوط سرخسی ۱۰/۱۱۸ نیز مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ صـ ۱۳۳

[2] مثلاً خاندان غلامان ہند، ممالیک مصر۔ [3] تاریخ طبری عہد خلافت عمرؓ

[4] بخاری ج ۱ کتاب العتاق

مختصر یہ کہ خدمت گار کو بھائی سے مخاطب کیا گیا ہے اور ایک فرد خاندان کی حیثیت دی گئی ہے یہی وجہ تھی کہ "مسٹر رچرڈسن نے قانون ازالۂ غلامی کو انڈیا کونسل میں پیش کرتے وقت ۱۸۴۱ء میں کہا تھا کہ غلامی کی مکروہ رسم کو اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہندو شاستر کو قرآن سے بدل دیا جائے"۔ آئندہ تقسیم دولت کے باب میں اُجرت کے تحت ہم آجر و مزدور کے تعلقات پر تفصیلاً بحث کریں گے۔

غیر مسلموں سے معاملت ایک اور اہم اصول جس پر اسلام نظام معاشیات کی بنیاد قائم ہے وہ غیر مسلموں سے معاملت کی آزادی ہے چنانچہ قرآن میں یہ نص وارد ہے کہ

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔

پ۲۸ ممتحنۃ ع۲

خداوند تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑتے اور تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالا بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

چنانچہ خود رسول اللہ صلعم نے غیر مسلموں سے معاملت اور خرید و فروخت کی ہے آپ نے زرہ ایک یہودی کے ہاں رہن رکھوائی تھی[1]

ان بنیادی اصولوں کو عملاً کس طرح اسلامی نظام معاشیات میں جذب کیا گیا اس کا حال آئندہ ابواب کے مطالعہ سے واضح ہو گا۔

---

[1] بخاری پ۱۰ کتاب الرہن

تیسرا باب

پیدائش دولت

خلاصہ :۔ اس باب میں پیدائش دولت، کسب واکتساب معیشت کے مختلف طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ ابتداءً انسانی فطرت کو پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ہر شخص اپنے اندر ان گنت آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک سمندر لیکر پیدا ہوتا ہے۔ بظاہر خود انسان کا قصور نہیں، بلکہ جس نے اس کی فطرت بنائی ہے، اسی نے ان چیزوں کو اس کی فطرت کے سامنے بنا سنوار کر پیش کیا ہے۔ گویا ان اشیاء کی خواہش بھی فطری ہے۔ ان ہی تمناؤں اور آرزوؤں کو پورا کرنے کے لیے آدمی مال و دولت کا دلدادہ بنا ہے۔

غرض معیار زندگی کی برقراری اور استواری کے لیے ہر شخص پیدائش دولت کی فکر میں سرگرداں ہے۔ اسلامی معاشیات نے اس سرگردانی کو جائز قرار دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایسی پابندیاں لگا دی ہیں کہ انسان اعتدال کی حد سے بڑھنے نہ پائے تاکہ سرمایہ داری کی خرابیوں سے انسانی معیشت و معاشیات محفوظ رہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ معاشی جد وجہد سے اخلاق اور دینداری میں ترقی ہو۔

پھر یہ بتایا ہے کہ انسان اپنی محنت، سرمایہ اور تنظیم کے ذریعے

عطیات قدرت پر عمل کر کے کن کن شکلوں سے نفع اٹھا سکتا ہے۔

پیدائش دولت کے ذریعوں سے عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے اور کچھ اس لیے بھی کہ غلط مشوروں نے انسان کی عملی قوتوں پر جو افسردگی طاری کر دی تھی ان کو نشاط سے بدلنے کے لیے خود قرآن کریم نے استفادہ کے ذریعوں پر بحث کی ہے چنانچہ واضح کیا گیا ہے کہ قرآن مجید تمامتر دینی کتاب ہونے کے باوجود کسی نہ کسی پیرایے میں اس نے پیدائش دولت کے عام ذریعوں کا تذکرہ کیا ہے۔

حیوانات، نباتات اور جمادات سے استفادے کی مختلف شکلوں کو پیش کرتے ہوئے زراعت، صنعت و حرفت اور حمل و نقل کے وسائل، پر بحث کی گئی ہے۔

پھر محنت، اصل اور تنظیم سے متعلق مواد پیش کیا گیا ہے۔ اصل ہی کے سلسلے میں شغل اصل کے مختلف طریقوں مثلاً شرکت، شراکت، مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں، حکومتی کاروبار وغیرہ کو بیان کرتے ہوئے ان کی بابت اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔

نتیجے میں بتایا ہے کہ مختلف پیرایوں میں قرآن اور حدیث نے پیدائش دولت کے جس معاشی وسائل کی طرف اشارہ کیا ہے اگر امریکی پروفیسر مسٹر کارور یا ابن خلدون وغیرہ کی طرح اس کا نقشہ بنایا جائے تو ان نقشوں سے زیادہ مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں بتایا ہے کہ پیدائش دولت اور حصول معاش کی جدوجہد کے متعلق رسول اکرمؐ کا جو طرز عمل تھا، مسلمان اگر اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء پر چلنے کو اپنی سعادت قرار دیں تو شاید مشکل ہی سے کوئی مسلمان بے کار یا بے روزگار رہ سکتا ہے۔

عرب کے قدیم افلاس کی حالت کو پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ گو اس معاشی انقلاب میں سیاسی فتوحات کو بھی دخل ہے۔ تاہم محض یہ ایک ہی سبب نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں

ان کی راہ نمائی رسول اکرمؐ کے ذریعے قدرت نے کی تھی وہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کو بلکہ سارے جہاں کو ایک آخری معاشی پیغمبر بھی دیا گیا تھا۔

(۱) مختلف مذہبوں کا عام معاشی رجحان

دنیا سے تعلق گذشتہ باب میں جو بحث ہو چکی ہے اس سے مختلف مذہبوں کے معاشی اصولوں سے یونہی سی آگاہی ہو جاتی ہے۔ ان بحثوں کا مقصد ایک پس منظر کا مہیا کرنا تھا۔ اس باب میں اصلی معاشی بحثوں کا آغاز ہوتا ہے اس لیے گو کچھ تکرار و اعادہ ہی کیوں نہ ہو پھر بھی کچھ بنیادی امور کا دہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ معاشی مسئلوں سے مختلف مذہبوں کے ربط کا حقیقی اندازہ کرنے میں سہولت ہو۔

زندگی کی عام کشمکش جو نظر آرہی ہے ظاہر ہے کہ زیادہ تر انسانی احتیاجات و ضروریات کی فراہمی سے ہی اس کا تعلق ہے۔ جوں جوں زندگی کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں، جد وجہد کے اس سلسلے میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس جد وجہد سے جو چیزیں تیار ہوتی ہیں، آدمی کی کسی نہ کسی ضرورت کی اس سے تکمیل ہوتی ہے۔ یہی اس کا آخری مقصد ہوتا ہے بہ ایں ہمہ اگر غور کیا جائے تو دولت اور پیدائش دولت کے متعلق دو مختلف نقاط نظر خصوصاً دینی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

ایک نقطۂ نظر تو رہبانیت کا ہے یعنی انسان اپنی زندگی کی ضرورتوں کو جس حد تک کم کر سکتا ہو کم کرتا چلا جائے۔ کم کرنے کے اس مقصد میں جو جتنا کامیاب ہوتا ہے رہبانی دائرہ میں وہی سب سے بڑھ کر کامیاب شمار ہوتا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں گاندھی جی آنجہانی نہ صرف قول بلکہ اپنی زندگی کی عملی مثالوں سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اس قدیم نظریے کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ دنیا کے مذاہب و ادیان کا بھی عمومی میلان اس دنیا گریز زاویۂ نگاہ کی تقویت کرتا ہے۔

بہر حال اس غیر فطری نقطہ نظر کی مخالفت جس دین میں واضح پائی جاتی ہے غالباً
وہ صرف اسلام اور اسلام کی آسمانی کتاب قرآن ہے۔ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے
یہ سب پیدا ہی کیا ہے اس لیے کہ آدم کی اولاد ان کے استعمال کے صحیح طریقے دریافت
کرکے ان سے خود بھی فائدہ اٹھائیے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائیے۔ قرآنی
تعلیمات کے دائرے میں سچ پوچھیئے تو یہ اس کی محوری تعلیم ہے۔ اول سے آخر تک
قرآن کو پڑھ جائیے، مختلف پیرایوں میں اسی اصول کو اس میں دُہرایا گیا ہے۔ خواہ
اس کا اقرار کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن یہ واقعہ ہے اور اس کا انکار بڑی ناشکری
ہوگی کہ آج دنیا میں جو معاشی چہل پہل نظر آتی ہے انسانی تاریخ کے اس حیرت انگیز
انقلاب میں اسلامی اثرات کارفرما ہیں اس انقلاب سے پہلے تو مشرق متاثر ہوا
اور اس کے بعد مغرب کو بھی اپنی وہ راہ بدلنی پڑی جس پر کلیسا کی پیروی میں وہ
دُنیا گریز زندگی صدیوں سے گزار رہا تھا۔ اگرچہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ دنیا کو
چھوڑ کر یورپ جس طرح مدتوں دین کے نام سے راہبانہ عقائد اور خیالات میں پھنسا
اسی طرح اب وہ دنیا کی طرف جھکا اور اس بُری طرح جھکا کہ اس نے دین سے
اپنا کوئی تعلق بجز رسمی انتساب کے باقی نہ رکھا حالانکہ عملاً اس نے دنیاوی معاملات
میں اسلام کی پیروی خاصی حد تک اختیار کر لی۔

اسلامی تعلیم کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ دین ہی کے سنوارنے کے لیے
اس نے دنیا کے سنوارنے کا حکم دیا تھا۔ اور یہی انسانیت کی سب سے بڑی خدمت
تھی، لیکن انسان کو محض دنیا داری کی ہوس میں گرفتار ہونے کے لیے بے راہ چھوڑ دینا
جیسا کہ مغربی تمدن نے کیا ہے، ظاہر ہے کہ دین تو دین اس کی وجہ سے لازم تھا کہ
آدمی کی دنیا بھی بگڑ جائے اور دنیا کا یہی وہ بگاڑ ہے جس میں آج مغربی ممالک مبتلا
ہیں۔ جو کچھ ہے یہیں ہے آئندہ کچھ نہیں۔ اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہی نکل سکتا ہے
جو یورپ میں نکلا۔ ہر شخص اور ہر شخص کے تمام ذرائع صرف اپنے لیے خاص ہو کر رہ گئے
دوسروں کے متعلق اس پر کوئی ذمہ داری نہ رہی بلکہ کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ
اٹھا کر زور والے اپنا زور بڑھانے لگے اور اس راہ میں وہ اتنی دُور تک چلے گئے کہ یورپ
کے سامنے وہ "معاشی عفریت" آکھڑا ہوا جس کا نام سرمایہ داری کا نظام ہے۔ وہ

"معاشی عفریت" جسے خود سرمایہ داروں نے پرورش کیا تھا آج وہی ان سرمایہ داروں کو نگل جانے کی دھمکیاں دے رہا ہے، بلکہ سچ پوچھیے تو اس نے نگلنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن اسلام نے ایک طرف جہاں اس کا اعلان کیا تھا کہ یہاں جو کچھ ہے سب آدمی کے لیے ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسلسل اس نے یہ بھی تلقین کی اور اس تلقین سے اس کا "خدائی منشور" معمور ہے کہ ہر شخص جس طرح اپنے لیے ذمہ دار ہے اسی طرح وہ اپنے خاندان اعزہ اقربا کے لیے بھی، اپنی قوم و ملک کے لیے بھی اور اپنے ابنائے جنس کے لیے بھی علی قدر مراتب ذمہ دار ہے اور لازم ہے کہ وہ اپنی دولت سے خود نفع اٹھاتے ہوئے دوسروں کو بھی نفع پہنچائے۔ اسلام کی زبان سے یہ منادی کرائی گئی کہ اس طرح اپنی کمائی ہوئی دولت سے دوسروں کو نفع پہنچانے والا زندگی کے بلند درجوں پر پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً قرآن شریف میں ارشاد ہوتا ہے کہ

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ۔ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّائِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَى الزَّكٰوةَ۔ پ۲ البقرہ ع

نیکی اس میں نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کو یا مغرب کو کر لو بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لے آئے اور روز آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب اور پیغمبروں پر۔ اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی کرتا ہو، اور زکوٰۃ ادا کرتا ہو۔

انسان کی فطری خودغرضی کو بے غرضی کی راہوں پر ڈال کر اور دنیا میں دینداری ملا کر یہ واقعہ ہے کہ معاشی پیچیدگیوں کا ایک ایسا حل دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے جس کے متعلق بلا مبالغہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دین سے دنیا کی اور دنیا سے دین کی تعمیر کا کام مسلسل انجام پاتا چلا جاتا ہے۔ اور ایسے سہل و آسان طریقے سے یہ کام انجام پاتا ہے کہ ہر خاص و عام شعوری و غیر شعوری طور پر انسانی معاش کے نظام صالح کا ایک مفید پرزہ بن جاتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ ایک خاص تشریح و تفہیم کے قالب میں تعاون دین و دنیا کے مذکورۂ بالا اسلامی اصول معاشیات کو پیش کروں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں قرآن مجید نے انسانی زندگی کے تین دَور قرار دیے ہیں۔ (۱) موجودہ زندگی سے پہلے کی زندگی جو روح سے متعلق ہے اور جو معاشی بحث سے بالاتر ہے۔ (۲) موجودہ زندگی کے بعد کی زندگی جس کا اصطلاحی نام آخرت ہے۔ (۳) موجودہ زندگی جس کا قرآنی نام دنیا ہے۔

آخرۃ یعنی آدمی کی زندگی کا وہ آئندہ دَور جہاں دنیا کی موجودہ زندگی کامیاب ہونے کی صورت میں بڑے اعلیٰ کمالات حاصل ہوں گے، مثلاً ہر وہ چیز جسے آدمی کا جی چاہے گا ملے گی، جو کچھ مانگے گا دیا جائیگا۔ غرض ارادے کے ساتھ اس چیز کو اپنے سامنے پائے گا، جس چیز کا ارادہ کرے گا۔ زندگی کے اس آئندہ دور کو "آخرت" کہتے ہیں۔ اس اُخروی زندگی کی تفصیلوں کے ساتھ خلاصہ اس کا قرآن ہی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ

وَ لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۔	اور تمہارے لیے اس میں وہ سب کچھ ہے جو تمہارا دل چاہے گا اور تمہارے لیے وہ بھی ہے جو تم مانگو گے۔
پ ۲۴ حم السجدۃ ۴۱ ع ۴	

یہ اور اسی قسم کی دوسری عبارتوں میں آپ اُخروی زندگی کی عام کامیابی کو قرآن میں پا سکتے ہیں۔ خاص کامیابی کے ایسے اور مدارج جو انبیاء و مرسلین، صالحین و صدیقین سے متعلق ہیں، ان کے بیان و تفہیم کی یہاں ضرورت اور جگہ نہیں۔

وعدہ کیا گیا ہے کہ زندگی کے اس دَور میں انسان موجودہ دَور کے بعد داخل ہوگا۔ اس کے مذکورہ آثار چند علمی اور عملی شرطوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جن کا ماننا اور جن پر عمل پیرا ہونا اس زندگی کے لیے ضروری ہے۔ بہرحال یہ دَور تو موجودہ دَور کے بعد آئے گا اور جب آئے گا اسی وقت اس کی حقیقت بھی واضح ہوگی۔

دنیا۔ انسانی زندگی کا تیسرا دور ہے، جس میں وہ بحالت موجودہ گرفتار ہے وہی حال جس پر قرآنی آیت صادق آتی ہے کہ

لقد خلقنا الانسان فی کبدٍ — ہم نے انسان کو محنت اور مشقت میں پیدا کیا۔

پ البلد ۹۰ ع ۱

توریت کا یہ مشہور جملہ ہے کہ جب آدم سے پہلے دور کی زندگی چھینی گئی تو اسوقت خدا نے زمین پر بھیجتے ہوئے ان سے کہا کہ "تکلیف کے ساتھ تو عمر بھر اس سے کھائیگا تو اپنے منھ کے پسینے کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین سے پھر نہ جائے"[1]

موجودہ زندگی کی محنت مشقت (کبدیت) در اصل ان گوناگوں پیچیدہ مسائل کی بنیاد ہے جسے معاشیات یا معاشی مسائل کہتے ہیں۔

لامتناہی انسانی خواہشات ہر شخص اپنے اندر آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک سمندر لے کر پیدا ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ان ہی آرزوؤں اور تمناؤں نے اس کی زندگی کو نت نئی مشکلوں کی گتھیوں میں الجھا دیا ہے۔ مگر اسی کشاکش سے دنیا میں چہل پہل ہے موجودہ زندگی میں جو مشکلیں پیدا ہوئیں قرآن نے ان کا بھی جواب دیا ہے کہ جس فطرت کو لے کر انسان اس زندگی میں قدم رکھتا ہے وہ خود مشکلات کی طالب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

اِنَّ الاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًاً — آدمی بڑا لالچی بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔

پ ۲۹ - المعارج ۷ ع

حدیثوں میں انسانی فطرت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ عبداللہ ابن زبیرؓ مکہ معظمہ میں منبر پر کھڑے ہوئے بیان کر رہے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "اگر بنی آدم کو ایک وادی سونے سے بھری ہوئی دی جائے تو دوسری کی خواہش کرے، اور اگر دوسری دی جائے تو تیسری کی خواہش کرے، اور انسان کا پیٹ تو (قبر کی مٹی) کے سوا کسی چیز سے نہیں بھرتا"[2] اور گویا اسی کی تفسیر ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

---

[1] توریت، پیدائش باب ۳ نمبر ۱۹،
[2] بخاری پ ۲۳ کتاب الرقاق بروایت سہیل بن سعد نیز اسی باب میں یہی روایت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے۔ نیز مسلم وغیرہ۔

غرض یہ سب انسانی فطرت کی اسی خصوصیت کی تشریح ہے۔

پھر اسی وسیع طلب کے سلسلے میں انسانی فطرت میں ایک اور جذبہ توجہ کے قابل ہے جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ۔	لوگوں میں عورتوں، بچوں، سونے چاندی کے ڈھیر، سدھے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتی سے محبت کرنے کی خواہش آراستہ کی گئی ہے۔

پ ۳۔ آل عمران ۳ ع ۲۔

جیسا کہ "زُيِّنَ" کے فعلِ مجہول کا اقتضا ہے بظاہر خود انسان کا عیب نہیں، بلکہ جس نے اس کی فطرت بنائی اسی نے ان چیزوں کو اس کی فطرت کے سامنے بنا سنوار کے پیش کیا ہے، گویا ان اشیا کی خواہش بھی فطری ہے۔

انسان دولت کا دلدادہ ہے فطرت کی حدوں سے آگے نکل کر اس عقلی وجود نے اپنے اختیار سے ایک اور نظریے کا اضافہ کیا ہے، جس کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ۔	وہ یہ سمجھتا ہے کہ مال اس کو خلد (دوام) بخشے گا۔

پ ۳۰ سورۂ ہمزہ ۱۰۴ ع ۱

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مال اس کو موت کے پنجے سے چھڑا تا ہے۔ کیونکہ آئے دن وہ مالداروں کو مرتا ہوا دیکھتا ہے۔ وہ کیسے یہ خیال کر سکتا ہے کہ مال آدمی کے وجود اور حیات کو دوام اور بقا عطا کرتا ہے بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو آدمی سمجھتا ہے کہ معاشی اعتبار سے جس شخص کا معاشرہ میں جو معیار قائم ہو جاتا ہے زندگی کے اس معیار کو خود اس کے لیے یا اس کی آئندہ نسلوں کے لیے جو چیز باقی رکھ سکتی ہے وہ مال و دولت ہی ہے۔

الغرض معیارِ زندگی کے دوام و بقا ہی کے لیے ہر شخص "سرمایہ" کی فکر میں سرگرداں ہے۔ اسلامی معاشیات نے اس سرگردانی کو جائز تو قرار دیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسی پابندیاں بھی لگا دیں کہ انسان اعتدال کی حد سے بڑھنے نہ پائے۔

اور "سرمایہ داری" کی خرابیوں سے معیشت و معاشرت محفوظ رہے۔

اس باب میں ہم تفصیل سے بتائیں گے کہ اسلامی معاشیات نے انسان کو معاشی جد وجہد میں کس قدر آزادی دی ہے اور پیدائش دولت کے کس قدر راستے اس پر کھول دیئے ہیں تاکہ وہ خود دولت پیدا کرے اور اس دولت کی پیدائش کو بڑھا کر انسان کے معیار زندگی میں اضافہ کرے۔

(۲) پیدائش دولت کے مختلف شعبے

انسانی ضرورتوں میں عطیاتِ قدرت سے استفادہ

ہر شخص اپنے اندر آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک سمندر لیکر پیدا ہوتا ہے۔[۱] اس کی آرزو کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ قدرت نے اس کی فطرت میں سیری نہیں دی۔ اس کا ذہن اور اس کا دل ہر وقت نئے نئے مقاصد اور نئی نئی آرزوؤں کا مولد ہے قرآن پاک انسان کے ان جذبوں اور خواہشوں کی حوصلہ شکنی نہیں کرتا بلکہ اس نے ان خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے خود زمین ہی کیا بلکہ عالم محسوس کے پورے نظام کو انسان کی تمناؤں اور آرزوؤں کی جولانگاہ بنا کر اس سے کہہ دیا ہے کہ زمین بھی تیری ہے، آسمان بھی تیرا ہے، ہوا بھی تیری ہے پانی بھی تیرا ہے، تارے بھی تیرے ہیں، چاند بھی تیرا ہے، سورج بھی تیرا ہے۔

سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ — (خدا نے) آفتاب اور ماہتاب کو تمھارے لیے مسخر کر دیا۔

پ ۱۳ ابراہیم ۱۴ ع ۵

نیز ارشاد ہوتا ہے کہ

خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا — جو کچھ زمین میں ہے سب تمھارے ہی لیے پیدا کیا۔

پ ۱ البقرہ ۲ ع ۳

---

[۱] ۔ معاشیات مقصد و منہاج صف از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شائع کردہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد۔

اسلامی معاشیات اپنے ماننے والوں پر یہ لازم کرتی ہے کہ زمین میں جو کچھ ہے جب تک اس کی ہر ہر چیز کے متعلق یہ ثابت نہ کرلیں کہ وہ انسان کی کس ضرورت میں کام آتی ہے؟ اور کیونکر اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟ ان کی آسمانی کتاب کی تفصیل مکمل نہیں ہوسکتی۔ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرامؓ کو عملی تعلیم دیتے تھے کہ جہاں تک ہوسکے عطیاتِ قدرت سے استفادہ کیا جائے۔ اس بارے میں آپ معمولی معمولی باتوں کی طرف ان کو توجہ دلاتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ رسول اکرمؐ نے ایک مری ہوئی بکری دیکھی جو حضرت میمونہؓ کی کسی لونڈی کو صدقہ میں دی گئی تھی، نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تم اس کی کھال سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے؟ لوگوں نے عرض کیا وہ تو مری ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ حرام تو صرف اس کا کھانا ہے۔[1]

غرض اسلامی معاشیات ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ یہ سارا نظام عالم تمھارے لیے ہے شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے قرآن کے اسی مفہوم کو کس خوبی سے نظم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خوری

---

[1] بخاری پ۶ کتاب الزکواۃ بروایت ابن عباسؓ نیز بخاری پ۸ کتاب البیوع اور بخاری کتاب الذبائح والصید نیز بخاری کے علاوہ موطا، مسلم وغیرہ میں بھی یہ حدیث درج ہے۔

رسول اللہؐ کی اس ہدایت کے مدنظر یہ امر قابل غور ہے کہ حج کے موقع پر ہر سال ہزاروں بکرے، دنبے قربانی میں ذبح ہوتے ہیں اور عام طور سے دفن کردیے جاتے ہیں۔ گویا لاکھوں روپے کی اون اور کھال ضائع کردی جاتی ہے حالانکہ اگر ایک طرف چرمی سامان کی صنعت بڑے پیمانے پر جاری ہوسکتی ہے تو دوسری طرف خون اور ہڈیوں سے بہترین کھاد تیار ہوسکتا ہے۔ یہ تو ایک بطور مثال کے ہے ورنہ اس گئی گزری حالت میں بھی دنیا کے بعض زرخیز حصے مسلمانوں کے اقتداری قبضے میں ہیں، زرعی نقطۂ نظر سے بھی اور معدنی نقطۂ نظر سے بھی۔ دنیا کے بعض بڑے دریا جیسے دریائے نیل، دریائے دجلہ و فرات، دریائے سندھ، برہمپترا اور گنگا ان کے علاقوں سے گزرتے ہیں۔ اسلامی علاقوں میں عطیاتِ قدرت کی کمی نہیں صرف ان سے استفادہ کی ضرورت ہے۔

گویا اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سارا نظام "نانِ بکف آری" کا نظام ہے۔ یہ تو "باہر" میں ہے۔

ان معاشی وسائل سے استفادہ کے لیے پھر انسان کے اندر

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً۔ — خدا ہی نے تم کو ضعف سے پیدا کیا اور ضعف سے پھر تم میں قوت پیدا کی۔

پ ۲۱ الروم ۳۰ ع ۶

نیز

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَاۤ اَسْرَهُمْ۔ — ہم نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان کے رگ پٹھوں کو مضبوط کیا۔

پ ۲۹ الدہر ۷۶ ع ۲

وغیرہ آیات میں پیدائش دولت کے ان عاملین کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جن کے بل بوتے پر آدمی محنت کرتا ہے، اور تنظیمی تجویزوں کو سوچتا ہے اور ان پر عمل پیرا ہوتا ہے، وہ مکمل انسانوں کی صفت

اُولِی الْاَیْدِیْ وَ الْاَبْصَارِ — یعنے عملی اور عقلی قوتوں والے

پ ۲۳ ص ۳۸ ع ۴

بیان کرتا ہے۔

پھر "اندر" اور "باہر" کے ان سامانوں پر متوجہ کرنے کے بعد جیسا کہ قبل ازیں واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ یہ سب کچھ تمھارے سامنے اس لیے پھیلایا گیا ہے کہ دیکھا جائے کہ تم ان سے کس حد تک بھاگتے ہو! یا یہ قوتیں اور فکر و نظر، عمل اور اکتساب کی طاقتیں تم کو اس لیے دی گئی ہیں کہ اندازہ ہو کہ تم ان کو کس حد تک معطل کر کے بے کار کر سکتے ہو! بلکہ جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے کہ ان اندرونی اور بیرونی سامانوں کی فراہمی پر توجہ دلانے کے بعد قرآن نے یہ اعلان کر دیا کہ یہ جو کچھ ہے انسانوں کی دنیاوی زندگی (الحیوٰۃ الدنیا) کا سرمایہ اور پونجی ہے۔ وہی "القناطیر المقنطرۃ" والی آیت جس میں سونا، چاندی، کھیت، مویشی، سواریوں کے ساتھ انسان کی فطری وابستگی کا ذکر ہے ان سب کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ:-

ذَالِكَ مَتَاعُ الحیواۃِ الدُّنیا — یہ دنیاوی زندگی کا اثاثہ ہے۔

پ ۳ آل عمران ۳ ع ۲

ظاہر ہے کہ عطیات قدرت کو ہی سرمایہ بنا کر آدمی اس زمین پر اپنی زندگی گزار رہا ہے، چنانچہ آدم کو جب زمین پر بھیجا گیا اس وقت بھی یہ کہہ دیا گیا کہ زمین کے اس کرہ پر

وَلَکُمْ فِی الارضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ۔ — تمھارے لیے زمین پر ٹھکانا ہے اور خاص وقت تک کے لیے پونجی ہے۔

پ ۱ البقرہ ۲ ع ۴

گویا معاشی طور سے یہ انتظام کر دیا گیا ہے کہ جب تک رہو گے اسی سرمائے سے کام لیکر اپنی زندگی بسر کرو گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ محنت، سرمایہ تنظیم اور قدرتی قوانین جو انسانی معاش کے عاملین پیدائش ہیں، ان سب کا تذکرہ کر کے قرآن مسلسل اس کی سند بنی آدم کو عطا کرتا جاتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے صرف دیکھنے کے لیے یا بھاگنے کے لیے نہیں بلکہ جی بھر کر پورے استفادے کے لیے ہے کہ

کُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلاً طَیِّبًا — خدا نے جو حلال مرغوب رزق تمھیں دیا ہے کھاؤ۔

پ ۷ المائدہ ۵ ع ۱۲

نیز ارشاد ہوتا ہے کہ

کُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰہِ۔ — خدا کے دیے ہوئے رزق سے کھاؤ پیو۔

پ ۱ البقرہ ۲ ع ۷

ایسے لوگ جو فراری خیالات سے متاثر ہو کر کبھی کبھی ان چیزوں کے استفادے سے ہچکچاتے تھے ان کی تسلی کرتے ہوئے نہایت شفقت اور مہربانی سے ارشاد ہوتا ہے کہ

یَا اَیُّھَا النَّاسُ! کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلاً طَیِّبًا۔ — اے انسانو! جو چیز زمین میں صاف ستھری ہے اُسے کھاؤ۔

پ ۲ البقرہ ۲ ع ۲۱

بعض موقعوں پر قرآن مجید میں ابر و باد، بارش، لہلہاتی کھیتیاں، مہکتے ہوئے

باغ، یا پھلوں اور اناجوں سے لدی پھندی ڈالیاں جو انسانوں کے سامنے ہیں، ان سب کا ذکر کر کے عجیب شان سے فرمایا جاتا ہے کہ

رِزْقًا لِّلْعِبَادِ ۔ (یہ سب کچھ) میرے بندوں کا روزینہ ہے۔

پ ۲۶ ۔ ق ۵ ۔ ع ۱

یہ چند آیتیں تو بطور مثال کے پیش کی گئی ہیں، ورنہ قرآن ایسی ہی آیتوں سے معمور ہے، اس نے صرف ضروریاتِ زندگی[I] اور راحت کی چیزوں[II] کی حد تک ان اجازتوں کو محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ بڑی فیاضی سے زیب و زینت کی چیزوں[III] سے بھی موزوں اور برمحل استفادہ ہی کی اجازت دی ہے اور ان سے استفادہ کرنے کے متعلق جن دلوں میں کچھ دغدغہ تھا ان سے عتابی رنگ میں پوچھا ہے کہ

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔ — پوچھو تو کس نے حرام کیا اللہ کی (پیدا کی ہوئی) زینت و آرائش کی چیزوں کو جسے خدا نے اپنے بندوں ہی کے لیے پیدا کیا۔ اور کس نے حرام ٹھہرایا صاف ستھری اور پاکیزہ غذاؤں کو؟

پ ۸ الاعراف ۷ ع ۴

پھر خود ہی راہ نمائی کرتا ہے کہ جو چیزیں پیدا کی گئی ہیں، ان میں بعض کا تعلق انسان کی ضروریاتِ زندگی سے ہے اور ان ہی میں بعض تمہاری زیب و زینت، جمال، سنگھار، اور آرائش میں کام آتی ہیں مثلاً سواریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے کہ

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ — گھوڑوں، خچروں، اور گدھوں کو پیدا کیا تاکہ تمہاری سواری کا کام دیں اور زینت بنیں۔ اور وہ بھی پیدا کرتا ہے جو تم (ع ۶) نہیں جانتے۔

پ ۱۴ النحل ۱۶ ع ۱

I Necessaries of Life.

II Comforts. III Luxuries.

صبح وشام آبادی میں مویشیوں کی آمد و رفت سے جو ایک خاص سماں پیدا ہوتا ہے ان کے جمالیاتی پہلو پر متنبہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ:-

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۔ — اور تمھارے لیے ان میں جمال رکھا ہے تاکہ تم ان سے صبح وشام فرحت حاصل کرو جب کہ وہ آتے جاتے ہیں۔

پ۱۴ النحل ۱۶ ع۱

انسان جس طرح سواریوں میں جمال پسندی سے فطرۃً کام لیتا ہے اسی طرح لباس میں بھی اس کا فطری حسن پسندی کا مذاق واقع ہوا ہے۔ قرآن میں لباس اور پوشاک کے حسن مذاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ

يَا بَنِي آدَمَ! قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا ۔ — اے آدم کی اولاد! میں نے تمھارے لیے لباس اُتارا (پیدا کیا) تاکہ تمھارے شرم کے مقامات کی ستر پوشی ہو اور اس سے جمال اور زینت پیدا ہو۔

پ۸ الاعراف ۷ ع۳

یہ ظاہر ہے کہ قرآن براہ راست معاشی کتاب تو ہے نہیں، البتہ معاشیات کے متعلق غلط نظریوں نے جو خاص قسم کے غیر فطری خیالات، مذہب اور دین کے رنگ میں پیدا کر دیے تھے ان کے ازالے کے لیے قرآن کا اتنا بیان کافی ہو سکتا تھا۔

انسان اپنی محنت، تنظیم اور سرمایہ کے ذریعے عطیات قدرت سے کن کن شکلوں میں فائدہ اٹھا سکتا ہے اس کے لیے قدرت نے انسان کو عقل و شعور دیا ہے جس سے کام لیکر وہ ان سے استفادہ کر سکتا ہے اور اس کے لیے وحی کی چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن کچھ اس لیے کہ پیدائش دولت یا اس کے ذریعوں سے استفادے کے جو عام طریقے ہیں ان سے بعض اسباب کے تحت عام طور سے غفلت برتی جاتی ہے اور کچھ اس لیے بھی کہ غلط مشوروں نے انسان کی عملی قوتوں پر جو افسردگی طاری کر دی تھی ان کو گرم جوشی سے بدلنے کے لیے اس نے استفادے کے ان ذریعوں کی راہ نمائی کی ہے۔

واضح ہو کہ قرآن مجید نے حصول معاش کے لیے بہت زور دیا ہے۔ پیدائش دولت کے جو عام طریقے ہیں اگرچہ یہ چیزیں براہ راست عقل سے سیکھنے کی

ہیں لیکن مختلف پیرایوں میں قرآن ان کی طرف اشارہ کرتا چلا گیا ہے بلکہ قرآن مجید کی مشہور آیت۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ انسان کو اس کے سوا کچھ نہیں ملتا جو وہ کوشش کرے۔
پ ۲۷ النجم ۵۳ ع ۳

اور ایسی آیتوں کو بجائے آخرت کے دنیا اور آخرت دونوں کا عام اور بنیادی قانون قرار دیا جائے اور جیسا کہ قرآن ہی کی آیت ہے کہ

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا مردوں کیلئے ان کی کمائی کے موافق حصہ ہے
وَلِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ عورتوں کیلئے ان کی کمائی کے موافق حصہ ہے
پ ۵ النساء ۴ ع ۳

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص پر اس کی کمائی کی مناسبت سے نتیجے مرتب ہوتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن مجید نے بجائے اشاروں اور کنایوں کے پیدائش دولت کا صراحت سے حکم دیا ہے قرآن ہی کی آیت ہے کہ

لَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا اپنا دنیاوی حصہ نہ بھول جا۔
پ ۲۰ القصص ۲۸ ع

یہ تو عام اور مطلق ہدایتیں ہوئیں۔ قرآن مجید اگرچہ کہ کوئی معاشی کتاب نہیں تاہم کسی نہ کسی پیرایہ میں پیدائش دولت کے عام ذریعوں کا تذکرہ کسی نہ کسی طرح اس میں ضرور پایا جاتا ہے۔
اب فرداً فرداً پیدائش دولت کے ان ذریعوں پر غور کریں گے جو اجمالی طور پر یہ ہیں
(الف) حیوانات سے استفادہ۔ (ب) نباتات سے استفادہ (ج) جمادات سے استفادہ
(د) صنعت و حرفت (ھ) حمل و نقل (و) تجارت۔

(الف) حیوانات سے استفادہ

شکار اور ماہی گیری اس سلسلے میں سب سے پہلے شکار کا تذکرہ مناسب ہوگا کیونکہ جدید مورخین نے اس کو پیدائش دولت کا سب سے قدیم ذریعہ قرار دیا ہے، اور حدیثوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہم سے بیشتر جو پیغمبر تھے

وہ سب شکار کرتے تھے۔ قرآن مجید میں برّی اور بحری جانوروں سے شکار کے ذریعے جو معاشی سہولتیں پیدا کی جاتی ہیں ان کا تذکرہ صراحت سے کیا گیا ہے۔ بحری شکار کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے کہ

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ۔
پ المائدہ ۵ ع ۱۳

تمہارے لیے سمندری شکار کا کھانا حلال کر دیا گیا محض تمہارے (مقیمین) اور مسافروں کے فائدے کے لیے۔

برّی شکار کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ

وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا
پ المائدہ ۵ ع ۱

جب احرام سے باہر آؤ تو شکار کرو۔

شکار کے ان عام طریقوں کے ساتھ ساتھ بعض خاص تدبیروں کی طرف راہ نمائی بھی پائی جاتی ہے مثلاً

وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ ... فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ۔
پ المائدہ ۵ ع ۱

اور سدھے ہوئے شکاری جانور شکار پر دوڑانے کے لیے (تو اس کے شکار سے کھاؤ) اور سکھاؤ ان جانوروں کو جو تم جانتے ہو۔ پس جب وہ شکار کو تمہارے لیے روک رکھیں تو اس میں سے کھاؤ (اور چھوڑتے وقت) خدا کا نام لے لو۔

اس آیت سے صرف جانوروں کی مدد سے شکار ہی کا حکم نہیں ملتا بلکہ جانوروں اور پرندوں کو سدھانے کے پیشے کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔

قرآن کے علاوہ حدیثوں میں بھی پیدائش دولت کے اس ذریعے کا پتا پایا جاتا ہے چنانچہ ایک صحابی نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ میرا پیشہ شکار ہے اور اس مشغلے کی وجہ سے نماز با جماعت سے محرومی ہوتی ہے پھر کیا کروں؟ آپ نے

لہ۔ عرب کے باشندے "بحر" سے سمندر کے علاوہ دریا، نہریں، تالاب اور جھیلیں وغیرہ بھی مراد لیتے تھے ملاحظہ ہو تفسیر طبری ج ۷ صفحہ ۳۹۔

انھیں فرمایا کہ کیا ہی اچھا کام ہے یہ ہم سے پیشتر جو پیغمبر تھے وہ سب شکار کرتے تھے اور شکار کی تلاش میں نکلتے تھے اور نماز با جماعت مقیم ہی کے لیے ہے پھر جب تم روزی کی تلاش میں جماعت سے غیر حاضر رہو تو جماعت سے نماز پڑھنے والوں اور اللہ والوں کی محبت رکھو یہ تمھارے لیے کافی ہے۔ اپنے اہل و عیال کے لیے تم حلال روزی کو وسعت دو کیونکہ یہی اللہ کے راستے میں جہاد ہے[۱]

بَری اور بحری شکار سے قطع نظر مچھلیوں کے گوشت سے استفادے کے متعلق بھی قرآن میں ترغیبیں پائی جاتی ہیں کہ:

سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا تمھارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ اس سے تازہ بہ تازہ گوشت کھاؤ۔ پ۱۴ النحل ۱۶ ع۲

بَرّی شکار تو صرف وہیں مل سکتا ہے جہاں جنگلات وغیرہ ہوں اور جنگلوں کی کمی سے روز بروز شکاری پیداوار گھٹ رہی ہے لیکن آبی جانوروں کی غذائی اہمیت بڑھ رہی ہے، دنیا کے ۱/۴ حصہ خشکی کی آبادی کی غذا کی سربراہی میں توقع ہے کہ انسان مستقبل میں ۳/۴ حصۂ تری کی پیداوار سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرے گا جیسا کہ امریکی پروفیسر کارور نے لکھا ہے کہ "جوں جوں آبادی اور غذائی طلب بڑھتی جاتی ہے سمندری پیداوار ہماری قومی زندگی میں زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل کر رہی ہے"[۲]

گلہ بانی پیدائش دولت کے لیے انسان خود جانوروں کی پرورش بھی کرتا ہے اگر ایک طرف ان کے گوشت، پوست، ہڈی، بال، دودھ وغیرہ سے استفادہ کرتا ہے تو دوسری طرف ان سے سواری کا کام لیتا ہے، نیز ان کے ذریعے سے اپنے مال کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر ڈھوتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں مویشیوں سے استفادے سے متعلق بھی مختلف مقامات پر تذکرہ پایا جاتا ہے کہ

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ۔ پ۱۴ النحل ۱۶ ع۱ اس نے چوپایوں کو تمھارے ہی لیے پیدا کیا، جس میں تمھارے لیے گرمی (کا سامان) اور دوسرے فائدے بھی ہیں اور جن میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔

۱۔ طبرانی فی الکبیر مجمع الزوائد۔ ۲۔ کارور اینڈ کارمیکائیل: ایلیمنٹری اکنامکس صفحہ ۱۹۳

حیوانات سے جو دولت پیدا کی جاتی ہے اس کا قرآن میں مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے۔ منافع کا ذکر تو ہم نے چرم سازی کی صنعت اور پارچہ بافی کی صنعت کے ذیل میں آگے کیا ہے۔ مشروبات کے متعلق قرآن فرماتا ہے کہ

وَ اِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ۔

پ۱۴ النحل ۱۶ ع ۹

ذرا چوپایوں میں تو سوچو ہم تمھیں جو ان کے پیٹ میں ہے پلاتے ہیں۔ اور گوبر اور خون کے درمیان سے صاف ستھرا دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے مزے کا ہوتا ہے۔

دوسری جگہ فرماتا ہے۔

وَ اِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِھَا وَلَکُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ کَثِیْرَۃٌ وَّمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ وَعَلَیْھَا وَعَلَی الْفُلْکِ تُحْمَلُوْنَ۔

پ۱۸ المومنون ۲۳ ع ۱

ذرا چوپایوں میں تو دھیان کرو تمھیں جو (دودھ) ان کے پیٹ میں ہے پلاتے ہیں اور تمھیں ان سے بے شمار فائدے ہیں اور بعضوں کو تو تم کھاتے ہو، ان پر نیز جہازوں پر تم سوار ہوتے ہو۔

اس بیان کو مزید تفصیل سے ایک اور جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ

جَعَلَ لَکُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْکَبُوْا مِنْھَا وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ وَلَکُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْھَا حَاجَۃً فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَعَلَیْھَا وَعَلَی الْفُلْکِ تُحْمَلُوْنَ۔

پ۲۴ المومن ۸۰ ع ۹

تمھارے لیے چوپایوں کو پیدا کیا تاکہ تم ان پر سواری کرو اور ان میں سے بعض کو کھاؤ اور ان میں تمھارے لیے فائدے ہیں اور انھیں اس لیے پیدا کیا کہ تم ان پر سوار ہو کر اپنی دلی خواہش کے مطابق منزل مقصود کو پہنچ جاؤ اور تم چوپایوں اور نیز جہازوں پر سوار کیے جاتے ہو۔

اسی طرح جانوروں کا گوشت بھی غذا کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ۔

پ۶ المائدہ ۵ ع ۱[1]

تمھارے لیے جانور حلال کیے گئے مگر وہ جانور جن کا تم سے تذکرہ کیا گیا ہے۔

---

[1] نیز یہی آیت پ۱۷ الحج ۲۲ ع ۴ میں بھی دوہرائی گئی ہے۔

جانوروں سے کھیتوں میں ناگر چلانے اور موٹ، رہٹ چلا کر زمین کو سیراب کرنے کا تذکرہ بھی قرآن مجید میں ہے۔

إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ
وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ۔
پ۱ بقر ۲ ع۸

کہ وہ ایک گائے ہے کہ محنت کرنے والی نہیں
وہ زمین پر ناگر تو کرتی ہے لیکن موٹ نہیں
چلاتی۔

مختصر یہ کہ بعض جانور سواری، زراعت اور مال ڈھونے کے کام آتے ہیں۔ تو بعض کا گوشت غذا کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور بعض کی ہڈی، بال، کھال دودھ وغیرہ کام آتے ہیں کہ

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ
أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ۔
وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ
وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ
وَمَشَارِبُ أَفَلَا يَشْكُرُونَ۔
پ۲۳ یٰس ۳۶ ع۵

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے دست
قدرت سے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے جن کے
یہ لوگ مالک ہوئے ہیں اور ہم نے انھیں ان کا
تابعدار بنا دیا جن میں سے بعض پر وہ سواری
کرتے ہیں اور بعضوں کو کھاتے ہیں، اور
ان میں بہت سے فائدے اور پینے کی چیزیں
ہیں۔ کیا پھر بھی شکر نہ کرو گے۔

قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام حیوانات انسان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، ان سے استفادہ کرنا اور دولت پیدا کرنا انسان کا کام ہے۔

بھیڑ بکریوں کی پرورش سے متعلق بھی قرآن مجید میں یہ ہے کہ حضرت شعیبؑ کی دونوں لڑکیاں بھیڑ بکریاں پالتی تھیں۔

قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ
پ۲۰ القصص ۲۸ ع۳

بولیں کہ ہم (اپنی بکریوں کو) پانی نہیں پلاتے
جب تک کہ چرواہے واپس نہ چلے جائیں۔

اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے قصے میں ہے کہ وہ بھی بھیڑ بکریاں پالا کرتے تھے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ! قَالَ:
هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا
عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ۔
قرآن پ۱۶ سورہ طٰہٰ

اے موسیٰ! تمھارے سیدھے ہاتھ میں کیا ہے؟ موسیٰ نے
کہا کہ میرا عصا ہے جس کو میں ٹیکتا ہوں اور اپنی بکریوں
کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور
دوسرے کام بھی ہیں۔

قرآن کی طرح حدیثوں میں بھی گلہ بانی سے متعلق حوالہ پایا جاتا ہے۔ گلہ بانی کے سلسلے میں صرف اتنا ہی شرف کافی ہے کہ خود سرورِ کائنات فرمایا کرتے تھے خدا کے ہر ایک نبی نے بکریاں چرائیں۔ صحابہ نے دریافت فرمایا اور آپ نے بھی؟ فرمایا: ہاں! میں بھی چند قیراطوں (سکوں) پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔[1]

رسول کریمؐ نے اُم ہانی بنت ابی طالب اپنی چچازاد بہن کو مشورہ دیا کہ "تم بکریاں پالا کرو کہ اس میں برکت رکھی ہے۔"[2]

دیگر صحابہؓ کو بھی آپ مشورہ دیتے کہ "بھیڑ بکریاں پالا کرو کہ اس میں برکت رکھی ہے۔"[3] "بھیڑ بکریاں پالا کرو کہ وہ صبح شام برکت لاتی ہیں۔"[4]

گھوڑوں کی تربیت و پرداخت کے متعلق بھی ہدایات پائی جاتی ہیں چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "گھوڑے کی پیشانی پر قیامت تک خیر وابستہ ہے۔"[5]

بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ جو مختلف صوبوں میں اعلیٰ افسر مقرر ہو کر گئے تھے وہ خود اسی قسم کی تعلیم دیتے تھے، چنانچہ عمرو بن العاصؓ فاتح مصر ایک دن جمعہ کے خطبے میں کہہ رہے تھے کہ

یَا مَعشَرَ النَّاسِ! اِنَّہُ قَدْ تَدَلَّتِ الجَوزَاءُ	اے لوگو! جوزہ ستارہ آسمان پر طلوع ہوا ہے
وَذَلَّتِ الشِّعرَیٰ۔ وَ اَقْلَعَتِ السَّمَاءُ	اور شعریٰ ستارہ ڈوب چکا ہے اور آسمان
وَارْتَفَعَ الوَبَاءُ۔ قَلَّ النَّدَیٰ وَطَابَ	صاف ہے اور وبا جا چکی ہے۔ سیلاب بھی ختم
المَرعیٰ و وَضَعَتِ الحَوَامِلُ وَدَرَجَتِ	ہو چکا ہے نیز مرغزار تر و تازہ ہے۔ بھیڑ
السَّخَائِلُ، وَعَلَی الرَّاعِی بِحُسنِ رَعِیَّتِہٖ	بکریوں کے بچوں کے لیے دودھ کی بہتات ہے
حُسْنُ النَّظَرِ فَحَیَّ لَکُمْ عَلیٰ بَرَکَۃِ اللّٰہِ	چرواہے کو چاہیے کہ اچھی طرح سے اپنے ریوڑ کی

[1] بخاری پ ۹ کتاب السلم فی الاجارات [2] ابن ماجہ باب اتخاذ الماشیہ خود اُم ہانی نے یہ بیان کیا ہے۔ نیز کنز العمال ج ۲ ص ۱۹۹ [3] کنز العمال ج ۲ ص ۱۹۹ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن۔
[4] کنز العمال ج ۲ ص ۱۱۹ [5] بخاری پ ۱۱ کتاب الجہاد نیز مسلم ابوداؤد وغیرہ۔

الیٰ ربیعکم فنالوا من خیرہ و لبنہ و خرافہ و صیدہ ۔ وانہ بعوا خیلکم و اسمنوھا و صونوھا و اکرموھا فانھا جنتکم من عدوکم و بھا مغانمکم و انفالکم[1]	حفاظت کرے ۔ خدا کی نعمتوں کو لیکر اپنے کھیتوں کو جاؤ ۔ اور دودھ سے اور اپنے بھیڑوں سے فائدے حاصل کرو اور اپنے گھوڑوں کو چراؤ اور انھیں موٹا تازہ کرو اور ان کی حفاظت کرو اور ان کی رکھوالی کرو اور پرورش کرو کیونکہ یہ تمھیں تمھارے دشمنوں سے بچاتے ہیں اور انہی کے ذریعے تم مال غنیمت اور دولت پاتے ہو ۔

مویشیوں کی نسلی ترقی گو کہ مسلمانوں کے مذہب میں کسی جانور کو معبود یا مقدس نہیں ٹھہرایا گیا ہے بلکہ ان کو بتایا گیا ہے کہ عام مویشی بھیڑ بکری، گائے بیل، اونٹ اور گھوڑے وغیرہ یہ سب انسانی خدمات بجالانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تاہم اس کے ساتھ یاد رہے کہ حدیثوں میں جہاں انسانوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا حکم ہے وہیں جانوروں پر بھی سختی نہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے ۔

بخاری شریف کی مشہور روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے ایک عورت کو جہنم میں محض اس لیے دیکھا کہ اُس نے ایک بلی پال رکھی تھی جسے نہ خود کھلاتی تھی اور نہ آزاد چھوڑتی تھی کہ وہ خود چل پھر کر کچھ کھالے ۔ اسی کتاب بخاری میں ایک دوسرا واقعہ ایک کتے کا ہے کہ ایک شخص کی مغفرت محض اس لیے ہوئی کہ ایک پیاسے کتے کو اس نے پانی پلادیا تھا[2]

ایک مرتبہ رسول کریمؐ گزر رہے تھے کہ سامنے ایک گدھے پر نظر پڑی جس کے منھ پر مارنے کے نشان تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ملعون ہے وہ جو ان جانوروں کے منھ پر مارتا ہے ۔ جانوروں سے چاندماری کھیل نے کی بھی اسلام میں سخت ممانعت کی گئی ہے ۔

[1] ۔ النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ ۔ جمال الدین ابی المحاسن یوسف بن تغری بردی الجز الاول صفحہ (۷۳)
[2] ۔ تفصیل بخاری پ۱۲ ۔

نباتاتی غذاؤں کے ساتھ انسانی خوراک میں اسلام نے چونکہ ایسی چیزوں کو بھی جائز قرار دیا ہے جو حیوانوں ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں مثلاً گوشت، چربی وغیرہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ناکارہ، بوڑھے، بانجھ جانور مسلمانوں کے علاقے میں بلاوجہ تندرست جوان جانوروں کا پیٹ نہیں کاٹتے۔

مسٹر ڈارلنگ، انجمن ہائے امداد باہمی پنجاب کے سابق ناظم نے لکھا ہے کہ "ہندوؤں کے علاقہ کی بہ نسبت جہاں گائے کی پوجا کی جاتی ہے اور مویشیوں کو ذبح نہیں کیا جاتا، مسلمانوں کا علاقہ مویشیوں کی افزائش نسل کے لیے زیادہ موزوں ہے اس لیے دریائے جہلم کے شمال میں جہاں مسلمانوں کی آبادی نوے فیصدی ہے مویشیوں کی نسل بڑھانا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ اور کہیں مشکل ہے کیونکہ دُبلے یا بوڑھے مویشیوں کو قصاب کے پاس فروخت کرنے کے خلاف سوائے ہندوؤں کی قلیل آبادی کے کسی میں ذرا بھی تعصب نہیں ہے اور یہ بات اور بھی کم دیکھنے میں آتی ہے کہ کسی بیل یا گائے کو ناکارہ ہونے پر بیار سے رکھا جاتا ہو، نہ کوئی مذہبی بنا پر آختہ کرنے پر اعتراض کرتا ہے اور نہ ٹیکہ لگوانے پر"

"ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمانوں کے علاقے میں جدید طریقوں کے مطابق مویشیوں کی نسل بڑھانا اس قدر قابل عمل ہے کہ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس کے بیے دریائے جہلم کے شمالی حصے کی بہ نسبت ستلج کے جنوب میں کیوں اس قدر زیادہ کوشش کی گئی ہے!"[1]

مرغبانی یا پرند پروری چرندے، پرندے بھی ایک دنیا لیے ہوئے ہیں قرآن پاک میں بتایا گیا ہے کہ

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم	زمین پر چلنے والے جانور اور اپنے بازوں پر اُڑنے والے پرندے میں کوئی ایسا نہیں مگر یہ کہ وہ بھی تمھاری طرح کی امتیں ہیں۔
پ الانعام ۶ ع ۴	

قرآن نے حضرت سلیمانؑ وحضرت داؤدؑ کے قصوں میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ

---

[1] ایم ڈارلنگ: دیہاتی زندگی ص۹۶ مطبوعہ پنجاب کواپریٹیو یونین۔

پرندے ان کے قابو میں کر دیے گئے تھے، اور وہ ان کی اطاعت کرتے تھے عام طور پر لوگ نامہ بری کا کام کبوتر کی ایک خاص قسم سے لیتے ہیں لیکن ہم سلیمان علیہ السلام کے قصے میں پڑھتے ہیں کہ نامہ و پیام کا بھی کام انھوں نے ہدہد نامی پرندے سے لیا تھا۔[1]

اگرچہ خیال یہ کیا جاتا ہے کہ انسان کی فطری غذاؤں سے پرندوں کا جو تعلق ہے وہ طب جدید کی کوئی نئی تحقیق ہے، لیکن قرآن میں جنتی زندگی میں جہاں کہیں لحمی خوراک کا ذکر ہے تو بجائے عام گوشت کے پرندکے گوشت ملنے کی خبر دی گئی ہے مثلاً ارشاد ہے۔

وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۔ اور پرندوں کا گوشت جو انھیں مرغوب ہو۔

پ ۲۷ الواقعہ ۱۶ ع ۱

بہر حال حدیثوں میں "مرغبانی" کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے، اگر ایک خاص طریقے سے مطلب یہ ہے کہ کاروبار کی بعض شکلوں میں زیادہ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے مالدار آدمی ہی اس میں ہاتھ ڈال سکتا ہے، لیکن بعض شکلیں ایسی بھی ہیں، جنھیں معمولی پونجی کا آدمی بھی چاہے تو اختیار کرکے اپنا پیٹ پال سکتا ہے "گلہ بانی" کا پیشہ زیادہ سرمائے کا طالب ہے لیکن اس کے مقابلے میں مرغبانی کا کام دو تین روپے سے بھی چاہے تو شروع کیا جا سکتا ہے، میرا خیال ہے کہ اس نکتے کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ گلہ بانی کے کام کو سرمایہ دار اپنے ہاتھ میں لیں کہ وہی صحیح طور پر منفعت بخش طریقہ سے اس کو انجام دے سکتے ہیں لیکن غریبوں کو آپ نے حکم دیا کہ مرغبانی وغیرہ ایسے پیشے اختیار کریں جن کی نفع بخشی کے لیے زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں، چنانچہ حدیثوں میں آیا ہے کہ

أَمَرَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْأَغْنِيَاءَ بِاتِّخَاذِ الْغَنَمِ، وَأَمَرَ الْفُقَرَاءَ بِاتِّخَاذِ الدَّجَاجِ[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالداروں کو حکم دیا کہ بکریاں پالیں۔ اور غریبوں کو حکم دیا کہ مرغیاں پالیں۔

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو قرآن پ ۱۹ سورہ النمل ۲۷ ع ۲۔

[2] ابن ماجہ، باب اتخاذ الماشیہ ۔ نیز کنز العمال ج ۲ ص ۱۹۹

ایک حدیث قابل غور ہے، ارشاد ہے کہ

عِنْدَ اِتِّخَاذِ الْاَغْنِيَاءِ الدَّجَاجَ يَاذَنُ اللّٰهُ هَلَاكَ الْقُرٰى[1]

جب سرمایہ داروں کا طبقہ مرغبانی کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیگا تو خدا حکم دیگا بستیوں کو وہ اُجاڑ ہو جائیں۔

مذکورہ مقولہ کا منشاء بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرغبانی کم سرمایے کا کاروبار ہے اس کے لیے تھوڑے سے زمین کے حصے سے زیادہ جگہ درکار نہیں۔ اگر دولتمند بھی یہ کاروبار کرنے لگیں تو غریبوں کے لیے روزی کے ذریعے بند ہو جائیں گے اور ملک کے اس طبقہ کی بے روزگاری نے ہمیشہ امن و امان کو برباد کر کے رکھ دیا ہے، گویا تمثیلی رنگ میں ہم اسے ایک بڑی اہم معاشی بنیاد قرار دیسکتے ہیں گو حدیث کے صحیح ہونے میں کلام ہے لیکن اس سے یہ اصول حاصل ہوتا ہے کہ سرمایہ داروں کو ہمیشہ اس کا خیال کرنا چاہیئے کہ ان کے حرص و ہوا کی وجہ سے غریبوں میں بیروزگاری نہ پھیلے ورنہ ملک تباہ ہو جائیگا۔

بہر حال انسان پرندوں کو یا تو ان کے گوشت اور انڈوں سے دولت حاصل کرنے کی غرض سے پالتا ہے یا ان کے پروں سے کام لیتا ہے یا نمائش کی غرض سے یا شکار[2] کرنے کی غرض سے پالتا ہے۔

جنگلی پرندوں مثلاً شتر مرغ۔ مور وغیرہ کے پروں سے زینت وغیرہ کا کام لینا قدیم زمانے سے رائج ہے اور عرب میں بھی شتر مرغ کے پَر استعمال کیے جاتے تھے "امیہ نے مجھ سے پوچھا کہ تم میں وہ کون ہے جس کے سینے پر شتر مرغ کا پَر نشان کے طور پر لگا ہوا ہے۔ میں نے کہا وہ حمزہ بن عبد المطلب ہیں"[3]

---

[1] ابن ماجہ نیز کنز العمال ج ۲ صفحہ ۱۹۹۔
بعضوں نے اس حدیث کو موضوع بتایا ہے کیونکہ راویوں میں ایک راوی علی بن عروہ ضعیف اور واضع حدیث ہے۔ [2]۔ شکار کے تحت قرآن میں جو لفظ "جوارح" استعمال ہوا ہے وہ عربی میں نہ صرف کتے اور چیتے وغیرہ کے لیے مستعمل ہے بلکہ باز شکرے وغیرہ شکاری پرندوں کے لیے بھی مستعمل ہے ملاحظہ ہو تفسیر طبری ج ۶ آیت:۔ وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ۔

[3] تاریخ طبری صفحہ ۱۳۲۲ حالات جنگ بدر۔

مگس پروری اور کرم پروری

انسان مگس کی پیداوار شہد اور موم سے بھی دولت پیدا کرتا ہے مگس پروری کی اہمیت خود یوں بھی ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن مجید کے ایک سورے کا نام النحل (شہد کی مکھی) رکھا گیا ہے۔

قرآن مجید میں شہد کی مکھی سے جو دولت پیدا کی جاتی ہے اس کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۔ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۔	اور تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی کو یہ حکم دیا کہ وہ پہاڑوں، درختوں اور جہاں کہ لوگ چھتریاں ڈالتے ہیں وہاں اپنے چھتے بنائے، پھر تمام میوے کھائے اور پروردگار کی تابعداری سے چلے، ان کے پیٹ سے رنگ برنگ کی پینے کی چیزیں نکلتی ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفا رکھی ہے بے شک جو لوگ سوچ بچار کرتے ہیں ان کے لیے ایک دھیان دینے کی نشانی ہے۔
پ ۱۴ النحل ۱۲ع ۹	

بلکہ مذکورہ آیتوں کے آخر میں "فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ" کے جو الفاظ ہیں، اگر ان پر غور کیا جائے تو ایک مستقل طبی کتب خیال کی اسے بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ شہد کی مکھیاں جیسا کہ معلوم ہے کہ ہر قسم کے نباتاتی پھولوں اور پھلوں کے رس کو چوستی ہیں اور یہی رس ان کے اندر پہنچکر "نحل" یعنی شہد کی شکل اختیار کر لیتا ہے، قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۔ یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ ۔	یہ تمام میوے کھا اور پروردگار کی راہوں میں تابعداری سے چل۔ ان کے پیٹ سے رنگ برنگ کی پینے کی چیزیں نکلتی ہیں۔
پ ۱۴ النحل ۱۲ع ۹	

اطبا اس قسم کے نباتاتی جوہر کو نباتات سے حاصل کرنے کی غرض سے

طرح طرح کی مصنوعی ترکیبیں قرع انبیق وغیرہ کے ذریعے اختیار کرتے ہیں اگر ان ذریعوں کے بجائے شہد کی مکھیوں ہی کو ان نباتاتی جوہروں کی تقطیر کا ذریعہ بنا لیا جائے اور جس بیماری میں جن جن نباتاتی دواؤں کے استعمال کی ضرورت ہو بجائے ان دواؤں کے ان ہی مصفی جوہروں کو استعمال کیا جائے جنھیں شہد کی مکھیوں نے نکالا ہو تو دواؤں کے متعلق یہ سارے جھگڑے جو نسخوں میں لکھے جاتے ہیں یعنی "کوفتہ بیختہ شب درآب ترکردہ صبح جوشانیدہ د مالیدہ و در نبات سفید آمیختہ بنوشند" کی کوئی ضرورت ہی باقی نہ رہے بلکہ ان ساری منزلوں کو یہاں تک کہ نبات سفید کی شرکت تک کے کام کو ہماری شہد کی مکھیوں ہی سے لیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد

فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ اس میں لوگوں کے لیے شفا[۱] رکھی ہے۔

یہ راز بھی بنی آدم پہ واضح ہو سکتا ہے کہ گویا بجائے مفرد دواؤں اور نباتاتی دوا کے شہد ہی کو علاج کے لیے اختیار کیا جائے تو "الناس" کے امراض کی شفا میں "شہد" سے بطور ایک مستقل سسٹم کے کام لیا جا سکتا ہے یہ خیال ابھی خوش خیالی سمجھا جائے گا لیکن علم طب نے جو ترقی کی ہے اس کے پیش نظر کیا عجب ہے کہ یہ خیال عملی جامہ بھی پہن لے۔

مگس پروری کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض صحابۂ کرامؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شہد کی ان مکھیوں کی پرورش کا کام بڑے پیمانے پر کرتے تھے[۲]۔

کرم پروری سے متعلق بھی قرآن مجید سے اشارے نکالے جا سکتے ہیں مثلاً قرآن مجید کی ذیلی آیت کو لیجیے

---

[۱] - اکثر اطباء اور ڈاکٹروں نے شہد کو صحت انسانی کے لیے ازبس مفید قرار دیا ہے حتیٰ کہ بعض امریکی محققوں نے شہد، جَو اور زیتون ان تین چیزوں کو صحت کے معیار سے بہترین غذا ثابت کیا ہے اور یوں بھی طبی طبقوں میں یہ سب چیزیں اعلیٰ تسلیم کی جاتی ہیں۔

[۲] - الوثائق السیاسیہ دستاویز (۱۶۴) بحوالہ ابن سعد ۱/۳ صفحہ ۲۵ نیز ابوداؤد اور نسائی کے کتاب الزکوٰۃ۔

لِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ — ان کی پوشاک ریشم کی ہے۔

(ب) نباتات سے استفادہ

جنگل کاٹنا جس طرح انسان حیوانات کا شکار کرکے ان سے دولت حاصل کرتا چلا آتا ہے، اسی طرح وہ جنگل جاکر لکڑیاں کاٹتا اور ان سے بھی دولت پیدا کرتا ہے۔

قرآن مجید میں جنگلوں سے دولت پیدا کرنے کے متعلق بھی اشارے پائے جاتے ہیں

جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ۔ — ہرے بھرے درخت سے آگ بنائی اور اب تم اس سے سلگاتے ہو۔

پ۲۳ یٰس ۵۲ ع۵

اور ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

أَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ۔ ءَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِلْمُقْوِينَ۔ — کیا تم نے اس آگ کو بھی دیکھا ہے جسے تم سلگاتے ہو؟ آیا تم نے اس درخت[1] کو پیدا کیا ہے یا ہم نے پیدا کیا ہے؟ اور ہم نے اس (درخت) کو مسافروں کی نصیحت اور ان کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے۔

پ۲۷ الواقعہ ۵۶ ع۳

جنگلوں کے درختوں سے جو دولت حاصل کی جاسکتی ہے اس کا یوں تذکرہ ہوا ہے کہ

---

[1] بعضوں نے خاص قسم کے ان درختوں کا اشارہ قرار دیا ہے جو جنگلوں میں پائے جاتے ہیں، جن کی ہری بھری ڈالیوں تک میں ان کی یہ خصوصیت ہے کہ ایک ڈال کسی دوسری ہری بھری ڈالی پر گر پڑتی تو اس رگڑ سے آگ نکل پڑتی۔ لیکن ہر درخت چونکہ لکڑی ہی ہے اور آگ لکڑی ہی سے نکلتی ہے۔ اس لیے آگ کی طرف شجر کا انتساب صحیح ہے۔ یجر وید کے ایک منتر میں ہے۔" آیئے اگنی تو خوبصورت بچہ ہے پودوں سے نکلا ہوا" (۲۲) ادھیائے (۱۱)

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ۔
پ۱۸ المومنون ۲۳ ع۱

اور ایک ایسے درخت کو پیدا کیا جو طور سینا پر اُگتا ہے اور جو روغن نکالتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن کا کام دیتا ہے۔

حدیثوں میں بھی جنگلوں کی لکڑی سے دولت پیدا کرنے سے متعلق یہ ترغیبی کلمات پائے جاتے ہیں کہ "رسول کریمؐ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! کہ یہ بات کہ کوئی شخص تم میں سے رسی لیکر جنگل جائے۔ لکڑی کاٹے اور اس کو اپنی پیٹھ پر لاد کر بیچے اس کے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ کسی شخص کے پاس جائے اور اس سے سوال کرے۔ (اور یہ بھی نہیں معلوم کہ) وہ اس کو دے یا نہ دے[1]"

بن چرائی جنگلات سے لکڑی کے علاوہ قدرت نے چراگاہیں بنائی ہیں۔ جن میں گھاس پات اگتی ہے گھاس پات کے علاوہ وہاں بعض جڑی بوٹیاں بھی اگتی ہیں، جڑی بوٹیاں کھانے کے علاوہ دواؤں وغیرہ کے کام بھی آتی ہیں چنانچہ قرآن مجید میں اس کی نسبت یہ ہے کہ :-

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى۔ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ۔
پ۱۶ طٰہٰ ۲۰ ع۲

اور آسمان سے پانی برسایا اور اس سے طرح طرح کی سبزی اگائی کہ خود بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ

ایک اور جگہ یوں ہے کہ :-

اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ۔
پ۳۰ والنازعات ۷۹ ع۲

اور زمین سے چارہ اور پانی نکالا اور پہاڑ کو جمایا جس میں تمھارا اور تمھارے جانوروں کا فائدہ ہے۔

جنگل میں ایسے درخت بھی اُگتے ہیں جو جانوروں کی غذا ہیں چنانچہ بیان ہوا کہ

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ۔ پ۱۴ النحل ۱۶ ع۲

تمھارے لیے پانی برسایا جو تمھارے پینے کے کام آتا ہے اسی سے درخت نشوونما پاتا جسے تم اپنے جانوروں کو چراتے ہو۔

غرض جنگلات ہوں یا چراگاہیں ان سے یا تو انسان براہ راست خود ہی دولت پیدا کرتا ہے یا جانور استفادہ کرتے ہیں اور پھر جانوروں سے انسان ہی تو دولت پیدا کرتا ہے۔

[1] بخاری پ۶ کتاب الزکوٰۃ نیز بخاری پ۸ کتاب البیوع نیز بخاری پ۹ کتاب المساقات نیز مسلم وغیرہ۔

زراعت اور باغبانی جس طرح انسان مویشیوں کی پرورش کرتا اور ان سے دولت حاصل کرتا ہے، اسی طرح وہ جنگلات کے خود رو نباتی اشیاء کے علاوہ غذائی نباتات کو اُگاتا اور ان کی پیداوار سے دولت حاصل کرتا ہے، ہماری غذا کا بڑا حصہ زیادہ تر زراعت و باغبانی ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اس لیے زراعت و باغبانی کو سب سے زیادہ اہمیت ہے۔

اصول مکاسب میں زراعت و باغبانی کے متعلق تو یہ حال ہے کہ قرآنی بیانوں کا بڑا حصہ جس میں خدا کی نشانیوں پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے ان میں زیادہ تر کھیتی اور باغبانی کا ہی نظام پیش کیا گیا ہے، بادلوں کا آنا، کھیتوں کا لہلہانا، باغوں کی سرسبزی اور ان سے انسان کا مختلف طریقوں سے استفادہ کرنا سب کو عجیب انداز میں واضح کیا ہے کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ۔

پ۲۷ الواقعہ ۵۶ ع۲

بھلا کبھی سوچتے بھی ہو، جو تم تخم ریزی کرتے ہو۔ آیا ہم اسے اُگاتے ہیں یا تم اُگاتے ہو؟

کبھی ارشاد فرماتا ہے کہ

هُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ۔

پ۸ الانعام ع۱۷

وہ خدا ہی تو ہے جس نے باغات اُگائے جن میں ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے بھی ہیں اور بن ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے بھی ہیں اور کھجور کے درخت اور کھیتی اگائی جن کے مزے مختلف ہیں نیز زیتون اور انار کے درخت اُگائے بعض تو مزے اور شکل میں یکساں ہوتے ہیں اور غیر یکساں بھی اور جب پھل پک جائیں تو انھیں کھاؤ۔

کبھی ایماء ہوتا ہے کہ:۔

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ۔ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا۔ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا۔ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّ

انسان کو چاہیے کہ ذرا اپنے کھانے پر بھی نظر ڈالے۔ ہم نے زور شور سے پانی برسایا اور زمین کو پھاڑ ڈالا۔ پھر زمین سے انگور۔

قَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ
پ ۳۰ عبس ۸۰ ع ۱

کھجور، زیتون، ترکاری، اور اناج اگائے اور گھنے باغات اگائے اور میوہ اور چارہ بھی جو تمھارے اور تمھارے جانوروں کے فائدے کے لیے ہے۔

غرض اس قسم کی آیتوں کی کافی تعداد قرآن مجید میں موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا قرآن کسی ایسی قوم پر نازل ہوا ہے اور ایسے لوگوں کو بلا رہا ہے جو کہ عام طور پر کھیتی اور باغبانی میں مصروف ہیں۔

قرآن نے نباتات سے جو چیزیں نکالی جاتی ہیں، ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا۔ پ النحل ع ۹

کھجور اور انگور سے تم نشہ آور شئے اور عمدہ روزی بناتے ہو۔

قدرت نے زمین میں ایسی قابلیت رکھ دی ہے کہ انسان ہزاروں سال سے زمین سے کام لیتا چلا آرہا ہے، اس پر بھی اس میں درختوں کو نشو ونما دینے کی قابلیت جوں کی توں باقی ہے یا پھر عود کر آتی ہے۔ زمین میں قدرت نے انسانی معاش کا جو سامان مہیا کیا ہے اس کا ذکر ہے کہ

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ۔ پ الاعراف ع ۱

بے شک ہم نے تمھیں زمین پر بسایا اور اسی میں تمھارا روزگار بھی پیدا کیا۔

معاش کا سامان زمین میں کس طرح کیا گیا ہے، اس کے متعلق قرآن خبر دیتا ہے کہ

وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا۔
پ حم السجدہ ع ۲

ہم نے ناپ تول کر زمین میں قوت (خوراک) کے ذخیرے کو محفوظ کیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا ہے

سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ

ڈھونڈنے والوں کے لیے برابر کر دیا۔

اس ارشاد کے ذریعے اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ تلاش اور جستجو کرنے والوں کے لیے اسے برابر کر دیا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے

انسان اور پھر انسان کے ساتھ دوسرے حیوانات چرند پرند سب اسی کو خرچ کر رہے ہیں، مگر ہر ڈھونڈنے والے کو برابر پہنچ رہا ہے، اسی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ

جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ
پ ۲۹ الملک ۶۷ ع ۲

تمہارے لیے زمین کو فرش راہ بنادیا کہ تم اس کی راہوں میں چلو اور اسی کے رزق کو کھاؤ اور اسی کی طرف جی کر اٹھنا ہے۔

گویا انسان زمین کی ذلولیت سے جس قدر استفادہ کرتا چلا جائے، اسی قدر اس کو رزق ملتا چلا جائے گا۔

بڑے پیمانے پر زراعت او کاشت کاری

زراعت ہی کے سلسلے میں یہ بات بھی کہنے کی ہے کہ بعض صحابۂ کرام جیسے حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہ بڑے پیمانے پر کاشت کیا کرتے تھے، چنانچہ مورخین کا بیان ہے کہ "عمرو بن العاصؓ کا طائف سے تین میل پر وھط نامی ایک قریہ تھا جس میں انھوں نے دس لاکھ انگور کی بیلیں چڑھائی تھیں اور ہر بیل کے انگور ایک درہم میں فروخت ہوتے تھے[1]"

(ج) جمادات سے استفادہ

انسان حیوانات و نباتات کے علاوہ جمادات سے بھی دولت پیدا کرتا ہے۔

زمین کے اوپری پرت کو وہ نہ صرف زراعت و باغبانی کے لیے استعمال کرتا چلا آرہا ہے بلکہ زمین پر ہی وہ بستا ہے مکانات بنا کر رہتا ہے اسی میں سڑکیں بناتا ہے، دکانات اور فیاکٹریاں قائم کرتا ہے مکان بنانے کے سلسلے میں خود زمین ہی کی مٹی پتھر اور چونا وغیرہ استعمال کرتا ہے۔

پیدائش دولت کے ذرائع میں ایک تو وہ دولت ہے جس کو وہ زمین ہی کے شکم سے نکال رہا ہے یعنے معدنیات، اور دوسرے وہ دولت ہے جو وہ تہ آب سے

---

[1] - یاقوت: معجم البلدان ج ۸ صفحہ ۴۲۳، عنوان وھط

نکال رہا ہے مثلاً موتی، مونگا، اسپونج وغیرہ۔

کان کنی زمین کے نیچے قدرت نے معدنی دولت کے بے شمار خزانے محفوظ کر رکھے ہیں۔ انسان اس معدنی دولت کے استفادے سے بھی اپنی دولت میں خاطر خواہ اضافہ کر رہا ہے۔ زمین کے شکم سے جواہرات اور معدنی دولت برآمد کرنے کا ذکر بھی قرآن مجید میں پایا جاتا ہے چنانچہ حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ میں ہے کہ

وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ ہم نے ان کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ رواں کر دیا۔

پ ۲۲ السباء ۴۴ ع ۲

اسی طرح کانوں سے جو لوہا نکالا جاتا ہے اُن کی طرف اشارہ ہے

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ پ ۲۷ الحدید، ۵ ع ۳ اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں بڑی سختی ہوتی ہے اور اس میں لوگوں کے لیے طرح طرح کے فائدے ہیں۔

زمین کے اندر جو معدنی دولت پوشیدہ ہے اس کے استفادے سے متعلق حدیثوں میں بھی ترغیبیں پائی جاتی ہیں چنانچہ حضرت عائشہؓ سے روایت کی گئی ہے حضور انورؐ نے فرمایا کہ

اُطْلُبُوا الرِّزْقَ فِي خَبَايَا الْأَرْضِ[1] روزی کو زمین کے پوشیدہ سرمائے میں تلاش کرو

یہاں یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ بعض صحابۂ کرام بھی کان کنی کیا کرتے تھے اس کی کچھ تفصیل آئندہ تقسیم دولت کے تحت پیش کی گئی ہے۔

سمندر کی تہ سے اشیاء کی برآمد انسان مال و دولت کا ایسا دلدادہ ہے کہ وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر سمندر کے اندر سے موتی، مونگا وغیرہ نکالتا ہے۔ زمین کے اندر سے معدنیات کا نکالنا تو اتنا زیادہ خطرناک نہیں ہے جتنا کہ سمندر کے اندر سے چیزوں کا نکالنا۔ قرآن میں سمندر کے منافع کے ذکر میں اس طرح ہے کہ

سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا۔ تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ اس سے تازہ بتازہ گوشت کھاؤ اور اس سے موتیوں وغیرہ کا گہنا نکالتے ہو جسے تم پہنتے ہو۔

پ ۱۴ النحل ۱۶ ع ۲

---

[1] طبرانی نیز کنز العمال ج ۲۔

اور ایک جگہ یوں ہے کہ

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ

پ۲۷ الرحمٰن ۵۵ ع۱

ان دونوں (سمندروں) سے موتی اور مونگا نکلتے ہیں۔

پھر اور ایک جگہ ارشاد ہے کہ

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ ۔ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۔

پ۲۲ فاطر ۳۵ ع۲

اس کی قدرت تو دیکھو کہ دونوں دریا باوجود مل جانے کے برابر نہیں ہوسکتے ان میں سے ایک تو شیریں خوشگوار اور پیاس بجھانے والا ہے اور دوسرا ہے کہ اس کا پانی کھارا اور تلخ ہے ہر ایک سے مچھلیوں کا تازہ بہ تازہ گوشت کھاتے ہو اور موتیوں وغیرہ کو نکال کر گہنا بناتے ہو، جسے تم پہنتے ہو۔

عطیاتِ قدرت پر انسان کا تصرف آئے دن بڑھ رہا ہے اور اب تو وہ بھاپ سے برق سے آبشاروں سے ہوا کی موجوں سے کام لے رہا ہے۔ لیکن ابھی دیگر عطیاتِ قدرت جیسے سورج کی روشنی، سمندر کے مدوجزر (جوار بھاٹا) ہوا کے جھونکوں اسی طرح معدنیات اور بیسیوں جڑی بوٹیوں اور سب سے بڑھ کر جوہری طاقت وغیرہ سے بڑے پیمانے پر اور کام لینے باقی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی واضح کیا ہے اور پھر اشارہ کرتے ہیں کہ قرآن اپنے ماننے والوں پر یہ لازم کرتا ہے کہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے، جب تک اس کی ہر ہر چیز کے متعلق یہ ثابت نہ کرلیں کہ وہ انسان کی کس ضرورت میں کام آتی ہے اور کیونکر ان سے دولت حاصل کی جاسکتی ہے ان کی آسمانی کتاب کی تفسیر پوری نہیں ہوسکتی۔

(د) صنعت و حرفت

عطیاتِ قدرت سے استفادے کے سلسلے میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان حیوانات۔ نباتات اور جمادات سے دولت حاصل کرتا ہے۔ لیکن ان سے

جو خام پیداوار حاصل ہوتی ہے، وہ انھیں براہِ راست بہت ہی کم استعمال کرتا ہے البتہ وہ ان کی شکل بدل کر اپنے کام میں لاتا ہے مثلاً بھیڑوں سے اُون حاصل کرتا ہے اور اُون سے وہ بیسیوں قسم کے لباس بناتا ہے۔ اسی طرح لوہے سے سینکڑوں قسم کے کل پُرزے آلات، اوزار اور ہتیار بناتا ہے، ایک لکڑی ہی کو لیجئے خام حالت میں وہ صرف جلانے کے کام آتی ہے لیکن اسی سے کشتیاں اور جہاز تیار ہوتے ہیں۔ عمارتی سامان تیار ہوتا ہے فرنیچر تیار ہوتا ہے، پھر لکڑی کے گودے سے کاغذ تیار ہوتا ہے بلکہ اس کے علاوہ اب تو ایک قسم کا لباس بھی تیار ہونے لگا ہے۔

خام پیداوار کی صورت شکل اور ترکیب بدلنے سے ان کی افادیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اور یہی صنعت و حرفت ہے جس سے انسانی دولت میں بے انتہا اضافہ ہو جاتا ہے جو صنعتیں صرف انسانی ہاتھوں سے راست تیار ہوتی ہیں انھیں دستکاریوں سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو کل پرزوں کی مدد سے تیار ہوتی ہیں انھیں صنعتوں سے تعبیر کرتے ہیں انسان آج سے نہیں بلکہ صدیوں اور کئی ہزار برس پہلے سے صنعت و حرفت کے کاروبار میں مشغول ہے۔

چنانچہ اس بارے میں خود قرآن مجید میں اشارے پائے جاتے ہیں معمولی دستکاری ہی نہیں بلکہ ایسی صنعتیں جن میں لوہے کو پگھلا پگھلا کر بڑے بڑے کل پرزے اور نازک نازک چھوٹی چھوٹی مصنوعات بنائی جاتی ہیں، قرآن میں ان کا بھی تذکرہ ہے۔ ان آیتوں سے جہاں زمانۂ گذشتہ کی صنعتی تاریخ کا مواد فراہم ہوتا ہے وہاں یہ دلالت بھی ہوتی ہے کہ قرآن کے پڑھنے والے بھی ان حالات میں کہ جن میں پہلے لوگوں نے یہ صنعتیں اختیار کی تھیں، یہ صنعتیں جاری کریں۔

جہازسازی قرآن مجید حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے پڑھنے والوں کے سامنے اس شکل میں پیش کرتا ہے کہ بڑے بڑے شہتیروں کو وہ جہازی تختوں میں بدل کے ان میں "دسر" اور لوہے کی میخیں ٹھوک رہے ہیں۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ - پ۱۲ ہود ۱۱ع نوحؑ کشتی بنارہے ہیں۔

کیسی کشتی ؟!

ذَاتَ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ تختوں اور میخوں والی
پ۲۷ القمر ۴ ع ۱

پھر اس کشتی کی وسعت کا خاکہ اس طرح پیش کیا ہے کہ
وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ۔ وہ کشتی موج میں ایسی بہتی ہے گویا کہ پہاڑ ہے۔
پ۱۲ ہود ۱۱ ع ۴

گویا وہ آج کل کا بڑا جہاز تھا۔

دھاتی صنعتیں (میٹل انڈسٹریز) اسی طرح قرآن پاک حضرت داؤد علیہ السلام کو "ذوالاید" (دستکار) کے خطاب سے مخاطب کرکے یہ نقشہ پیش کرتا ہے کہ لوہے کو گلا گلا کران کو باریک تاروں میں بدل رہے ہیں۔ اور موڑ موڑ کران سے زرہ کی کڑیاں بنارہے ہیں اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس صنعت میں ان کی رہنمائی اس طرح ہورہی ہے کہ

أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ لوہے کی زرہیں بنا اور اندازے سے اس کی کڑیاں جوڑ
پ۲۲ السبا ۳۴ ع ۲

کہیں حضرت سلیمانؑ کے کارخانے کا ذکر ہورہا ہے اور کام کرنے والے صناع کاریگر تماثیل سازی (مجسمہ سازی) ظروف سازی وغیرہ میں مشغول ہیں اور کیسے کیسے ظروف اور برتن جیسے بڑی بڑی دیگیں، دیگچے، حوضوں کے سے لگن اور بائیلرس مختلف کارخانوں (فیکٹریوں) میں بن رہے ہیں کہ

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَاسِيَاتٍ ؕ وہ (کاریگر) سلیمان کے لیے جو وہ چاہتے تھے بناتے تھے قلعے، مجسمے، اور حوضوں کے سے لگن اور ایک جگہ جمی ہوئی دیگیں (بائیلرس)
اِعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا۔ کام کرو داؤدؑ کے گھرانے والو حق مان کر
پ۲۲ السبا ۳۴ ع ۲

اسی طرح ذوالقرنین کے بیان میں لوہے کی چادروں، پگھلے ہوئے تانبے اور رانگ کی دیوار کا پتہ ملتا ہے کہ

آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ تم میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ (چنانچہ

بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ: انْفُخُوا حَتّٰى إِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ: اٰتُوْنِيْٓ أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا۔
پ ۱۶ کہف ۱۸ ع ۱۱

جب وہ لے آئے تو ایک بڑی دیوار بنائی) یہاں تک کہ جب دونوں کے درمیان میں اس دیوار کو ان ہی کے برابر بلند کر دیا تو کہا دھونکو یہاں تک کہ جب اس کو آگ سا گرم کر دیا تو کہنے لگا کہ پگھلا ہوا تانبا مجھے دو کہ میں اس پر ڈالوں گا۔

ترابیاتی صنعتیں I
(سرامک انڈسٹریز)

ان ہی قرآنی آیتوں میں فرعون (شہنشاہ مصر) اپنے وزیر ہامان کو پکی اینٹوں سے ایک مینارے کی تعمیر کا حکم دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

فَأَوْقِدْ لِيْ يَا هَامَانُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا۔ پ ۲۰ القصص ۲۸ ع ۴

اے ہامان! مٹی کے گارے کو جلا اور میرے لیے ایک مینار بنا۔

I جامعہ عثمانیہ کی یہ اصطلاح ممکن ہے کہ آپ کو انوکھی معلوم ہو۔ مٹی یا مٹی کی جنس سے جو مصنوعات تیار کی جاتی ہیں انھیں ترابیاتی صنعتوں (سرامک انڈسٹریز) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں تراب مٹی کو کہتے ہیں۔ خود قرآن پاک میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ آخرت میں جب کافر اپنے اعمال کی سزا کا منظر دیکھیں گے تو کہیں گے کہ

وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابًا
پ ۳۰ نباء ۷۸ ع ۲

کافر کہے گا۔ اے کاش! کہ میں مٹی ہوتا

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ حدیث بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ مدینے کی مسجد نبوی کے فرش خاک پر ہی استراحت فرما رہے تھے۔ ناگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے دیکھا کہ ان کی پیٹھ سے چادر گر گئی ہے اور پشت گرد آلود ہو گئی ہے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پشت کو صاف کرتے جاتے تھے، اور فرماتے تھے اے ابو تراب اٹھو! اے ابو تراب اٹھو! (یوں دو مرتبہ فرمایا) راوی کا بیان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ابو تراب کا لقب جتنا پسند تھا اور کوئی نام اتنا پسند نہ تھا۔

(بخاری پ ۱۴ فضائل حضرت علی کرم اللہ وجہہ نیز تاریخ طبری صفحہ ۱۲۷۳ سنہ ۲ ھ کے واقعات)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں ہے کہ وہ اپنے بچپن میں مٹی کے کھلونے چڑیا وغیرہ بناتے تھے

اِنّی اَخلُقُ لَکُمْ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ — میں تم لوگوں کے لیے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسے پرند کی شکل ہوتی ہے۔

پ ۳ آل عمران ۳ ع ۱۵

ترابیاتی صنعتوں کے منجملہ شیشہ سازی کا بھی قرآن میں تذکرہ ہے جو ترابیاتی صنعتوں کی ایک شاخ ہے اس میں سلیمان علیہ السلام کے شیش محل (کرسٹل پیالیس) کا بھی ذکر ہے چنانچہ سلیمانی عہد کی تعمیری ارتقار کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ

صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ — ایک محل (تھا) جس میں آئینے جڑے ہوئے تھے

پ ۱۹ النمل ۲۷ ع ۳

پارچہ بافی وغیرہ (ٹکسٹائیل انڈسٹری)

صنعت پارچہ بافی، بلانکٹ سازی، خیمہ سازی کی طرف ذیلی آیت میں رہبری کی گئی ہے۔

وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَھَا یَوْمَ ظَعْنِکُمْ وَیَوْمَ اِقَامَتِکُمْ وَمِنْ اَصْوَافِھَا وَاَوْبَارِھَا وَاَشْعَارِھَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ۔

پ ۱۴ النحل ۱۶ ع ۱۱

اور تمھارے لیے چوپایوں کی کھال سے ڈیرے بنائے جنھیں تم اپنے سفر کے دن ہلکا پاتے ہو (کہ جہاں چاہو لیجا سکو) اور اپنے قیام کے دنوں میں اور بھیڑوں کے بالوں، اونٹوں کے بالوں اور بکریوں کے بالوں سے اسباب بنائے اور ایک مدت تک کے لیے کام آنیوالی چیزیں بنالیں۔

اسی طرح گرمائی لباس اور جنگی لباس کا یہ تذکرہ ہے کہ

وَجَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ۔

پ ۱۴ النحل ۱۶ ع ۱۱

اور تمھارے لیے کپڑے بنائے جو تمھیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ڈریس (زرہ وغیرہ) جو جنگ میں تمھاری حفاظت کرتے ہیں۔

ریشم سازی (سلک انڈسٹری)

ریشم سازی کی صنعت سے متعلق بھی قرآن سے مواد فراہم ہوسکتا ہے مثلاً جنتیوں کے لباس کے تذکرے میں یہ بیان کہ

لِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ — ان کی پوشاک ریشم کی ہے

پ ۱۷ سورہ حج ۲۲ ع ۳

یا مثلاً ارشاد ہوا ہے کہ

عَلِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ — ان کی پوشاکیں گاڑھے اور باریک سبز ریشم کی ہیں۔

پ ۲۹ الدہر ۷۶ ع ۱

یا مثلاً

وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ — اور گاڑھے اور پتلے ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے اور صوفوں پر تکیہ لگائے بیٹھیں گے

پ ۱۵ الکہف ۱۸ ع ۴

مذکورۂ بالا آیتوں سے ہی رنگ سازی اور رنگریزی کے متعلق بھی اشارے نکالے جا سکتے ہیں لیکن ہم ایسی تفصیل میں نہ جائیں گے۔

زیور سازی خوشنما لباس کے ساتھ خوش وضع زیورات بھی مستورات کے لیے لازم و ملزوم ہیں جنتیوں کے لباس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذکر ہے کہ

وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ — انھیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

پ ۲۹ الدہر ۷۶ ع ۱

چاندی کے زیوروں کے علاوہ سونے کے زیورات بھی انھیں ملیں گے۔

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ — اور وہ وہاں سونے کے کنگن پہنیں گے۔

پ ۱۵ الکہف ۱۸ ع ۴

سونے اور چاندی کے زیورات تو رہے ایک طرف ہیرے، جواہرات، جڑاؤ زیوروں کے علاوہ موتیوں کے زیوروں کا ذکر بھی ہے۔

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ — اور انھیں سونے کے کنگن اور موتیوں کا گہنا پہنایا جائے گا اور ان کی پوشاکیں ریشم کی ہوں گی۔

پ ۱۷ الحج ۲۲ ع ۳

قالین بافی اور فرنیچر سازی جس طرح مستورات کے بناؤ سنگھار کے لیے خوشنما لباس

اور خوش وضع زیوروں کی ضرورت ہے، اسی طرح کمرے کی سجاوٹ کے لیے بھی اشیا کی ضرورت ہوتی ہے جنت والوں کے آرام وسکون کی حالت کا بیان کرتے ہوئے قرآن پاک مین بتایا گیا ہے کہ

فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ	اس میں سریر بچھے ہوئے ہیں، آبخورے دھرے ہیں، اور ریشمی قالین قطار در قطار بچھے ہیں اور مخملیں نہالچے بچھائے گئے ہیں۔
پ۳۰ الغاشیہ	

نیز ارشاد ہوتا ہے کہ

مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا۔	صوفوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ کیا خوب بدلہ ہے اور کیا خوب آرام ہے۔
پ۱۵ الکہف ۱۸ ع۴	

صنعت چرم سازی چرمی اشیاء کی صنعت سے متعلق بھی قرآن مجید سے اشارے نکالے جاسکتے ہیں. مثلاً قرآن مجید کی اس آیت کو لیجئے جو اوپر بلانکٹ سازی اور خیمہ سازی کی ذیل میں گزری فرمایا گیا ہے کہ:-

وَجَعَلَ لَكُم مِّن جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ	اور تمھارے لیے چوپائے کی کھال سے ڈیرے بنائے جنھیں تم اپنے سفر کے دن ہلکا پاتے ہو کہ آسانی سے جہاں چاہو لے جاسکو اور اپنے قیام کے دنوں میں بھی
پ۱۴ النحل ۱۶ ع۱۱	

صنعت دباغت سے متعلق حدیثوں سے بھی راہ نمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ "رسول اللہؐ نے ایک مری ہوئی بکری دیکھی آپ نے کہا کہ تم اس کی کھال سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے! صحابہ نے کہا کہ وہ تو مری ہوئی ہے آپ نے کہا کہ حرام تو صرف اس کا کھانا ہے"[۱]

جوتا سازی بھی آج کل ایک بہت بڑی صنعت بن گئی ہے۔ باٹا کا کارخانہ تو گویا تمام دنیا میں مشہور ہے قرآن پاک میں بھی جوتوں کا ذکر ہے موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے تو انھیں حکم ہوا کہ

۱۔ بخاری پ۶ کتاب الزکواۃ۔

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۔ پ۱۶ طٰہٰ
اپنی دونوں جوتیاں اُتار ڈال بے شک تو طویٰ کی مقدس وادی میں ہے۔

حدیثوں میں بتایا گیا ہے کہ "نجاشی شاہ حبشہ نے رسول اللہ ؐ کی خدمت میں دو سیاہ موزے بھیجے تھے، اور آپؐ نے انھیں پہنا تھا[1]" عام طور سے آپؐ جس قسم کے پاپوش پہنتے تھے، حدیثوں میں اس کی تفصیل موجود ہے چنانچہ "عیسیٰ بن طہمان کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے دو جوتیاں بغیر بال کے چمڑے کی ان کے سامنے نکالیں۔ ان میں دو تسمے تھے، پھر اس کے بعد ثابت بنانی نے حضرت انسؓ سے نقل کر کے مجھ سے بیان کیا کہ وہ نبی کریمؐ کی جوتیاں تھیں[2]"

"ابن عون کہتے ہیں کہ میں مکے میں ایک کفش دوز کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میری نعلین میں تسمے لگا دے۔ اس نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں ان میں داہنی طرف تسمے لگا دوں جیسا کہ میں نے رسول اللہؐ کی نعلین میں دیکھا ہے۔ میں نے پوچھا کہ تم نے انھیں کہاں دیکھا؟ اُس نے کہا کہ فاطمہ بنت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس دیکھا ہے۔ میں نے کہا کہ ان میں اسی طرح کے تسمے لگا دو جیسے تم نے رسول اللہؐ کی نعلین میں دیکھے۔ اس نے دونوں تسمے داہنی طرف لگا دیے[3]"

کھلونے سازی ترابیاتی صنعتوں کے بیان میں قرآنی حوالوں سے ہم نے بتایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے بچپن میں مٹی کے کھلونے وغیرہ بناتے تھے۔

کھلونے سازی سے متعلق حدیثوں میں بھی تذکرہ پایا جاتا ہے چنانچہ "حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک (یا غزوۂ حنین) سے تشریف لے آئے اور ایک بڑے طاق پر پردہ پڑا ہوا تھا اتفاق سے ہوا چلی اور اس نے میری گڑیوں کے پردے کو ایک طرف سے کھول دیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اے عائشہ! یہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ یہ میری گڑیاں ہیں آپ نے گڑیوں کے

1. بخاری پ کتاب الطہارت نیز ابن ماجہ اور ابن سعد الجزء الثالث صفحہ ۱۶۹ 2. بخاری پ۱۲ کتاب الجہاد ابن سعد جزء اول صفحہ ۱۶۶ 3. طبقات ابن سعد الجزء الثالث صفحہ ۱۶۷

درمیان میں ایک گھوڑا بھی دیکھا جس کے کاغذ کے دو پر تھے پھر آپؐ نے فرمایا کہ اچھا! یہ کیا ہے جو میں گڑیوں کے درمیان میں رکھا ہوا دیکھتا ہوں؟ جواب دیا گھوڑا ہے فرمایا اور گھوڑے پر یہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ اس کے دو پر ہیں۔

حضور اکرمؐ نے بطریق تعجب فرمایا گھوڑا ہے، اور اس کے دو پر ہیں! عائشہؓ نے کہا کیا آپ نے سُنا نہیں کہ سلیمانؑ کے گھوڑوں کے پر تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ سُن کر حضورؐ ہنس پڑے، یہاں تک کہ دندان مبارک ظاہر ہو گئے[1]

اسی طرح تعمیری صنعتوں میں کوہ کنی، سنگ تراشی اور ستون سازی اور مختلف امور کا ذکر مختلف قوموں کے بیان میں آتا ہے مثلاً ثمود کے متعلق ہے کہ

وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ — اور ثمود جنھوں نے وادی میں بڑے بڑے پتھر تراشے۔
پ۳۰ الفجر ۹ ع۱

پھر ان ہی کے متعلق یہ ذکر ہے کہ

تَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا — تم زمین پر محل تعمیر کرتے اور پہاڑوں کو
وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا پ۸ الاعراف ع۱ — تراش کر گھر بناتے

اسی طرح عاد کے ذکر میں ایک بے مثل شہر کا نقشہ دماغوں کے سامنے بے نقاب کرتا ہے۔

---

[1] - ابوداؤد۔

گڑیوں سے مقصود معصیت نہیں ہوتی، ان سے لڑکیوں کو تربیت اولاد کی تعلیم دیجاتی ہے اس کے ساتھ معصیت کا یہ جزیہ ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی صنم کی شکل پر بناتے ہیں، لہٰذا اس میں اجازت وعدم اجازت دونوں پہلو ہیں مقتضائے قرائن سے باقی رکھنا یا نہ رکھنا جیسا مناسب سمجھے کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لے گئے وہ گڑیوں سے کھیل رہی تھیں آپؐ نے منع نہیں فرمایا۔ کہتے ہیں کہ ابوسعید اصطخری شافعی مقتدر کے عہد میں قاضی مقرر کیے گئے تو انھوں نے گڑیوں کے بازار کو رہنے دیا اس کی مخالفت نہیں کی۔ اور یہ کہا کہ حضرت عائشہؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گڑیوں سے کھیل رہی تھیں آپؐ نے منع نہیں فرمایا؟

ماوردی الاحکام السلطانیہ باب۲۰ احکام احتساب

اِرَمَ ذَاتِ العِمَادِ الَّتِی لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی البِلَادِ — اور شہر ارم تھا بڑی لاٹھ والا جس کا مثل سارے شہروں میں نہیں تھا۔[1]

پ ۳۰ الفجر ۸۹ ع ۱

شہریت کا نقشہ قوم سبا کے ذکر میں آتا ہے۔

لَقَدْ کَانَ لِسَبَاٍ فِی مَسْکَنِھِمْ آیَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ یَمِیْنٍ وَّ شِمَالٍ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّکُمْ وَاشْکُرُوْا لَہٗ بَلْدَةٌ طَیِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ۔ — قوم سباء کی بستی میں نشانی دائیں اور بائیں دو باغ تھے۔ اپنے رب کی روزی کھاؤ اور اس کا شکر کرو یہ پاکیزہ شہر ہے اور پروردگار بخشنے والا ہے۔

پ ۲۲ السباء ۳۴ ع ۲

ان چند صنعتوں کا تذکرہ تو بطور مثال کیا گیا ہے، ورنہ تلاش سے اور بھی مصنوعات کے متعلق قرآن سے اشارے نکالے جا سکتے ہیں مثلاً قرآن مجید میں جن جن مصنوعات کا ذکر ہے، اگر ان ہی کو اکھٹا کیا جائے تو ایک بڑی لمبی فہرست بن سکتی ہے۔[2]

---

[1] بقول طبری یہ اسکندریہ تھا جہاں تا حال عمود الصواری موجود ہے جو چار مینار بلکہ قطب مینار سے بھی زیادہ اونچا، اور ایک ڈال سنگ مرمر کا ہے، نیز ملاحظہ ہو سفرنامہ ابن بطوطہ بر موقع۔

[2] ذیل میں ایک سرسری سی فہرست حروف وار مرتب کی گئی ہے۔

(الف) اباریق - آفتابے	اوتاد - میخیں
باب - باب دروازہ	اوزار - آلات
اساور من ذہب - سونے کے کنگن	اقلام - قلم - قلم
استبرق - ریشم	(ب) بروج - بروج
اسلحہ - ہتھیار	بیت - مکان
اصنام - بُت	بیع - عبادت گاہ، کلیسا
اکواب - آب خورے	(ت) تماثیل - مجسمے، اسٹاچو
الواح - لوح - تختی	(ث) ثیاب - کپڑے

صنعت و حرفت اور دستکاریوں کے متعلق حدیثوں میں بھی کافی ترغیبات پائے جاتے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(ج) جاریات - جاریۃ، کشتی
جدار - دیوار
جفان کا مجواب - حوض جیسے لگن
جلابیب - چادریں
جلدۃ - کوڑا
جوار - جہاز

(ح) حبال - حبل - رسی
حریر - ریشم
حلیۃ - زیور

(خ) خاتم - انگوٹھی، مہر
خبز - روٹی
خمر - شراب
خیام - خیمے، ڈیرے
خیط - دھاگہ

(د) دار - کوٹھی، حویلی
دراہم - چاندی کے سکے، روپے
دسر - کیلے، میخیں
دھن - تیل
دینار - سونے کا سکہ، اشرفی

(ر) رکن - کھم، ستون
رماح - نیزے

(ز) زبرالحدید - لوہے کی چادریں
زجاجہ - شیشہ
زرابی - قالین
زیت - تیل

(س) سجن - قیدخانہ
سرابیل - لباس
سراج - چراغ
سرادق - قناتیں
سرائر - سریر، پلنگ
سرد - کڑیاں
سفینہ - کشتی
سقایۃ - پیمانہ، ناپ
سقف - چھت
سکین - چھری
سلاسل - زنجیر
سلم - سیڑھی
سوط - کوڑا
سندس - گاڑھا کپڑا

(ص) صحف - صحیفہ، کتاب
صرح - محل، مینار
صوامع - گرجا - خانقاہ

(ع) عرش - تخت
عصا - عصا، لاٹھی

(غ) غزل - دھاگہ، سوت

(ف) فتیل - فتیلہ
فرش - فرش
فلک - کشتی

(ق) قدح - پیالہ
قدور - دیگ

چنانچہ بخاری میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مَا اَکَلَ اَحَدٌ طَعَامًا خَیْرًا مِنْ اَنْ یَاکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ وَاِنَّ دَاؤُدَ نَبِیَّ اللّٰہِ کَانَ یَاکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ[1]
اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا کسی نے نہیں کھایا۔ اور اللہ کے نبی داؤد اپنے ہی ہاتھ کی کمائی کھایا کرتے تھے۔

خود قرآن مجید میں اس کا تذکرہ موجود ہے کہ

وَعَلَّمْنٰہُ صَنْعَۃَ لَبُوْسٍ۔
اور ہم نے انھیں جنگی پوشش کی صنعت سکھائی

پ ۱۷ الانبیاء ۲۱ ع ۵

مہارت دستکاریوں اور صنعت وحرفت کے متعلق ایک چیز کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انسان صنعتی اشیاء خریدتے وقت یہ بھی دیکھتا ہے کہ آیا ان میں خوشنمائی اور پائیداری بھی ہے کہ نہیں؟ اسلامی معاشیات نے اس کلیے اور قاعدے کے مطابق جو اصول بتائے وہ یہ ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

قراطیس۔ قرطاس، کاغذ
قصر۔ محل
قلائد، قلادہ۔ ہار
قمیص۔ قمیص، کرتا
قواریر۔ آئینے
قوس۔ کمان
(ک) کاس۔ جام، پیالہ
کافور۔ کافور
کرسی۔ کرسی
(ل) لباس۔ لباس۔ ڈریس۔ یونیفارم
لوح۔ تختی
(م) محاریب۔ قلعے
محراب محراب
مساجد۔ مساجد، مسجد
مشکوٰۃ۔ طاقچہ
مصابیح۔ مصباح۔ چراغ
مصانع۔ قصر، محل
معروشات۔ منڈوے
مفاتیح۔ کنجیاں
منساہ۔ عصاء۔ لاٹھی
میزان۔ ترازو
(ن) نمارق۔ قالین
(و) ورق۔ ورق
ورق۔ یعنی سکہ

[1] ۔ بخاری پ کتاب البیوع۔

إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ۔ فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ[1]

خدا نے خوشنمائی کا پیدا کرنا ہر چیز میں ضروری قرار دیا ہے حتیٰ کہ جب تم قتل کرو تو خوبی سے قتل کرو جب تم ذبح کرو تو خوبی سے ذبح کرو۔

صحیح مسلم ہی میں ایک اور حدیث ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ وَيُحِبُّ الْجَمَالَ[2]

خدا خود جمال والا ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

اس سلسلے میں بخاری کی بھی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ حضور انورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو اشیاء کی خوشنمائی کس درجہ پسند تھی۔ ”ام خالد بنت خالد بن سعید بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند کپڑے پیش کیے گئے ان میں ایک بوٹے دار چھوٹی سی کالی کملی تھی آپ نے فرمایا کہ میں یہ کسے پہناؤں؟ حاضرین خاموش رہے پھر آپ نے مجھے بلوایا میں اٹھا کر لے گئی (کیونکہ میں کمسن تھی) آپؐ نے وہ مجھے پہنائی اور دعا دی کہ یا اللہ! اس کپڑے کو اس پر پورا کر دے۔ اس میں سبز یا زرد نشانات تھے۔ آپؐ ان کو دیکھنے لگے اور فرمایا کہ اے ام خالد! یہ کیسے اچھے ہیں[3]۔ اسی حدیث کو ایک دوسرے راوی نے بھی بیان کیا ہے جس میں ام خالد بیان کرتی ہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نقوش پر اپنا ہاتھ پھیرتے اور فرماتے تھے کہ کیا ہی اچھے ہیں! کیا ہی اچھے ہیں[4]۔“

غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم کاریگروں کو حکم دیا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی مصنوعات میں خوشنمائی اور پائیداری پیدا کرنے کی کوشش کریں چنانچہ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ حضور انورؐ نے فرمایا کہ

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ إِذَا عَمِلَ أَحَدُكُمْ عَمَلًا أَنْ يُتْقِنَهُ

خدا کو یہ بات پسندیدہ ہے کہ جب تم کوئی کام کرو تو اس میں مضبوطی کا خیال رکھو۔

---

[1] مسلم نیز ابن ماجہ باب: إذا ذبحتم فأحسنوا الذبح [2] مسلم

[3] بخاری پ۲۴ کتاب اللباس، نیز ابو داؤد

[4] بخاری پ۱۲ یہاں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اس مفہوم کے معنی ”کیا ہی اچھے ہیں“ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ”سنا“ ”سنا“ کے لفظ سے ادا فرمایا ہے جو حبشی زبان کا لفظ ہے۔ ام خالد حبشہ گئیں تھیں۔

ایک مشہور حدیث ہے کہ کسی قبر میں کچھ نشیب و فراز رہ گیا تھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو درست کر دیا جائے اور آگے ارشاد فرمایا کہ

مَنْ صَنَعَ مِنْكُمْ شَيْئاً فَلْيُحْسِنْهُ — جب تم کوئی چیز بناؤ تو اس میں خوشنائی کا خیال رکھو

(او کما قال) ....

طبرانی میں ہے کہ کسی نے پوچھا کہ قبر کی یہ درستی کیا مردے کے لیے نفع بخش ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ اس کو نفع ہوگا، اور نہ نقصان لیکن

يَسُرُّ عَيْنَ الْحَيِّ [1] — زندہ کی آنکھ کو تو بھلی معلوم ہوگی

قرآن مجید میں بنو اسرائیل کا ایک قصہ درج ہے جس میں خدا نے انھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا لوگوں نے اس کی صفت پوچھی تو یہ جواب ملا کہ

صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ — گہرے زرد رنگ کی دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہوتی ہو۔

پ بقرہ ۲ ع

اسی طرح قرآن مجید میں اشیاء کو مضبوط اور پائیدار بنانے سے متعلق بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔

صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ — اللہ نے اپنی کاریگری کی ہر چیز مضبوط بنائی ہے۔

پ۲۰ نحل ۲۷ ع

غرض صنعتوں میں حسن کاری کا خیال اور پائیداری کا لحاظ یہ بھی اسلامی معاشیات کا ایک اصول ہے۔

(ھ) حمل ونقل

تیار مال کو کارخانے سے، زرعی پیداوار کو کھیت سے، لکڑیوں کو جنگل سے اور اسی طرح معدنیات کو کانوں سے نکال کر بازار میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔ نقل مکان سے ان اشیاء میں افادیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن انسان فطری طور پر

---

[1] ۔ رسول کریمؐ کے صاحبزادے ابراہیم کے متعلق طبقات ابن سعد میں اس کا مکمل تذکرہ ہے۔

اکثر جانداروں کے مقابلے میں کمزور پیدا کیا گیا ہے وہ ان بوجھوں کو بڑے پیمانے پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے بذات خود ناقابل ہے اس لیے وہ اپنی عقل سے کام لیکر مختلف جانوروں سے بار برداری کا کام لیتا رہا ہے۔

قرآن مجید میں مواصلات، حمل ونقل نیز بری اور بحری راستوں کی ان سہولتوں کا بھی ذکر ہے، جن کے ذریعے ایک ملک کی تجارت دوسرے ملک سے ہوتی ہے۔

قرآن نے ان سواریوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جن پر ہر طرح کا بیش قیمت مال لادلاد کر انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ باسانی منتقل کرتا ہے" انعام" یعنی چوپایوں کے تذکرے میں ارشاد ہوتا ہے کہ

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ۔ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔

پ۱۴ النحل ۱۶ ع۱

اور وہ تمھارے مال و اسباب کو ایسے شہر تک لیجاتے ہیں جہاں تم بغیر تکلیف اٹھائے پہنچ نہ سکتے تھے بے شک تمھارا پروردگار مہربان، اور شفقت کرنے والا ہے۔

مال و اسباب لادنے کے علاوہ انسان گھوڑے، اونٹ، خچر، وغیرہ سے سواری کا کام بھی لیتا ہے۔

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

پ۱۴ النحل ۱۶ ع۱

گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو پیدا کیا تاکہ تمھاری سواری کا کام دیں اور زینت بنیں اور ان کو بھی پیدا کرتا ہے جن کو کہ تم (عرب) نہیں جانتے۔

گو بظاہر قرآن مجید نے سواری کے لیے عموماً جو جانور کام آتے ہیں، ان کے سلسلے میں صرف اونٹ، گھوڑے، گدھے، خچر، ہاتھی[۱] کا نام لیا ہے پھر بھی اس مذکورہ آیت[۲]

---

[۱] ہاتھی کے سلسلے میں یہ کہنا کہ زمانۂ جاہلیت میں ابرہہ مکے میں ہاتھیوں کی فوج لے آیا تھا۔ لیکن حجازی عرب ابتدائی اسلامی فتوحات کے وقت بھی اس کی صورت شکل سے بالکل ناواقف تھے۔

"جنگ ذات السلاسل ۱۲ھ ہجری کی جنگ میں خالد بن ولیدؓ نے فتح کی خوشخبری کے ساتھ مال غنیمت اور نیز ایک ہاتھی مدینے کو روانہ کیا چنانچہ جب زر بن کلیب مال غنیمت اور ہاتھی کو

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (اور ان کو بھی پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے) سے وہ تمام دیگر جانور بھی مراد لیے جا سکتے ہیں جو دنیا کے اور حصوں میں سواری یا باربرداری کے کام آتے ہیں مثلاً تبت میں یاک نامی ایک چھوٹی راس کا بیل ہوتا ہے جس کے لانبے لانبے بال ہوتے ہیں، سائبیریا کے بعض حصوں میں رینڈیر نامی ایک قسم کا بارہ سنگھا ہوتا ہے نیز کتے سے بھی باربرداری کا کام لیا جاتا ہے اسی طرح ہندوستان، پاکستان وغیرہ میں بھینسے کام دیتے ہیں علیٰ ہذا زیبرے کو سدھا کر کام میں لانے کی جو کوشش کی جا رہی ہے یہ سب یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (پیدا کرتا ہے اُن چیزوں کو جنھیں تم نہیں جانتے) میں آسکتے ہیں، خیر یہ تو جانوروں کے ذریعے مال و اسباب بھیجنے کا ذکر تھا۔

سمندر یا دریاؤں کے کنارے رہنے بسنے والے کشتیوں اور جہازوں کا استعمال کرتے ہیں، قرآن مجید نے بحری راستوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ذریعے جہازوں میں تجارتی مال لاد لاد کر ایک ملک سے دوسرے ملک کو جو منتقل کیے جاتے ہیں مختلف مقاموں پر ان کا ذکر کر کے بحری تجارت اور اس کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لیکر مدینہ پہنچے تو لوگوں کے دیکھنے کے لیے اس کو سارے شہر میں گشت کرایا گیا، بوڑھی بوڑھی عورتوں نے اس ہاتھی کو بڑے اچنبے سے دیکھا اور کہنے لگیں کہ کیا واقعی یہ کوئی خدا کی مخلوق ہے اور سمجھیں کہ یہ کوئی بناوٹی چیز ہے پھر اس ہاتھی کو حضرت ابوبکرؓ نے زر بن کلیب کے ساتھ خالدؓ کے پاس واپس بھیج دیا۔" (تاریخ طبری صفحہ ۲۰۲۱، ۱۲ھ کے واقعات)

مورخ بلاذری نے بھی ایک واقعہ لکھا ہے کہ قس الناطف کی جنگ میں" ابوعبیدہ نے پوچھا اس جانور کو کہاں سے قتل کرنا چاہیے؟ کہا گیا کہ اس کی سونڈ سے، انھوں نے حملہ کیا اور اس کی سونڈ پر وار کیا" (بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۵۲ یوم قس الناطف)

"جب مسلمانوں نے مدائن فتح کیا تو ایک ہاتھی بھی ان کے ہاتھ آیا۔ اس سے پہلے جو ہاتھی ان کے ہاتھ آئے تھے ان کو انھوں نے مار ڈالا تھا، اس ہاتھی کے متعلق حضرت عمرؓ سے دریافت کیا گیا انھوں نے لکھا کہ فروخت کردو چنانچہ اس کو فروخت کر دیا گیا اور اہل حیرہ میں سے ایک شخص نے اس کو خرید لیا اور وہ لوگوں کو دکھاتا اور اس پر جھول ڈال کر سوار ہوتا اور بستی میں چکر لگاتا" (بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۸۸ تمصیر الکوفہ)

امکانات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

قرآن میں اُن دیو پیکر تجارتی جہازوں کو جو سمندر کے سینوں کو چیرتے ہوئے ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف برفانی پہاڑوں کی طرح تیرتے ہوئے آتے جاتے رہتے ہیں ان کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے

وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ	اور اس کی نشانیوں میں جہاز (بھی) ہیں جو
پ۲۵ الشوریٰ ۴۲ ع۴	سمندر میں پہاڑوں کے مثل بلند ہیں۔

پھر دو پارے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے کہ

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ	اور تیرتے ہوئے جہاز اسی کے ہیں جو سمندر میں
پ۲۷ الرحمان ۵۵ ع۱	پہاڑوں کے مثل بلند ہیں۔

اس نے مسلمانوں کو پیدائش دولت کے اس اہم ذریعے یعنی جہازرانی اور بحری تجارت اور بحری سفر پر تاکید کر کے کھلے لفظوں میں ہدایت کی ہے کہ

وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔	اور تو جہازوں کو سمندر میں پانی کو چیرتے ہوئے چلتا دیکھتا ہے تاکہ تم اس کا فضل
پ۱۴ النحل ۱۶ ع۲ [۱]	تلاش کرو اور اس کا شکر کرو۔

نیز

وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ۔	اور کشتیاں جو کہ سمندر میں چلتی ہیں لوگوں کے لیے فائدہ رساں ہیں۔
پ۲ البقرہ ۲ ع۳	

نیز اور ایک جگہ فرماتا ہے

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا	تمہارا پروردگار وہی ہے جو سمندر میں کشتیاں چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو،
پ۱۵ بنو اسرائیل ۱۷ ع۷	بیشک وہ تم پر بڑا مہربان ہے۔

انسان جسدی حیثیت سے سمندر کے سامنے ایک حقیر تنکے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا

[۱] نیز پ۲۲ فاطر ۳۵ ع۲ ملاحظہ ہو۔

لیکن اندرونی طور پر انسان میں جو عقلی قوت بھری گئی ہے قرآن نے توجہ دلائی ہے کہ یہ ایک ایسی لاثانی خصوصیت ہے جس کے استعمال سے وہ سمندروں کو بھی قابو میں لاسکتا ہے بلکہ لے آیا ہے مثلاً ارشاد ہوا ہے

سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْہِ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ [1]

تمھارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں چلیں جس کے ذریعے تم اس کا فضل تلاش کرو تاکہ تم اس کا شکر کرو۔

پ ۲۵ الجاثیہ ۵ ہ ع ۱

انسانی تصرفات کی وسعت

قرآن کی بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے کہ تسخیر کے حدود اس سے آگے اور بھی ہیں، کائنات میں زمین سے متعلق بیان ہوا ہے کہ

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا لِتَسْلُکُوْا مِنْھَا سُبُلًا فِجَاجًا۔

خدا نے زمین کو فرش راہ بنا دیا تاکہ تم اس کی کشادہ راہوں میں چلو۔

پ ۲۹ نوح ۱، ع ۱

نیز زمین ہی سے متعلق یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ

وَجَعَلْنَا فِیْھَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّھُمْ یَھْتَدُوْنَ۔

اور ہم نے زمین میں کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ راہ پائیں۔

پ ۱۷ الانبیاء ۲ ع

زمین چونکہ سہل الحصول اور دبی پڑی تھی اس لیے اس کو بآسانی مسخر کر لیا پھر سمندر کو گو کہ وہ زمین کی طرح خاموش نہ تھا بلکہ موجوں کا ایک طلاطم تھا اپنی قابلیت کے زور سے زیر کیا

سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْہِ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ پ ۲۵ الجاثیہ ۵ ہ ع

تمھارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں چلیں جس کے ذریعے سے تم اس کا فضل تلاش کرو تاکہ تم اس کا شکر کرو۔

---

[1] پھر پ ۱۳ ابراہیم ۱۴ ع ۶ میں بھی اسی خیال کو دہرایا گیا ہے۔

بحری حمل ونقل کے اُس زمانے میں جو وسائل تھے، قرآن مجید صرف انہیں کا ذکر نہیں کرتا بلکہ فلک (بادبانی کشتیوں) کے ذکر میں تعمیم کرتا ہے کہ

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ	اور ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتیوں میں سوار کیا اور کشتیوں کی سی سواریاں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔
پ۲۳ یٰس ۳۶ ع۳	

مذکورۂ آیت سے واضح طور پر بحری حمل ونقل کے اور دیگر وسائل کا بھی پتہ چلتا ہے غرض مختلف قسم کے جہازوں اور آب دوز کشتیوں وغیرہ کی شکل میں آمد و رفت کے جو وسائل انسان کو عطا ہوئے یا آئندہ ہو سکتے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ "وَمِنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ" (اور ان جیسی سواریاں جن پر سوار ہوتے ہیں) کے فقرے کی عمومیت میں داخل نہیں ہوسکتے!

غرض یوں پھر انسان نے دیگر عطیاتِ قدرت پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش شروع کی، ہر روز ایک نئی دُھن سمائی اور کرۂ ہوائی کی تسخیر بھی سوچنے لگا۔ ہوا کی تسخیر گو زمین اور سمندر کی تسخیر سے زیادہ دشوار تھی، پر اس نے اپنی عقل کے زور سے اس کو بھی مسخر کیا اور ہوا کو بھی اپنے قابو میں لے آیا اور اس سے بیسیوں کام لینے لگا۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِىْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ۔	بس ہوا کو ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیا اور جہاں وہ چاہتا تھا دھیرے دھیرے چلتی تھی۔
پ۲۳ ص ۳۸ ع۱۲	

مورخ طبری وغیرہ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کا قاتل ہوائی چکیاں تیار کرتا تھا اور حضرت عمرؓ نے ہوائی چکی بنانے کی اس سے فرمائش بھی کی تھی، حضرت عثمانؓ کے عہد میں تو مدینۂ منورہ میں باقاعدہ ہوائی چکیاں نصب کی گئی تھیں اس کی تفصیل آئندہ صرفِ دولت کے باب۴ میں بیان کی گئی ہے۔

پھر جس قدر انسان کی استطاعت بڑھتی گئی اس کی حرص و ہوس بھی اتنی ہی بڑھنے لگی۔ مٹی، پانی، اور ہوا سے گزر کر آگ جیسی خوفناک شئے کی تسخیر کی فکر اب اس کی دامنگیر ہوئی اور آخر اپنی حکمت عملی سے اس کو بھی رام کیا اس پر قابو پا کر پوری طرح استفادہ کیا اور آگ اور پانی کے جادو سے سارے عالم کو مسخر کر لیا۔

ابھی تو دنیا صرف برق، بھاپ اور ریڈیو کے کمالات پر سر دھن رہی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ قدرت کا یہ صدف کن لاہوتی شاہوار موتیوں کو اُگلنے والا ہے تسخیر کائنات کی جو قرآنی تعلیم ہے، اگر اس پر لگاتار پورا پورا عمل ہو تو ہمارے موجودہ معلومات تجربات اور مشاہدات آئندہ کے انکشافات اور ایجادات کے مقابلے میں شاید صفر کا درجہ اختیار کرلیں۔

غرض گوناگوں سواریوں کے ذریعے سے انسان دیگر ملکوں سے تعلقات قایم کیے ہوئے ہے وہ اپنا مال اور اپنی زائد پیداوار دوسرے ملکوں کو بھیجتا ہے اور وہاں سے ان کے بدلے ان اشیاء کو منگواتا ہے، جو اس کے ہاں پیدا نہیں ہوتیں۔

غرض کہ

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا	بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی اور خشکی اور تری میں سواری دی اور انھیں پاکیزہ روزی عنایت کی۔ اور اپنی پیدا کردہ بہت سی مخلوق پر انھیں فضیلت دی۔
پ۱۵ بنو اسرائیل ۷، ع	

اس اسلامی تعلیم سے عربوں اور دوسرے مسلمانوں پر جو اثر پڑا اس کو معلوم کرنے کے لیے اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد کی بحری تجارت اور بحریہ میں عربوں اور دوسرے مسلمانوں جو ترقی کی اس کا تاریخی مطالعہ ضروری ہے اس کا تفصیلی تذکرہ تو کوئی معاشی مورخ (اکنامک ہسٹورین) ہی کریگا۔ بہرکیف اس موقع پر یہاں اس کا ایک سرسری تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

زمانۂ جاہلیت میں حجازی عربوں کے پاس نہ تو کسی قسم کے جہاز یا کشتیاں تھیں اور نہ بحیرۂ قلزم پر ہی ان کا کچھ اقتدار تھا یہاں تک کہ ابتدائی اسلامی فتوحات کے زمانے تک بھی عام عرب جہازرانی کے فن میں مہارت نہیں رکھتے تھے، رومی (بیزنطینی) ہی تمام بحیرۂ روم اور قلزم پر چھائے ہوئے تھے اور دریائے نیل کی ایک نہر کے ذریعے رومی جہاز بحیرۂ قلزم میں آتے جاتے تھے۔ ہجرت حبشہ کے وقت مسلمان رومیوں ہی کے جہاز پر حبشہ گئے تھے۔

عہد فاروقی تک اسلامی حکومت کی توجہ "بحریہ" کی طرف جیسی کہ چاہیے نہیں ہوئی تھی کیونکہ خشکی ہی کے فتوحات سے ابھی فرصت نہیں ملی تھی، ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ "جس وقت مسلمانوں نے مصر فتح کیا تو حضرت عمر ابن الخطابؓ نے عمرو بن العاصؓ کو

لکھا کہ مجھے سمندر کا حال لکھ بھیجو چنانچہ عمرو بن العاص رض نے انھیں لکھا کہ

إنّ البحرَ خلقٌ عظيمٌ يركبُهُ خلقٌ ضعيفٌ دودٌ على عودٍ — سمندر ایک بڑی مخلوق ہے اس پر کمزور مخلوق سوار ہوتی ہے گویا کہ کیڑا لکڑی پر سوار ہے۔[1]

یہ حال سُن کر حضرت عمر فاروق رض نے مسلمانوں کو سمندر میں پیش قدمی سے روک دیا، منشا صاف ظاہر ہے کہ اول تا امکان بڑی فتوحات حاصل کرلیں، اس کے بعد بحری فتوحات کی طرف توجہ کریں۔ کیونکہ اس کے واسطے خاص اہتمام اور مہارت درکار تھی،

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ "عثمان ابن العاص الثقفی نے عمان پہنچ کر ایک دریائی مہم تانہ مقانہ (بمبئی کے قریب) کی طرف روانہ کی، جب یہ لوگ صحیح سلامت واپس آگئے تو حضرت عمر رض کو اس اطلاع دی۔ انھوں نے لکھا کہ ثقیف کے بھائی تو نے کیڑے کو لکڑی پر سوار کردیا، قسم ہے اگر وہ لوگ ضائع جاتے تو میں تیری قوم سے اتنے ہی آدمی لے لیتا۔"[2]

"حضرت معاویہ رض نے حضرت عمر بن الخطاب رض کو اپنے بھائی یزید کے مرنے کے بعد سمندری ساحلوں کے حالات لکھے تو حضرت عمر رض نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ قلعوں کی مرمت کراؤ، اُن میں فوجیں ترتیب سے رکھو، دیدبانوں پر نگہبان مقرر کرو، اور ان پر آگ روشن رکھنے کا انتظام کرو۔ لیکن اپنے اس فرمان میں بھی حضرت عمر رض نے بحری جنگ کی اجازت نہیں عطا فرمائی۔"

"پھر حضرت معاویہ رض حضرت عثمان رض سے برابر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے بحری جنگ کی اجازت دے دی، اور یہ حکم دیا کہ خواہ تم خود حملہ کرو یا فوجوں کو حملہ کرنے کے لیے بھیجو لیکن ہر صورت میں ساحلوں پر ان فوجوں کے علاوہ جو وہاں مامور ہیں کچھ اور فوجیں تیار رکھو۔"[3]

۱۔ الجزء الاول من کتاب العبر و دیوان المبتدأ والخبر الجزء الاول ابن خلدون صفحہ ۲۱۶ سرخی قیادۃ الاساطیل نیز تاریخ الخلفاء سیوطی صفحہ ۹۰ فصل فی خلافت عثمان رض نیز طبقات ابن سعد۔

۲۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۴۳۲) فتوح السند۔

۳۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۱۲۸) مدینہ دمشق۔

حضرت معاویہ نے ۲۷ھ میں قبرص پر چڑھائی کی اس بحری جنگ میں بعض جلیل القدر اور مشہور صحابہ جیسے عبادہ بن الصامتؓ اور ابوذر غفاریؓ وغیرہ بھی شریک تھے اور پھر ۳۳ھ میں پانسو جہازوں کے بیڑے سے قبرص پر پھر حملہ کیا اور فتح کر لیا۔[1]

"پھر معاویہ بن خدیج الکندی نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے زمانے میں صقلیہ (سسلی) پر حملہ کیا اور یہ پہلا شخص تھا جس نے اس پر حملہ کر کے فتح کیا۔"[2]

"حضرت امیر معاویہؓ بر و بحر پر حملہ کرتے تھے، انھوں نے جنادہ بن ابی امیہ الازدی کو رودس (روڈس) بھیجا انھوں نے اسے بزور فتح کیا۔"[3] "پھر جنادہ نے اقریطش (کریٹ) پر بھی حملہ کیا اور ولید کے زمانے میں اس کا ایک حصہ فتح کر لیا۔"[4]

غرض یوں رفتہ رفتہ مسلمان تمام بحیرۂ روم پر چھاگئے اور اس طرح رسالت مآبؐ کا وہ خواب پورا ہوا جو اُم حرام زوجہ عبادہ بن صامتؓ سے منقول ہے۔

اُم حرام جو خود بھی اپنے شوہر کے ساتھ قبرص کی بحری جنگ میں شریک تھیں بیان کرتی ہیں کہ "ایک دن رسول کریمؐ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، اُم حرام کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ (اس وقت خواب میں) میری اُمت کے کچھ لوگ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے پیش کیے گئے وہ اس نیلے سمندر کے بیچ میں (جہاز پر) سوار ہیں وہ تخت نشین بادشاہ یا (یہ فرمایا کہ) مثل تخت نشین بادشاہوں کے ہیں۔"[5] (الفاظ میں راوی کو شک ہے)

---

[1] قبرس پر بحری حملے کی تفصیل کے لیے فتوح البلدان صفحہ ۱۵۳ ملاحظہ ہو۔ [2] فتوح البلدان صفحہ ۲۳۵ [3] حملے کی تفصیل فتوح البلدان صفحہ ۲۳۶ پر دیکھیے۔ [4] اقریطش (کریٹ) پر حملے کی تفصیل فتوح البلدان صفحہ ۲۳۵۔ [5] بخاری پ۱۱ کتاب الجہاد، اُم حرامؓ نے خود کے اس جماعت میں شریک رہنے کی دعا کی خواہش کی تھی (چنانچہ شریک ہوئیں) پھر رسول اللہؐ سو گئے پھر ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، اُم حرام نے وہی سوال کیا وہی جواب ملا، اُم حرام نے کہا کہ اس میں بھی شریک رہنے کی دعا کیجئے، آپ نے فرمایا کہ تم پہلی جماعت میں ہو۔ اُم حرامؓ قبرس کے حملے میں ساحل پر اُترتے ہوئے سواری سے گر کر شہید ہو گئیں۔ (تفصیل بخاری پ۱۱ کتاب الجہاد)

مورخ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمے میں مسلمانوں کی بحری طاقت، ان کے جہاز سازی کے کارخانے، تجارتی اور جنگی جہازوں کی تفصیل دکھانے کے بعد لکھتے ہیں کہ "مسلمان اپنی ترقی کے زمانے میں بحیرۂ روم پر ہر طرف سے پوری طرح قابض تھے اور ان کے مقابلے میں عیسائیوں کے بیڑے کسی شمار میں نہ تھے چنانچہ مسلمانوں نے ہر جگہ بحری فتوحات حاصل کیں...... اسلامی بیڑے ان پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے تھے جیسے شیر اپنے شکار پر گرتا ہے پورا سمندر مسلمانوں کے جہازوں سے بھرا ہوا تھا اور صلح و جنگ کے لیے راستوں میں ان کی آمد و رفت کا تانتا لگا رہتا تھا اور بحیرۂ روم میں عیسائیوں کا ایک تختہ بھی اس سمندر میں نہ تھا"[1]

پھر آخر میں مورخ موصوف اپنے زمانے (۷۳۲ھ تا ۸۰۸ھ / ۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ہمارے اس زمانے میں جنگی جہازوں کے بیڑے کا سلاطین اسلام کو خیال نہیں ہے حالانکہ اس سے پہلے عبیدیوں کے زمانے میں حد سے زیادہ اس طرف مسلمانوں کی توجہ رہ چکی ہے"[2]

واسکوڈی گاما کا عرب رہنما عرب جہاز رانوں نے جہاز رانی میں جو ترقی اور مہارت حاصل کی تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ خود واسکوڈی گاما کی ایک مسلمان عرب شہاب الدین احمد بن ماجد نامی شخص نے راہنمائی کی تھی، مسلمان مورخین کے بیانوں کے علاوہ خود انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی ذیل کا تذکرہ موجود ہے

> "شہاب الدین احمد بن ماجد پندرھویں صدی عیسوی کا ایک عرب جہازران تھا اور بحر ہند اور بحیرۂ قلزم، خلیج فارس، مغربی چین کے سمندر اور مجمع الجزائر ملایا کے پانیوں سے متعلق بحری ہدایتیں لکھی ہیں۔
>
> "سنہ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما ملندی پہنچا جو کہ افریقہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے تو اس نے ایک ناخدا کو اپنے ساتھ لیا جس نے اس کو سیدھے کالی کٹ پہنچا دیا۔ اس واقعے کو مختصراً اہم ہی کے ایک جہازی نے قلمبند کیا ہے"

۱۔ ابن خلدون: کتاب العبر و دیوان المبتداء والخبر ج ۱ صفحہ ۲۱۲ قیادۃ الاساطیل۔

۲۔ ابن خلدون: کتاب العبر و دیوان المبتداء والخبر ج ۱ صفحہ ۲۱۲ قیادۃ الاساطیل۔

اور تفصیلی طور پر سولھویں صدی عیسوی کے پرتگالی مورخین نے خاص کر ڈامیو ڈاگوٹ نے لکھا ہے اس واقعے کی توثیق قطب الدین النہروالی کی ایک عربی کتاب البرق الیمانی فی فتح العثمانی سے بھی ہوتی ہے[1]

قطب الدین نے اپنی کتاب البرق الیمانی میں پرتگالیوں کی آمد کی پوری تفصیل درج کی ہے ہم اس کتاب کے صرف ایک ہی جملے کے حوالے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اِلیٰ اَن دَلّھُم شَخصٌ مَاھِرٌ مِن اَھلِ البَحرِ	یہاں تک کہ جہازرانوں میں سے ایک ماہر شخص
یُقَالُ لَہٗ اَحمَدُ بن ماجد[2]	نے جس کا نام احمد بن ماجد تھا ان کی راہ نمائی کی۔

اس راہ نمائی کا صلہ یہ ملا کہ رفتہ رفتہ پرتگالی اور دوسری یورپی قومیں سمندر پر حاوی ہوتی چلی گئیں اور عربوں اور دوسرے مسلمانوں کی تجارت جو مشرق میں چین تک اور مغرب میں یورپ کے ملکوں تک پھیلی ہوئی تھی ختم ہو گئی مغربی اقوام کی موجودہ بحری اُولوالعزمیاں پہلے پہل عربوں اور دوسرے مسلمانوں ہی کی منت پذیر ہیں اور عربوں کا سمندر سے جو تعلق پیدا ہوا کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ قرآنی ہدایتوں کو ان میں دخل نہ تھا۔

(۹) تجارت

حمل و نقل کے ذریعے ضروریاتِ زندگی، بازار میں پہنچ جاتی ہیں۔ اب تاجر اس سامان کو تھوک خرید لیتا ہے، اور پھر اس کے چھوٹے چھوٹے حصے خردہ فروشی کے طور پر فروخت کر دیتا ہے۔ زراعت، صنعت و حرفت اور حمل و نقل وغیرہ کی طرح تجارت اور ذرائع تجارت کے متعلق بھی قرآن سے کافی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے مثلاً

یَآ اَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوٓا اِذَا نُودِیَ لِلصَّلٰوۃِ	مسلمانو! جب جمعہ کے دن جمعہ کی اذان دی جائے
مِن یَّومِ الجُمُعَۃِ فَاسعَوا اِلیٰ ذِکرِ اللّٰہِ وَذَرُوا	تو تم اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو
البَیعَ ذٰلِکُم خَیرٌ لَّکُم اِن کُنتُم تَعلَمُونَ	اگر تم جانتے ہو تو یہی تمھارے لیے بہتر ہے

[1] مزید تفصیل کے لیے صفحہ ۳۶۲ تا ۳۶۸ جلد (۴) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام دیکھیے عنوان شہاب الدین احمد بن ماجد

[2] البرق الیمانی فی فتح العثمانی بحوالہ "عربوں کی جہاز رانی" از مولانا سید سلیمان ندوی صاحب صفحہ

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ — پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین میں متفرق ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

پ ۲۸ الجمعہ ۶۲ ع ۲

اس آیت کے متعلق صحابۂ کرام کی تفسیر یہی ہے کہ "تجارت میں مشغول ہو جاؤ"[1]

تجارت کی اہمیت یوں بھی ظاہر ہے کہ

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ پ ۵ النساء ع ۶ — مسلمانو! ناحق طریقے سے ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت جو کہ آپس کی رضامندی سے ہو۔

ماسوا اس کے سورۂ ایلاف میں قریش کے سرمائی اور گرمائی سفر تجارت "رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ" کا تذکرہ کر کے اس کو ان کے بھوک "جوع" کے ازالے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

انتہا یہ ہے کہ "حج" جو سراسر ایک مذہبی اور دینی مناسک کا اہم اسلامی عنصر ہے لیکن دین کو دنیا کے ساتھ اور دنیا کو دین کے ساتھ جس خوبی کے ساتھ سمو دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی یہ کتنی اچھی مثال ہے کہ حج ہی کے عبادت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ پ ۲ بقرہ ع ۹ — حج کے دنوں میں اپنے رب کا فضل حاصل کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایام جاہلیت میں عکاظ، مجنہ، اور ذو المجاز یہ تینوں بازار تھے جہاں ان میں حج کے دنوں میں خرید و فروخت ہوا کرتی تھی، پھر جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو انھوں نے ایام حج میں خرید و فروخت کو برا سمجھا، اس وقت مذکورہ آیت نازل ہوئی[2]

جس وقت مسلمان فتوحات اور حکمرانی میں زیادہ مشغول ہو گئے تو انھوں نے حج میں

---

[1] تفسیر طبری ج ۸ تفسیر آیات بالا۔

[2] بخاری پ ۱۸ کتاب تفسیر الفرقان باب لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ نیز بخاری پ ۸ کتاب البیوع نیز تفسیر طبری ج ۲ ص ۱۵۹ آیت: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ۔

تجارت کرنی ترک کردی چنانچہ ایک زمانے کے بعد حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام ابو صالح نے اچھے سے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ "امیر المومنین! کیا آپ لوگ حج میں تجارت کیا کرتے تھے"؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا "ہماری معاش تو حج ہی میں حاصل ہوتی تھی"[۱]

قرآن ہی کی طرح حدیثوں میں بھی تجارت پر خاصا زور دیا گیا ہے قطع نظر اس فضیلت کے کہ جلیل القدر صحابہ خاص کر چاروں خلفائے راشدین بلکہ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت میں عملی حصہ لیا ہے جو تجارت کی فضیلت کے لیے کافی ہے

اسلامی معاشرے میں تاجر کی جو اہمیت اور عزت ہے، اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ[۲] — سچا امانت دار تاجر انبیاء صدیقین اور شہیدوں کے زمرے میں رہے گا۔

ایک اور حدیث میں کپڑے کی تجارت کی ترغیب دیتے ہوئے اس کے نفسیاتی پہلو کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ "کپڑے کی تجارت کرو کیونکہ کپڑے کا تاجر یہ چاہتا ہے کہ لوگ خوش حال اور فارغ البال رہیں"[۳]

پھر اسلامی معاشیات نے تجارت کو پیدائشِ دولت کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا ہے۔

تِسْعَةُ أَعْشَارِ الرِّزْقِ فِي التِّجَارَةِ[۴] — روزی کے ۹/۱۰ حصے تجارت سے ہیں۔

غرض تجارتی شعبہ قومی زندگی کا بڑا اہم ستون ہوا کرتا ہے کہ

لَوْلَا هٰذِهِ الْبُيُوعُ صِرْتُمْ عَالَةً عَلَى النَّاسِ[۵] — اگر تجارت نہ ہوتی تو تم لوگوں پر بار ہو جاتے

اکثر اسلامی فقہاء نے اس پر طول طویل بحث کی ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے آیا زراعت زیادہ اہمیت رکھتی یا تجارت۔

۱۔ تفسیر طبری ج ۲ صفحہ ۱۶۱ ۲۔ ترمذی ابواب البیوع ج ۵ صفحہ ۲۱۳ نیز ابن ماجہ ۳۔ کنز العمال ج ۲ کتاب البیوع فصل فی الکسب ص ۱۹۹
۴۔ کنز العمال ج ۲ ص ۱۹۲ ۵۔ کنز العمال ج ۲ صفحہ ۲۱۷ فصل الکسب

شمس الائمہ السرخسی (المتوفی ۴۸۳ھ) نے بھی اس سوال کو اٹھاتے ہوئے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پیش کی ہے کہ

خَیْرُ النَّاسِ مَنْ ھُوَ اَنْفَعُ لِلنَّاسِ — لوگوں میں اچھا وہ ہے جو لوگوں کے لیے زیادہ فائدہ رساں ہو۔

اور آخر میں لکھتے ہیں کہ

فَالْاَشْغَالُ بِمَا یَکُوْنُ نَفْعُہٗ اَعَمُّ یَکُوْنُ اَفْضَلُ [1] — ایسا پیشہ جس کا فائدہ زیادہ عام ہو افضل ہے۔

(۳) محنت کے مسائل

اب تک ہم نے یہ واضح کیا ہے کہ انسان حیوانات، نباتات، اور جمادات سے دولت حاصل کرتا ہے پھر جب خام دولت حاصل ہو جاتی ہے تو ان کی صورت شکل بدل کر یا مقام بدل کر یا کچھ دن اس کی حفاظت کر کے ان میں مزید افادیت پیدا کرتا اور مزید دولت پیدا کرتا ہے، اب ہم دولت پیدا کرنے کی ایک شکل یعنی محنت پر بحث کریں گے۔

خود ایک انسان یا منظم ادارہ، فیکٹری یا کارخانہ دوسرے انسان کی جسمانی یا دماغی صلاحیتوں سے استفادہ کرتا ہے" خدمت میں بھی صفات افادہ و استبدلال موجود ہیں، اور وہ بھی دولت کی ایک شکل ہے، واضح ہو کہ قرآن شریف سے بھی خدمات کا دولت ہونا ثابت ہے، بلکہ جائداد اور زر نقد کی طرح مہر بشکل خدمت بھی قرار پا سکتا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ادائیگی مہر میں اپنی بیوی کی کچھ سال بکریاں چرائی تھیں [2] حضرت شعیب یعنی حضرت موسیٰ کے

---

[1] المبسوط السرخسی ج ۳۰ صفحہ ۲۵۹ کتاب الکسب

[2] علم المعیشت از پروفیسر الیاس برنی صاحب حصۂ اول صفحہ ۱۱ ۔

خسر نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے جو الفاظ مہر کے متعلق فرمائے تھے، قرآن میں وہ اس طرح ہیں۔

إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَىٰ أَن تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِندِكَ

پ۲۰ القصص ۲۸ ع۳

بے شک میں یہ چاہتا ہوں کہ تم سے اپنی ان دو بیٹیوں میں سے کسی ایک کا نکاح کر دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میرے ہاں مزدوری کرو، پھر اگر دس برس پورے کر دو گے تو یہ تمھاری طرف سے ہیں۔

محنت یا تو جسمانی ہوتی ہے یا دماغی۔ ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(الف) جسمانی محنت سے استفادہ:- محنت بھی ایک اہم عامل پیدایش ہے قرآن پاک نے پیدایش دولت کے اس ذریعے کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس سے آدمی بغیر کسی سرمایے کے روزگار حاصل کرتا ہے جس کی تعبیر عام طور پر مزدوری، نوکری، ملازمت وغیرہ سے کی جاتی ہے مزدوری یا اُجرت کے تذکرے میں تو اس نے دو پیغمبروں کی زندگی پیش کی ہے، جس میں ایک کو آجر، اور دوسرے کو مزدور کی شکل میں پیش کیا ہے یعنی شعیب علیہ السلام اس شرط سے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے مویشی چرانے کے لیے مزدور مقرر کرتے ہیں۔

.... أَن تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِندِكَ۔

پ۲۰ القصص ۲۸ ع۳

کہ تم آٹھ سال میرے ہاں مزدوری کرو پھر اگر تم دس برس پورے کر دو گے تو یہ تمھاری طرف سے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام، اُجرت کے اس معاملے کے جواب میں مزدوری کی پوری ذمہ داری قبول کر کے یہ فرماتے ہیں۔

ذَٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ ۖ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ۔

پ۲۰ القصص ۲۸ ع۳

میرے اور تمھارے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا جو بھی مدت چاہوں پوری کر دوں کہ مجھ پر زیادتی نہ ہونے پائے، بس خدا گواہ ہے جو ہم کہتے ہیں۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کے تذکرے میں پیشہ معماری کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے

فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ فَأَقَامَهُ ۔ قَالَ: لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ۔ پ ۱۶ الکہف ۱۰ ع ۱
پھر ایک دیوار پائی جو گرا چاہتی تھی انھوں نے اس کو درست کیا کہا اگر تم چاہتے تو اجرت طلب کرتے ۔

(ب) دماغی محنت سے استفادہ :۔ بغیر سرمایے کے وہ تمام کاروبار جس میں بجائے جسم کے زیادہ تر دماغ سے کام لیا جاتا ہے اور عام طور سے اس کو منیجری ڈائرکٹری، عہدہ داری (سروس) وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے قرآن پاک نے اس کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں فرماتا ہے کہ بادشاہ مصر نے ان سے گفتگو کرنے کے بعد خواہش کی کہ

إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ پ ۱۳ سورہ یوسف ع
آج سے تم ہمارے نزدیک معزز اور معتبر ہو ۔

حضرت یوسف ؑ نے نوکری کی اس خواہش کو قبول کر کے اپنے متعلق یہ فرمایا کہ

اِجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَآئِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ۔ پ ۱۳ یوسف ۱۲ ع
ملک کے خزانوں پر مجھے مامور کردو میں ان کی حفاظت کرنے والا اور خوب واقف کار ہوں ۔

اس آیت سے ملازمت کے سوا یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی قابلیت کے مطابق آدمی حکومتوں میں درخواست دے سکتا ہے اور درخواست میں اپنے اسناد قابلیت (کوالیفکیشن) کا تذکرہ کرنا سنت پیغمبری ہے کیونکہ حضرت یوسف ؑ نے اس موقع پر " اِنِّی حَفِیظٌ عَلِیمٌ " کا دعویٰ فرمایا[1]

---

[1] " طلب وجاہت امر مباح غیر مکروہ ہے ۔ پیغمبر خدا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون سے حکومت وخلافت کی خواہش کی اور کہا کہ اِجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَآئِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ (ملک کے خزانوں پر مجھے مامور کردو، میں محافظ اور باخبر ہوں)
آپ نے استحقاق کی علت بھی ذکر فرمائی کہ میں حفیظ وعلیم ہوں ۔ اس میں دو تاویلیں ہیں، ایک یہ کہ محافظ ہوں ۔ جو کچھ سپرد کرو گے، باخبر ہوں طریقہ حکومت سے جو مجھے دو گے ۔ یہ قول عبدالرحمٰن بن زید کا ہے دوسری یہ کہ محافظ ہوں، حساب سے باخبر ہوں، اور زبانوں سے واقف ہوں یہ قول اسحاق بن سفیان کا ہے ۔

اُجرت، ملازمت اور دیگر کاروبار سے متعلق حدیثوں میں بھی کافی ترغیبیں پائی جاتی ہیں اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کافی ہے کہ خود سرورِ کائناتؐ فرمایا کرتے تھے کہ "خدا کے ہر ایک نبی نے بکریاں چرائیں صحابہ نے دریافت فرمایا اور کیا آپ نے بھی؟ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہاں! میں بھی چند قیراطوں پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا"[1]

حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلق جیسا کہ قبل ازیں بیان ہوا وہ اپنے ہاتھ سے کسب و ہنر کر کے روزگار کمایا کرتے تھے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ مختلف پیراؤں میں قرآن اور حدیثوں نے جن معاشی وسائل کی طرف اشارہ کیا ہے اگر امریکی پروفیسر کاروریا ابن خلدون وغیرہ کی طرح اس کا نقشہ بنایا جائے تو ان کے نقشوں سے زیادہ مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے چنانچہ امام بخاری نے تو اپنی صحیح میں زرگری، لوہاری، نجاری، خیاطی، پارچہ بافی، عطاری یا عطر فروشی وغیرہ سے متعلق باب قائم کئے ہیں اور حدیثوں سے روشنی ڈالی ہے۔

کارکردگی موجودہ معاشئین نے کارکردگی اور محنت کے معیار کو بلند کرنے کے لیے مزدوروں کی جسمانی طاقت اور دماغی قابلیت پر بہت زور دیا ہے اور اس لیے انھوں نے حکومت سے استدعا کی ہے کہ محنت کرنے والے طبقے کی حفاظت ملک کی معاشی فلاح اور بہبود کے واسطے لازم ہے۔

قرآن پاک میں جہاں موسیٰ علیہ السلام کو اُجرت پر مزدور بنانے کا تذکرہ ہے وہیں اس سے اوپر ایک اور آیت یہ بھی ہے کہ

قَالَتْ اِحْدٰهُمَا۔ یٰاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِيْنُ	ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا کہ اے میرے باپ! تم اسے اُجرت پر رکھ لو بے شک جنہیں تم مزدور بناؤ ان میں وہی بہتر ہے جو طاقتور اور امانتدار ہے
پ ۲۰ القصص ۲۸ ع ۳	

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) چونکہ یہ قول بطور سبب اور علت: استحقاق کے ذکر کیا گیا لہٰذا اس کو اپنی صفائی، اور خودسرائی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ (الاحکام السلطانیہ للماوردی باب ۶۔ قاضی کا تقرر۔

[1] بخاری پ ۹ کتاب السلم فی الاجارت نیز مسلم ابو داؤد ابن ماجہ وغیرہ

قرآن کے یہ دو لفظ "قوی" اور "امین" معاشی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں کیونکہ اس میں جسمانی محنت کرنے والے مزدور کی صفت ہی "طاقتور" اور "امانت دار" قرار دی گئی ہے۔ اسی طرح دماغی محنت کرنے والوں میں کیا خصوصیتیں ہونی چاہئیں تو اس کا سراغ حضرت یوسف علیہ السلام کے قرآنی قصے سے لگایا جا سکتا ہے، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے تو خود اپنی صفت حفیظا، علیم بتائی، اور بادشاہ مصر نے "امین" کے لفظ سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ مزدوری کا تعلق چونکہ جسمانی محنت سے ہے، اس لیے جسمانی قوی اس کے لیے درکار ہے ملکی انتظام کے لیے دماغی صلاحیت کی ضرورت ہے، اس لیے یہاں علم اور حافظے کی صفت کا اظہار کیا گیا اور باقی امانت و دیانت تو ظاہر ہے کہ ہر ایک قسم کی ملازمت میں خواہ جسمانی ہو یا دماغی سب میں ناگزیر ہے۔

یہاں یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ محنت خواہ جسمانی ہو یا دماغی قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب میں کامیاب ہونے کے لیے امانت کی ضرورت ہے اب ظاہر ہے کہ امانت انسان کے اس صفت کی تعبیر ہے، جس میں فرائض اور ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرانے کی ضمانت پوشیدہ ہے اور ذمہ داریوں کے صحیح احساس کے لیے ضرورت ہے۔ اخلاق و کردار کی تصحیح کی جس کی واحد تدبیر تعلیم ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ دماغی محنت کے لیے تو خیر اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے لیکن جسمانی محنت کرنے والوں میں بھی امانت کے جذبات کی پرورش کے لیے ضرور ہے کہ تھوڑی بہت تعلیم ان کو بھی دلائی جائے۔

کہا تو یہ جاتا ہے کہ تعلیم کی عام اشاعت کا خیال سرزمین مغرب کی پیداوار ہے لیکن اسلامی معاشرے میں تعلیم کی جو اہمیت ہے لوگوں کی اگر اس پر نظر ہوتی تو تعلیم کے باب میں بھی ان کو نظر آتا کہ ہدایت کا پہلا چراغ اسلام ہی نے روشن کیا تھا۔

اس کے ثبوت میں اس سے زیادہ اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی پہلی آیت[1] جو نازل ہوئی وہ یہ تھی کہ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ		اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے

---

[1] قرآن مجید کی کوئی بھی تفسیر یا حدیث کا باب الوحی یا سیرت کی کوئی مستند کتاب ملاحظہ ہو۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔
پ ۳۰ العلق ۹۶ ع ۱

ہر چیز کو پیدا کیا۔ جس نے انسان کو ایک بستہ خون سے پیدا کیا پڑھو اور (جان لو کہ) تمھارا پروردگار بڑا بزرگ ہے وہ جس نے قلم کے ذریعے سے (علم) سکھایا۔ انسان کو سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔

مذکورہ قرآنی آیت سب سے پہلے نازل ہوئی اس میں دین کے تمام احکام سے پہلے "اقراء" کا مطالبہ بنی آدم سے کیا گیا ہے نہ صرف قراۃ (خواندگی) بلکہ وحی کی ان ہی ابتدائی آیتوں میں قراۃ کے ساتھ "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" (انسان کو قلم سے سکھایا) کا بھی ذکر کیا گیا ہے پھر اسی سورے میں عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (انسان کو سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا) کے الفاظ میں سچ پوچھئے تو اس واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ انسان حقیقت میں دوسرے موجودات کے مقابلے میں بھی بڑا امتیاز رکھتا ہے کیونکہ حیوانات جس حال میں پیدا ہوتے ہیں اور جن جبلی معلومات کو لے کر پیدا ہوتے ہیں، اسی حال میں ان ہی معلومات کے ساتھ زندگی بسر کرتے اور مرتے ہیں برخلاف انسان کے کہ وہ جاہل پیدا ہوتا ہے، اور جو چیزیں اس کو معلوم نہیں ان کو بتدریج معلوم کرتا رہتا ہے تاآں کہ وہی جاہل علامہ، حکیم، فلسفی اور سائنسداں بن کر مرتا ہے۔ جس کے معنی یہی ہوے کہ انسانی نسل کے ارتقاء کا سنگ بنیاد قرآن نے گویا تعلیم ہی پر رکھا ہے۔

پہلے وحی قرآنی کے سوا یوں بھی قرآن پڑھتے چلئے جا بجا آپ کو ایسی آیتیں بھی بکثرت ملیں گی۔ مثلاً

هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

جو لوگ جانتے ہیں اور جو لوگ کہ نہیں جانتے بھلا کیوں کر دونوں برابر ہو سکتے ہیں!

پ ۲۳ الزمر ۳۹ ع ۱

جس سے معلوم ہوا کہ انسانی افراد میں برتری کا زیادہ مدار علم کی کمی بیشی پر ہے بلکہ ملائکہ پر بھی آدم نے جو فضیلت حاصل کی صاف صاف الفاظ میں قرآن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس فضیلت کی بنیاد بھی علم ہی پر قائم تھی۔[۱]

[۱] تفصیل کے لیے سورۂ بقر پ ۱ ع ۴ ملاحظہ ہو

طالوت کے قصے میں بھی جسم کے ساتھ ساتھ علم ہی کو ان کے حکمراں منتخب ہونے کی وجہ قرار دیا گیا ہے یعنی نبی نے کہا

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ اس کو علم اور جسم میں برتری بخشی۔

پ۲ البقرہ ۲ ع۱۶

سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن مجید میں پیغمبر اسلام کی بعثت کا مقصد علم کی اشاعت بتایا گیا ہے کہ

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔

(خدا ہی وہ ذات ہے) جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں کا ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو (گناہوں سے) پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت (کا سبق) پڑھاتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔

پ۲۸ الجمعۃ ۶۲ ع۱

خدا نے علم کو اپنا ایک احسان جتایا ہے جو بندوں پر کیا گیا۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔

بے شک خدا نے مسلمانوں پر بڑا ہی احسان کیا کہ انھیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کو (گناہوں سے) پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت (کا سبق) پڑھاتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔

پ۴ آل عمران ۳ ع۱۷

مذکورہ آیتوں میں آیتوں کی تلاوت کا پھر تزکیہ کا، اور کتاب کی تعلیم کا اور اس سے بڑھ کر حکمت کی تعلیم کا تذکرہ ہے، یہ چاروں مدارج نفسیاتی اور عرفانی اعتبار سے بجائے خود بہت غور طلب ہیں لیکن یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں اور یوں بھی عالِم کا مرتبہ بہت بلند ہے چنانچہ قرآن کریم نے بھی اس اہمیت کو جا بجا واضح کیا ہے کہ

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا اور جس کو حکمت عطا ہوئی تو بے شک اُسے بڑی دولت عطا ہوئی۔

پ۳ بقرہ ۲ ع۳۷

گویا حکمت انبیا کا ورثہ اور خیر کثیر کا منبع ہے۔
حدیثوں میں بھی بکثرت تعلیم پر زور دیا گیا ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی اُمت کے مرد، عورت کے لیے تعلیم کو لازمی گردانا تھا

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ [۱] — علم کا طلب کرنا ہر ایک مسلمان مرد عورت پر فرض ہے۔

تعلیم کی اس اہمیت کا یہ نتیجہ تھا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے ساتھ ساتھ مسجد ہی میں "صفہ [۲]" کے نام سے تعلیمی ادارے کا افتتاح فرمایا جس کے پہلے معلم تو خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے، بلکہ اپنے مبعوث ہونے کی وجہ بھی یہی آپ نے بیان فرمائی کہ

إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا [۳] — بے شک میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

تعلیمی دائرے کو جلد سے جلد امکانی حد تک وسیع کرنے کے لیے تعلیم بالغان کے سلسلے میں یہ تدبیر اختیار فرمائی کہ جنگی قیدیوں کا فدیہ جنگ بدر میں یہ مقرر کیا گیا کہ مدینے کے دس دس لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں شاید جنگ کی تاریخوں میں اس کی نظیر نہیں

۱۔ ابن ماجہ الجزء الاول کتاب العلم۔

۲۔ صُفہ تو پہلی درسگاہ تھی جو مدینے میں قائم ہوئی تھی بعد میں تمام مملکت اسلامیہ میں بڑی بڑی جامعات قائم ہوئیں "بغداد۔ بصرہ۔ کوفہ۔ قاہرہ اور قرطبہ میں عربوں کی بڑی بڑی جامعات تھیں۔ قرطبہ جو کہ اسپین میں ہے شمالی یورپ کے بہت سے عیسائی طالب علم اس میں تعلیم حاصل کرتے اور پھر اپنے اپنے ملکوں کو بحیثیت معلمین کے جاتے تھے" (ہالُ لینڈ: ہسٹری آف سیولیزیشن صفحہ ۹۰)

"قرطبہ کی جامعہ یورپ بھر میں اور مغربی ایشیا میں مشہور تھی عربیوں کے لیے ابتدائی لازمی تعلیم عام تھی۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ اسپین میں ہر شخص نوشت و خواند سے واقف تھا۔ برخلاف اس کے عیسائی یورپ میں سوائے پادریوں کے اعلیٰ ترین مرتبہ رکھنے والے بھی تعلیم سے بالکل نابلد تھے" (جواہر لال نہرو: گلمپسز آف دی ورلڈ ہسٹری)

اسپین پر ہی کیا منحصر ہے جہاں جہاں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے قدم پہنچے انھوں نے اس سرزمین کو علم کی روشنی سے منور کر دیا۔

۳۔ الدارمی، بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم

پائی جاتی جو عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ " بدر کے جنگی قیدیوں کا فدیہ مختلف تھا کسی کا تو یہ تھا کہ دس دس لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں" [1]

اسی کو پیش نظر رکھ کر بعد میں عربوں نے چینی قیدیوں سے خود کاغذ بنانا سیکھا اور اوروں کو سکھایا۔[2] کہا یہ جاتا ہے کہ عربوں نے کاغذ سازی کا فن چینیوں سے سیکھا اور پھر یورپ کو سکھایا ۷۵۱ء میں مسلمان عربوں اور چینیوں کے درمیان وسطی ایشیا کے علاقہ ترکستان میں ایک جنگ ہوئی اور عربوں نے بہت سے چینیوں کو قیدی بنا لیا اور ان قیدیوں نے ان کو کاغذ سازی سکھائی[3] " غرض عربوں نے کاغذ بھی تیار کیا اس طرح انھوں نے چھاپے اور تعلیم کی وسیع اشاعت کے لیے راہ ہموار کر دی۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے محاصرے کے لیے منجنیق اور دبابوں وغیرہ کے بنانے اور چلانے کی تربیت حاصل کرنے کے لیے چند قابل کاریگروں کو جُرش نامی مقام پر روانہ فرمایا تھا چنانچہ مورخ طبری ابن ہشام اور ابن سعد وغیرہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ جُرش نامی شہر اس زمانے میں دبابے اور منجنیق سازی کی صنعت میں مشہور تھا عروہ بن مسعود ثقفی اور محمود بن غیلان جو مشہور صحابیوں میں ہیں ان حضرات نے جرش جا کر ان قلعہ شکن آلات حرب کے بنانے کا فن سیکھا تھا۔[4]

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم کو جو اہمیت دیتے تھے، اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے اپنی اُمت کو درس دیا کہ علم کی جستجو کے لیے دور دراز ممالک کا سفر کریں کہ

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّينِ[5] علم حاصل کرو خواہ چین ہی میں کیوں نہ ہو

۱ـ کتاب الاموال لابی عبید قاسم بن سلام صفحہ ۱۱۲ نمبر (۳۰۹) ابن سعد ۲/۱ ص ۱۴ مسند احمد ابن حنبل

۲ـ جواہر لال نہرو: گلمسز آف دی ورلڈ ہسٹری صفحہ (   )

۳ـ ہائی لینڈ: ہسٹری آف سیویلیزیشن صفحہ ۹۰۔

۴ـ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن ہشام صفحہ ۸۶۹ نیز ابن سعد ج ۲ صفحہ ۲۲۱ وفد ثقیف نیز تاریخ طبری صفحہ ۱۶۶۹ ۸ھ کے واقعات۔

۵ـ البیہقی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم۔

نیز یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ

اَلْکَلِمَةُ الْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا۔[1]

حکمت مسلم کی کھوئی ہوئی چیز ہے۔ جہاں سے ملے وہ اس کو پانے کا زیادہ مستحق ہے۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہی زمانے میں مسلمانوں کو غیر قوموں کی زبانوں کو سیکھنے کا حکم دیا تھا اور آپؐ کے کاتبؐ حضرت زید بن ثابتؓ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہودیوں کی زبان اور تحریر سیکھی[2]۔ بخاری اور ابو داؤد وغیرہ میں بھی تذکرہ ہے کہ" زید بن ثابتؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہودیوں کی کتابت سیکھی تھی اور رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ مراسلے ان کو لکھتے یا جو مراسلے وہ لکھتے زید بن ثابتؓ ان کو پڑھ کر سنایا کرتے تھے[3]۔"

غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق صریح حدیث ہے کہ جو ان کو تعلیم و تربیت دے اور آزاد کردے تو دُو اَجر ہیں۔

"..... اور وہ شخص جس کے پاس کوئی لونڈی ہو، اس نے اسے ادب دیا اور اُسے تعلیم دی اور عمدہ تعلیم دی۔ پھر اُسے آزاد کر دیا اور اس سے نکاح کر لیا تو دُو اَجر ہیں[4]۔"

آزادیٔ پیشہ

مزدوروں کے معیار کارکردگی کو بڑھانے کے لیے ان کی دماغی اور جسمانی نشو ونما کے علاوہ لوازم کارکردگی کے سلسلے میں آزادیٔ پیشہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

اسلامی معاشیات نے اس سلسلے میں جس وسعت نظر سے کام لیا ہے، اب اس پر بحث کی جائے گی۔

اسلامی سوسائٹی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو اس بات کی پوری آزادی عطا کرتی ہے کہ پیدائش دولت کے لیے جس پیشے کو چاہے اختیار کرے

---

[1] ترمذی و ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم [2] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۵۱۳۔
[3] بخاری نیز ابوداؤد۔ تاریخ طبری ج۹ ص ۱۵۰۴ [4] بخاری پ۱ کتاب العلم نیز مسلم

خواہ وہ ادنیٰ پیشہ ہی کیوں نہ ہو۔ خود حضرت موسیٰ نے جن کا مزدوری کے سلسلے میں اوپر ذکر آیا آٹھ یا دس سال تک گلہ بانی کا پیشہ کرتے رہے۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوسَى الْاَجَلَ۔ پھر جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی

پ۲۰ القصص ۲۸ ع۴

باوجودیکہ مویشی چرانا معمولی اور ادنیٰ درجے کا پیشہ سمجھا جاتا ہے پھر بھی انھوں نے آٹھ یا دس برس تک ان کو چرایا، بھیڑ بکریوں کو چرانا اور ان کو درختوں سے جھاڑ جھاڑ کر پتے کھلانا غرض ان سب "موسائی مشاغل" کا تذکرہ قرآن مجید میں پایا جاتا ہے۔

اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا کہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بکریاں چرائی تھیں۔

اسلامی معاشیات نے اس سلسلے میں جس وسعتِ نظر سے کام لیا ہے اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فخر سے فرمایا کرتے تھے کہ وہ رسول اللہؐ ایک دن بھوکے تھے مجھے اس کی اطلاع ہوئی اور میں مزدوری کی تلاش میں چلا تاکہ رسول اللہؐ کے لیے کچھ کما لاؤں، مدینے کے باغ میں ایک یہودی کو دیکھا کہ اس نے مٹی کے کچھ ٹھیلے جمع کر رکھے ہیں، ان پر پانی ڈلانے کے لیے مزدور کی ضرورت ہے فی ڈول ایک کھجور پر میں نے معاملہ طے کیا اور یوں سترہ ڈول کے معاوضے میں میں سترہ کھجوریں مزدوری میں کما کر گھر لایا اور پھر میں رسالت مآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کی اطلاع دی گئی رسول کریمؐ نے میرے ساتھ کھجوریں تناول فرمائیں[1]

"ایک صحابی کے ہاتھ پھاوڑا چلاتے چلاتے سیاہ پڑ گئے تھے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھوں کو دیکھ کر فرمایا کہ کیا تمھارے ہاتھ پر کچھ لکھا ہوا ہے،؟ انھوں نے عرض کیا کہ نہیں بلکہ میرے ہاتھوں کی سیاہی کی وجہ یہ ہے کہ میں سنگلاخ زمین پر پھاوڑا چلاتا ہوں اور اپنے اہل و عیال کے لیے روزی کماتا ہوں۔

---

[1] ابن ماجہ باب الرجل یستقی کل دلو بتمرۃ

آپؐ نے یہ سُنا تو اُن کے ہاتھ چوم لیے۔[1]

رسول اکرمؐ نے عملی طور پر یہ تعلیم دی تھی کہ معاش حاصل کرنے کے لیے اگر حقیر سے حقیر پیشہ بھی اختیار کرنا پڑے تو اس سے اجتناب نہ کیا جائے اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ ایک واقعہ بیان فرماتی ہیں کہ "رسول اکرمؐ نے کچھ دستکاری کی، اور مسلمانوں کو بھی اختیار دیا لیکن مسلمان اس سے الگ رہے رسول اکرمؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے خطبہ پڑھا اور خدا کی حمد و ثنا کی اور فرمایا کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ ایسے کام سے الگ رہتے ہیں جس کو کہ میں خود کرتا ہوں اور بخدا میں معرفت اور خدا کا خوف تم سے زیادہ ہی رکھتا ہوں۔"[2]

غرض اسلامی معاشیات نے ہر شخص کو پیشے کی آزادی عطا کرتے ہوئے اسلامی معاشرے میں اہل پیشہ کو خاص عزت بخشی ہے، اور اہل پیشہ کو خدا کے دوست قرار دیا ہے کہ

اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ — پیشے والے اللہ کے دوست ہیں۔

پروفیسر الیاس برنی صاحب ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ معاشی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بمقابلہ ہمسایہ قوموں کے مسلمانوں میں پیشے خاص طور سے شرافت کے منافی خیال کیے جاتے ہیں اس کی وجہ شاید گزشتہ حکومت کا خمار ہو، ورنہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے ذات کے فرق کو مٹایا اور پیشہ وروں کا رتبہ بڑھا کر ہر ایک کو بلا تکلف پیشہ اختیار کرنے کی ترغیب دی، اسلامی تاریخ کے سب سے درخشاں حصے میں مسلمانوں کی آزادی، آزادی پیشہ گری ہی خاص طور سے نمایاں نظر آتی ہے، لیکن کیسے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ خود فرقہ بند ہمسایہ قوم تو ہمارے آزادانہ اصول اختیار کر کے شاہراہِ ترقی پر چل نکلے اور ہم اس کے پابندکن اصول اپنے اوپر عاید کر کے بے دست و پا افلاس و نکبت کے جال میں پھنسے رہیں، پیشے کی عزت اور ذلت کا اسلامی معیار اکلِ حلال کا ملنا نہ ملنا ہے اس معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے بمشکل کوئی ایسا پیشہ ہوگا، جس کو تھوڑا بہت عمائد و اکابر اسلام نے اختیار نہ کیا ہو۔ جب تک ہم اپنے قدیم مسلک کی طرف پھر عود نہ کریں، ہماری مالی اور لہٰذا ہر قسم کی اصلاح و

---

[1] اسد الغابہ تذکرہ سعد الانصاری۔ [2] بخاری، مسلم وغیرہ

ترقی محال ہے۔[1]

مسئلہ آبادی اور اعداد و شمار معاشیات کی بحثوں میں آبادی کے مسئلے سے بھی بحث کی جاتی ہے، کیونکہ ہر ملک میں محنت کی مقدار کا مدار، اس ملک کے مزدوروں کی تعداد پر ہوتا ہے عام طور پر اگر مزدوروں کی تعداد زیادہ ہو تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہاں محنت کی مقدار بہت زیادہ ہے، لیکن پھر تعداد حد سے زیادہ ہو تو پھر ضروریات زندگی کی فراہمی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اسلام میں بھی مسئلہ آبادی کو (۱) فوجی نقطہ نظر سے (۲) معاشی اور مالی نقطۂ نظر سے اہمیت حاصل ہے۔

ابتدائے اسلام کے وقت آبادی کا معاشی اور مالی پہلو بھی کچھ کم اہم نہ تھا مثلاً آبادی اور اس کے صحیح اعداد کا جاننا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس کے ذریعے دارالاسلام کے ذمیوں سے ان کی تعداد اور حیثیت کے لحاظ سے جزیہ وصول ہوتا تھا مال غنیمت کے علاوہ محصول زکوٰۃ، محصول جزیہ وغیرہ سے جو مال وصول ہوتا تھا وہ حکومت کی جانب سے مستحقوں اور دوسری رعایا میں چونکہ تقسیم ہوتا تھا اس لیے بھی مردم شماری کے رجسٹروں کو مرتب کیا گیا تھا، جس کی کچھ تفصیل آئندہ ہم تقسیم دولت اور مالیات کے ابواب میں کریں گے۔

کچھ انسانوں کی آبادی ہی نہیں بلکہ زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بہائم شماری یعنے ملک کے جانوروں کی تعداد کا جاننا بھی ضروری تھا نیز زکوٰۃ ہی کے محصول کو صحیح طریقے سے وصول کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ لوگوں کے ذخیرۂ دولت اور ان کی آمدنی کے صحیح معلومات فراہم کیے جائیں در اصل یہی گوناگوں اسباب ہیں، جن کی وجہ سے اعداد و شمار اور ان کی ترتیب کا کام عرب میں آفتاب اسلام کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔

اسی طرح اراضی کی پیمائش، شرح لگان اور لگان کی وصولی کے لیے زرعی اعداد و شمار کا جاننا لازمی تھا۔ آئندہ ابواب میں یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ رسول اکرمؐ نے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے تقییم کے تاکستانوں کی جانچ کرائی تھی جس طرح کہ نخلستانوں کی جانچ کرائی جاتی ہے۔

---

[1] علم المعیشت از پروفیسر الیاس برنی صاحب حصہ سوم باب سوم ص ۲۰۳

بہر حال حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ خود رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ جتنے لوگ اسلام کا کلمہ پڑھتے ہیں، ان سب کے نام لکھ کر میرے سامنے لاؤ چنانچہ ہم نے ایک ہزار پانسو مرد لکھے[1]

حضرت فاروق اعظمؓ کو تو اعداد و شمار کے اس مسئلے سے اتنی دلچسپی تھی کہ آپ نے سعد ابن ابی وقاصؓ کو حکم بھیجا کہ جتنے آدمی قرآن پڑھ سکتے ہیں ان کی فہرست تیار کرکے بھیجو نیز شاعروں کی فہرست بھی طلب کی تھی[2]

ہر ایک نیا علاقہ فتح ہونے پر اس علاقے کی باقاعدہ پیمائش اور وہاں کے رہنے بسنے والوں کی آبادی کی مردم شماری کرائی جاتی ہے غرض" اگر جزیہ دولت اور افلاس کے اعتبار سے مختلف ہو تو ذمیوں کی تعداد کے ساتھ ان کے نام بھی لکھے جائیں، تاکہ ہر ایک کی دولت و افلاس کا حال معلوم ہو سکے کہ کون کون بالغ ہوا تاکہ اس سے جزیہ لیا جائے اور کون کون مرا اور مسلمان ہوا کہ اس سے جزیہ ساقط کیا جائے اور اس طریقے سے کل مال واجب جزیہ کی مقدار متعین ہو سکے[3]

"عرب کے قدیم معاشی نظام" میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ جاہلی عرب اپنی اولاد کو فقر و فاقہ سے ڈر کر قتل کر دیا کرتے تھے اسلام میں معصوم کا خون بہانا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہو سکتا ہے۔ قرآنی ہدایت ہے کہ

وَلَا تَقْتُلُوٓا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ	فقر و فاقہ سے ڈر کر اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔
نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ۔	ہم تمھیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔
إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْـًٔا كَبِيرًا	بے شک ان کا قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

پ۱۵ بنی اسرائیل ۱۷، ع ۴

اسلامی حکومت ملک کے تمام باشندوں کے رزق کی کفالت زکوٰۃ عشر وغیرہ کے ذریعے لیتی تھی، جس کی وضاحت ہم آئندہ کریں گے۔

پھر اسلام نے رہبانیت کو ناجائز قرار دیا اور یوں دنیا کو ویران کر دینا

---

[1] ۔ بخاری پ۱۲ کتاب الجہاد بروایت حضرت حذیفہ۔

[2] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ طبری، عہد فاروقی۔

[3] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب۱۳ نیز ابو یعلی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۲۲۶۔

انسانی فطرت کے لیے مضر قرار دیا ہے اگر آبادی حد سے زیادہ گھٹتی رہے تو یہ صرف معاشی نقطہ نظر ہی سے نہیں بلکہ فوجی اور سیاسی نقطہ نظر سے بھی اس طرح گھٹنا برا ہے آبادی سے متعلق اسلام کے میلانات بڑھانے کی طرف مائل ہیں اور مذہبوں کے برخلاف اسلام میں بیواؤں کے نکاح کا بھی حکم ہے کہ

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ پ النور ۲۴ ع۴

اور بے شوہر والی عورتوں کا اور اپنے نیک کردار غلاموں اور باندیوں کا نکاح کر دو۔ اگر وہ نادار ہوں گے تو خدا اپنے فضل سے انھیں مالدار کر دیگا اور اللہ وسعت والا دانا ہے۔

بعض صحابہ عزل[1] کیا کرتے تھے تو رسول اکرمؐ نے یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ "تم ایسا نہ کرو اس لیے کہ جس جان کا پیدا ہونا اللہ نے مقدر کر دیا ہے وہ ضرور پیدا ہوگی"[2] آنحضرت نے بعض صحابہ کرام کو اولاد کی رغبت بھی دلائی تھی کہ "اے جابر! اولاد کی خواہش کرو"[3] پھر آپ نے فرمایا کہ

تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ[4]

بہت دوست رکھنے والی بہت بچے پیدا کرنے والی سے نکاح کرو کیونکہ میں تمھاری کثرت آبادی سے اور امتوں پر فخر کیا کروں گا۔

نیز یہ ارشاد فرمایا کہ

اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ[5]

نکاح میری سنت ہے۔ پس جو کوئی اس سے روگردانی کرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔

---

[1] ۔ "عرب کے قدیم معاشی نظام" باب ۱ میں عزل کا تذکرہ ہو چکا

[2] ۔ بخاری پ۲۱ کتاب النکاح نیز پ۲۲ کتاب القدر نیز مسلم وغیرہ

[3] ۔ بخاری پ۲۱ کتاب النکاح ۔

[4] ۔ ابو داؤد اور نسائی کے کتاب النکاح۔

[5] ۔ کنز العمال کتاب النکاح

البتہ بعض دوسرے مذہبوں میں آبادی بڑھانے کے جو غیر اخلاقی طریقے[1] بتائے گئے ہیں وہ اسلام میں سخت ممنوع ہیں پھر قرآن ہی نے خاص حالات میں نکاح کے معاملے میں لچک بھی رکھی ہے کہ

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ۔ — جو لوگ نکاح کا مقدور نہیں رکھتے انھیں چاہیئے باز رہیں۔ یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انھیں مالدار کردے۔

قرآن پ۱۸ النور ع۴

پھر حدیثوں سے اس عمل کی آمد کا بھی پتا چلتا ہے کہ صحابہ عزل بھی کیا کرتے تھے چنانچہ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "ہم عزل کیا کرتے تھے حالانکہ اس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا[1]" یعنے اگر عزل ناجائز ہوتا تو قرآن میں اس کی ممانعت آتی لیکن نفسانی اغراض کے تحت ضبط تولید کے جو جدید طریقے رائج ہو رہے ہیں، ان کی بابت فقہائے اسلام کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کس حد تک جائز قرار دیے جاسکتے ہیں!

ہجرت اسلام میں "ہجرت" کا قانون ایک مستقل قانون ہے اور گو اصل مقصود

I برہمنوں کے ہاں نیوگ کا رواج ہے کہ "اولاد کے نہ ہونے میں خسر وغیرہ کے حکم کو پاکر عورت رشتہ دار سے یا دیور سے اولاد حسب دلخواہ حاصل کرے"، منوسمرتی ادھیائے (۹) نمبر (۵۹) نیوگ کی مفصل کیفیت پنڈت دیانند سرسوتی کی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش میں ملاحظہ کے قابل ہے۔

اسی طرح یہودیوں کے ہاں ہے کہ "اگر دو بھائی ایک جا رہتے ہوں، اور ان میں سے ایک بے اولاد مر جائے تو اس متوفی کی بیوی کا بیاہ کسی اجنبی سے نہ کیا جائے بلکہ اس کے شوہر کا بھائی اس سے خلوت کرے اور اسے اپنی بیوی بنائے اور بھاوج کا حق اسے ادا کرے اور یوں ہوگا کہ اس کا پلوٹھا جو اس سے پیدا ہو تو اس کے متوفی بھائی کے نام کا شمار ہوگا تاکہ اس کا نام اسرائیل سے مٹ نہ جائے (اگر یہ شوہر بننے سے انکار کرے) تو اس کے بھائی کی بیوی بزرگوں کے سامنے اس کے نزدیک اور اس کے پاؤں کی جوتی نکالے اور اس کے منہ پر تھوک دے اور جواب دے اور کہے کہ اس شخص کے ساتھ جو اپنے بھائی کا گھر نہ بنائے یہی کیا جائے گا اور اسرائیل میں اس کا نام یہ رکھا جائے کہ یہ اس شخص کا گھر ہے جس کا جوتا نکالا گیا" (توریت استثناء باب ۲۵ نمبر ۵ تا ۱۰)۔

۱۔ بخاری پ۲۱ کتاب النکاح۔

اس قانون سے مسلمانوں کے دین کی حفاظت ہے یعنی جن ملکوں میں دینی زندگی گزارنے میں دشواری پیش آتی ہو، اور مادی طور پر اس دشواری کے ازالے کی قوت مسلمانوں میں نہ ہو، تو اس وقت دین کی حفاظت کا ذریعہ ہجرت کا قانون ہی ہو سکتا ہے لیکن قرآنی آیتوں جن میں ہجرت کا حکم دیا گیا ہے ان کو پڑھیے مثلاً یہی آیت

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً۔ — جو کوئی خدا کی راہ میں ہجرت کرتا ہے تو روئے زمین پر مرفہ الحالی اور کشادگی پاتا ہے

پ۵ النساء ع ۱۵

تو اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت معاشی دشواریوں کے حل کی بھی ایک قرآنی راہ ہے۔

خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کا جو حکم دیا تھا تو اس کی وجہ ابن اسحاق نے یہ لکھی ہے کہ "رسول اللہ نے ان کو حبشہ چلے جانے کا حکم دیا کیونکہ اس وقت حبشہ کا بادشاہ نجاشی نہایت عادل اور نیک فرمانروا تھا، اس کی حکومت کی تعریف کی جاتی تھی اس سے پہلے سے حبشہ قریش کی تجارت گاہ تھا جب یہ تجارت کی غرض سے وہاں جاتے تو وہاں خوراک کی فراوانی اور امن پاتے، اور تجارت میں نفع کماتے اسی وجہ سے رسول اللہ نے مسلمانوں کو حبشہ جانے کا حکم دیا[1]"

اسی مقالے میں "عرب کے قدیم معاشی نظام" کے باب میں بتایا گیا ہے کہ حجاز میں معاشی وسائل بہت ہی کم تھے حتیٰ کہ بعض جگہ زراعت بھی نہیں ہو سکتی تھی اسی لیے صحابۂ کرام کے عہد میں حجاز کی زائد از ضرورت آبادی عراق، مصر وغیرہ کے سرسبز و شاداب علاقوں میں بسائی جانے لگی چنانچہ خود حضرت عمرؓ کے زمانے میں کوفہ، بصرہ، اور فسطاط وغیرہ میں مسلمانوں کی نئی آبادیاں قائم ہوئیں۔

حضرت عمرؓ کی نو آبادکاری کی پالیسی ان کی تقریروں سے بھی عیاں ہے کہ جب مسلمانوں کو ایران سے مقابلے کے لیے بھیجا جا رہا تھا تو حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر

---

[1] تاریخ طبری صفحہ ۱۱۸۱ مسلمانوں کی پہلی جماعت جو سمندر پار حبشہ گئی وہ گیارہ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل تھی پھر اس کے بعد دیگرے مسلمان حبشہ کو ہجرت کرنے لگے ان میں وہ بھی تھے جو اپنے اہل و عیال کو لے کر گئے تھے اور وہ بھی تھے جو تنہا گئے تھے۔ ان سمندر پار ہجرت کرنے والوں کی تعداد بیاسی تھی مزید تفصیل تاریخ طبری صفحہ ۱۱۸۳ مہاجرین حبشہ کے نام۔

یہ تقریر کی کہ "مسلمانو! تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ حجاز کی سرزمین میں تمھاری بود وباش کی صرف یہی صورت ہو سکتی ہے کہ تم چارے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے رہو اس کے یہاں کوئی معاش کا ذریعہ نہیں ہے"[1] اس کے بعد ان کو عراق وغیرہ میں جانے کے لیے ہدایتیں دیں۔

جریر بن عبداللہ البجلیؓ جو ایک جلیل القدر صحابی اور قبیلہ بجیلہ کے سردار تھے اپنے قبیلے کو لیکر شام میں بس جانا چاہتے تھے، حضرت عمرؓ کو معلوم تھا کہ شام کے مقابلے میں عراق کی زمینیں زرخیز ہیں اس لیے انھیں مشورہ دیا کہ وہ عراق میں آباد ہو جائیں چنانچہ "حضرت عمرؓ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہاں (شام میں) تمھاری ضرورت نہیں ہے عراق جاؤ عراق، اس ملک کو چھوڑ دو جس کی شان وشوکت خدا نے کم کر دی ہے اس قوم سے جہاد کرنے کے لیے بڑھو جس نے معیشت کے تمام دروازوں پر قبضہ کر رکھا ہے خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ اس میں سے تم کو بھی حصہ دیگا اور تم بھی دوسروں کی طرح معاش کے وسائل سے بہرہ مند ہو گے"[2]

مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت خالدؓ کی تقریر بھی نو آبادکاری کے سلسلے میں معاشی نقطۂ نظر سے کافی اہمیت رکھتی ہے چنانچہ جب وہ بلادِ عجم کو فتح کرنا چاہتے تھے تو انھوں نے کھڑے ہو کر ایک تقریر کی جس میں مسلمانوں کو بلادِ عجم کے فتح کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ "عرب کے ملک میں کیا دھرا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہاں (عراق) میں مٹی کے تودوں کی طرح کھانے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں خدا کی قسم اگر جہاد اور خدا کے نام کی تبلیغ ہم پر فرض نہ ہوتی بلکہ صرف طلبِ معاش کی ہم کو ضرورت ہوتی تب بھی میں تم کو یہی مشورہ دیتا کہ ان شاداب علاقوں کے لیے لڑو اور ان کے مالک بن جاؤ اور بھوک اور غذا کی قلت کا تحفہ ان کاہلوں کے لیے چھوڑ دو جو تمھاری جد وجہد میں شریک ہونے سے جی چُراتے ہیں"[3]

الغرض قرآنی تعلیم، اسوۂ حسنہ اور صحابۂ کرامؓ کی ہدایتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ

۱۔ تاریخ طبری، عہد فاروقی۔ ۲۔ تاریخ طبری ص ۲۱۸۵، جنگ بویب کے واقعات ۱۳ھ
۳۔ تاریخ طبری ص ۲۰۳۲ سنہ ۱۲ھ کے واقعات۔

مسلمان پہلی صدی کی ابتدا ہی میں معاش کی طلب اور دین کی تبلیغ کے لئے دُور دُور تک نکل گئے، ان کی نوآبادیاں مشرق میں چین، جاوا، سوماترا، لنکا و ہندوستان تک تھیں تو دوسری طرف برِّ اعظم افریقہ میں مصر، طرابلس، تیونس، مراکش، الجزائر اور حبش وغیرہ میں نیز بحیرۂ روم کے اکثر جزیرے اور خود یورپ میں اسپین، فرانس، اٹلی وغیرہ کے علاقوں میں مسلمان جا بسے تھے، تجارت اور ملازمت کے ساتھ ساتھ دین کی تبلیغ بھی کرتے تھے خود ہندوستان میں مسلمان فاتحانہ حیثیت سے آنے سے پہلے خصوصاً جنوبی ہند میں تاجرانہ حیثیت سے آچکے تھے۔

غرض اسلامی معاشیات اپنے پیرؤں کو ترغیب دیتی ہے کہ اگر ایک مقام پر پیدائش دولت کے سلسلے میں دشواری ہو تو دوسرے مقام میں ہجرت کرجائیں جہاں معیشت کے وسائل بہ آسانی مہیا ہو سکتے ہیں اور اس فقرو فاقے سے محفوظ ہو جائیں جس کی نسبت رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ "قریب ہے کہ فقر ناداری کفر کے درجے کو پہنچ جائے"، نیز یہ بھی فرمایا کہ

اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْهِ فِي الدَّارَيْنِ۔ محتاجی اور ناداری دونوں جہاں کی روسیاہی ہے[1]

مدینے میں توطن مدینے میں آکر سب سے پہلا مسئلہ جو رسول کریمؐ نے حل فرمایا وہ مہاجرین کا معاملہ تھا جنھیں معاشی وسائل ابھی حاصل نہیں ہوئے تھے، چنانچہ رسول اکرمؐ نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے انصار اور مہاجرین میں مواخات (بھائی چارہ) کا سلسلہ قائم کردیا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ "انصار نے مہاجرین کو قرعہ ڈال کر آپس میں تقسیم کر لیا تھا"[2]

اوس وخزرج کے قبیلوں کا نام انصار اسی وجہ سے ہو گیا کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کی مدد کی تھی انصار کے معنے ہی عربی زبان میں مدد دینے والوں کے ہیں حدیث کی کتابوں کے علاوہ تاریخ، سیرت اور رجال کی کتابوں میں تمام مہاجرین کے نام اور نیز جن انصار سے بھائی چارہ ہوا تھا اس کی تفصیل درج ہے[3]۔ لیکن یہاں مقصد اس کی تفصیل نہیں ہے، بلکہ صرف

---

[1] بخاری ج ۲ تعبیر الرؤیا۔

[2] تفصیل کے لیے بخاری ج ۱ باب ہجرت یا مناقب الانصار دیکھیے

یہ بتانا ہے کہ اس مسئلے کا حل کیونکر کیا گیا؟ ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ "انصار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم لوگ اپنے باغ اپنے بھائیوں (مہاجرین) کے درمیان تقسیم کیے لیتے ہیں آپؐ نے فرمایا نہیں تب انھوں نے کہا تم (مہاجرین) محنت کر دیا کرو اور ہم تمھیں پھلوں میں شریک کریں گے تو مہاجرین نے کہا اچھا ہم اس کو منظور کر لیتے ہیں[1]" اسی سلسلے میں ایک اور واقعہ درج کیا جاتا ہے، تاکہ اس بھائی چارے کی اسپرٹ معلوم ہو جائے "حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو رسول کریمؐ نے میرے اور سعد بن ربیع انصاریؓ کے درمیان بھائی چارہ کرایا، سعد بن ربیع نے مجھ سے کہا کہ تمام انصار میں میں سب سے زیادہ مالدار ہوں اس لیے میں تمھیں آدھا مال دے دوں گا اور تم میری دونوں بیویوں میں سے جس کو پسند کرو اسے میں تمھارے لیے طلاق دیدوں، جب اس کی عدت پوری ہو جائے تو تم اس سے نکاح کر لینا۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں تم یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی بازار بھی ہے جس میں تجارت ہوتی ہو؟ انھوں نے کہا ہاں! قینقاع ایک بازار ہے (راوی کا بیان ہے کہ) صبح عبدالرحمٰنؓ اس بازار میں گئے اور وہاں سے کچھ پنیر اور گھی لے آئے۔ پھر تو انھوں نے روزانہ جانا شروع کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ، رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے لباس پر زردرنگ کا نشان تھا۔ رسول کریمؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم نے نکاح کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا ہاں!۔ آپ نے فرمایا کس سے انھوں نے کہا اس انصاری خاتون سے۔ آپ نے فرمایا تم نے اسے کس قدر مہر دیا؟ انھوں نے عرض کیا ایک گٹھلی برابر سونا یا یہ کہا کہ ایک سونے کی گٹھلی پھر ان سے رسول خداؐ نے فرمایا کہ ولیمہ کرو اگرچہ ایک بکری ہی سہی[2]"

---

[1] بخاری پ۹ کتاب المزارعت نیز پ۱۵ مناقب الانصار

[2] بخاری پ۸ کتاب البیوع نیز پ۱۵ مناقب الانصار، پ۲۱ کتاب النکاح، پ۲۵ کتاب الادب یہی عبدالرحمٰن بن عوفؓ جو ہجرت کے دنوں میں محتاج و نادار ہو کر مدینہ آئے تھے تجارتی کاروبار کی بدولت مالامال ہو گئے۔ ابن سعد وغیرہ مورخین کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں

خیبر کی جنگ تک مہاجرین انصار ہی کے ساتھ رہے پھر رفتہ رفتہ ان کی مستعار لی ہوئی اشیا واپس کر دیں بخاری نے بیان کیا ہے کہ "جس وقت مہاجرین مکے سے مدینہ آئے تو ان کے پاس کچھ نہ تھا اور انصار زمین اور مال و اسباب والے تھے، ان مہاجرین کو انصار نے اپنے مال اس شرط پر بانٹ دیے کہ وہ ہر سال انھیں نصف پھل دیدیا کریں اور محنت مشقت سب وہی کیا کریں حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیم نے —— جو کہ عبداللہ بن ابی طلحہؓ کی بھی ماں تھیں —— رسول کریمؐ کو کچھ درخت دیے تھے تو وہ آپ نے اپنی آزاد کردہ لونڈی ام ایمن کو —— جو کہ اسامہ بن زید کی والدہ تھیں —— دے دیے تھے زہری کہتے ہیں کہ مجھ سے انسؓ نے بیان کیا کہ نبی کریمؐ جب اہل خیبر کی جنگ سے فارغ ہوئے اور مدینے کی طرف لوٹے تو مہاجرین نے انصار کو ان کی دی ہوئی اشیاء واپس کر دیں یعنے وہ پھلوں کے درخت جو انھوں نے مہاجرین کو دیے تھے پس نبی کریمؐ نے حضرت انس کی والدہ کو ان کے درخت واپس کر دیے اور ام ایمن کو رسول کریمؐ نے ان کے عوض میں اپنے باغ سے کچھ درخت عنایت فرمائے۔[1]

بخاری میں ام ایمن کا ایک دلچسپ قصہ بھی ہے چنانچہ "حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ لوگ رسول کریمؐ کو کھجور کے درخت ہدیۃً دیتے تھے جب آپؐ نے بنی قریظہ پر فتح پائی اور ان کے باغات ہاتھ آئے تو آپؐ لوگوں کے عطیے واپس دینے لگے، میرے گھر والوں نے مجھے نبی اکرمؐ کی خدمت میں اپنی دی ہوئی چیزوں کو مانگنے کے لیے بھیجا، رسول اکرمؐ نے وہ ام ایمن کو دیدیا تھا ام ایمن یہ خبر سنتے ہی آئیں اور میرے گلے میں انھوں نے کپڑا ڈال دیا اور کہنے لگیں کہ اس ذات کی قسم کہ جس کے سوا کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) انھوں نے اپنا آدھا مال یعنے چار ہزار درہم تصدق کیا اس کے بعد چالیس ہزار درہم اور پھر چالیس ہزار دینار تصدق کیا، غریب مجاہدین کو راہ خدا میں پانسو گھوڑوں پر اور پھر پانسو اونٹوں پر سوار کرایا۔ رسالت مآبؐ کی رحلت کے بعد امہات المومنین کی خدمت میں ایک باغ پیش کیا جو چالیس ہزار دینار یا درہم میں فروخت ہوا۔ ملک شام سے عبدالرحمن بن عوفؓ کا تجارتی سامان اونٹوں پر لد کر آتا تو ان بے شمار اونٹوں کی آوازوں سے مدینہ لرز اٹھتا تھا۔[1] بخاری پ۱ کتاب الہبہ۔

معبود نہیں رسول خدا ؐ ہرگز تمھیں وہ عطیے واپس نہ دیں گے ـــــــ حالانکہ رسول خدا ؐ نے مجھے دیدیا تھا ـــــــ اور وہ کہتی تھیں بخدا میں تمھیں ہرگز نہ دوں گی پھر آنحضرت ؐ نے انھیں تسلی دی اور آخر آپ ؐ نے ام ایمن کو دس گنا یا اس سے زیادہ دیا[1]

(۴) اصل کے مسائل

اصل کی نوعیت عطیات قدرت پر محنت کرنے سے دولت پیدا ہوتی ہے، اگر اس حاصل کی ہوئی دولت کو مزید دولت پیدا کرنے کے لیے کاروبار میں لگایا جائے تو وہ اصل[2] کہلاتی ہے۔

اصل بھی ایک اہم عامل پیدائش ہے۔ اصل کے بغیر محنت کی بارآوری بہت کم اور معمولی سی تھی، لیکن ایک مرتبہ جب انسان کے قبضے میں اصل آگیا تو اس سے محنت کی بارآوری اور ثمر بخشی میں اضافہ ہوگیا اور اس کے نتیجے کے طور پر مزید اصل کی تخلیق آسان ہوگئی۔

اسلامی مالیات ہر ایسی فاضل دولت پر جس میں پیداوار کے اضافے (نمو) کی صلاحیت ہوتی ہے، پیدا آور قرار دیتے ہوئے زکوٰۃ کا محصول لگاتی ہے خواہ سرمایہ کاروبار میں لگا ہو، خواہ بے کار پڑا ہو۔

زکوٰۃ کے محصول کی خوبی یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی دولت کو تجوریوں میں بند رکھنے کی بجائے دولت کو کاروبار میں لگائے، تاکہ اگر ایک طرف عام لوگوں کو زیادہ سے زیادہ روزگار فراہم ہو سکے تو دوسری طرف

۱۔ بخاری پ۱۶ کتاب المغازی

۲۔ اصل :- کیپٹل کو عربی میں راس المال کہتے ہیں۔ سابقہ اردو میں سرمایہ کا لفظ استعمال ہوتا تھا، حالیہ اصطلاح میں اصل کہتے ہیں۔

دولت میں خاطر خواہ اضافہ ہو کر معیارِ زندگی بڑھے سرکارِ دو عالم نے ایک دن خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

اَلَا مَنْ وَلِیَ یَتِیْمًا لَہٗ مَالٌ فَلْیَتَّجِرْ فِیْہِ وَلَا یَتْرُکْہُ حَتّٰی تَاْکُلَہُ الصَّدَقَۃُ[1]

آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں جو کوئی یتیم کا متولی بنے اور اس یتیم کے پاس مال و دولت ہو تو اُس سے تجارت کرے اور یونہی ڈال نہ رکھے ایسا نہ ہو کہ زکات ہی اُسے ختم کر ڈالے۔

اسی ارشاد کی تعمیل میں امام مالکؒ بیان فرماتے ہیں کہ ''اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ یتیموں کا مال تجارت کے لیے دیا کرتی تھیں''[2] اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بھی اپنی خلافت کے زمانے میں یتیموں کا مال تجارتی اغراض کے لیے کاروبار میں لگایا کرتے تھے[3]۔

حضرت عمرؓ نے باقاعدہ اصل کی پیداآوری کو بڑھانے پر زور دیا ہے چنانچہ محمد بن سعد، واقدی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ''خالد بن عرفطہ العذری حضرت عمرؓ کے پاس آئے حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ جنھیں تم چھوڑ آئے ہو ان کا کیا حال ہے؟ کہا کہ میں نے انھیں اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اُن کی عمریں آپ کی عمر میں جوڑ دے، جنگ قادسیہ میں شریک ہونے والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جسے دو ہزار یا ڈیڑھ ہزار عطا نہ ملتی ہو، نہ بچوں میں ـــــ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی ـــــ کوئی بچہ ایسا ہے جو

---

[1] ترمذی، کتاب الزکواۃ الجزء الثالث صفحہ (۱۳۶) مطبوعہ مصر، نیز موطا، کتاب الزکواۃ میں حضرت عمرؓ نے بھی اسی سے ملتے جلتے الفاظ کہے ہیں مزید تفصیل تفسیر طبری آیت: ''قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَیْرٌ''

[2] موطا امام مالک کتاب الزکواۃ بروایت یحیٰ ابن یحیٰ نیز کتاب الاموال صفحہ ۴۵۱ نمبر ۱۳۰۷۔

[3] مبسوط السرخسی نیز کتاب الاموال صفحہ ۴۵۰ تا ۴۵۱ نمبر (۱۳۰۲ تا ۱۳۰۹)
یتیموں کی دولت جو کاروبار میں لگائی گئی تھی، اس کا اندازہ دورِ راشدہ میں کئی لاکھ تھا خود عہد فاروقی میں یہ دولت ہزاروں سے گزر کر لاکھ ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی تھی (تفصیل الفاروق ج ۲ صفحہ ۱۹۳ عنوان ''یتیموں کی خبر گیری'' مطبوعہ نامی پریس کانپور)

سو درہم اور دو جریب ماہانہ نہ پاتا ہو، بولے یہ اُن کا حق ہے جسے میں ان تک پہنچا کر سعادت پاتا ہوں اگر یہ مال خطاب (حضرت عمرؓ کے والد کا نام ہے) کا ہوتا تو میں ہرگز نہ دیتا میں جانتا ہوں کہ عطا ان کی ضرورتوں سے زیادہ ہے، اگر ان میں سے ہر شخص یہ کرے کہ جب اس کو عطا ملے تو وہ اس سے ایک بکری خرید لیا کرے اور جب دوسری عطا ملے تو ایک راس یا دو راس خرید لیا کرے تو اس سے اس کے سواد میں اضافہ ہوگا اور اس کے بعد اس کی اولاد خالی ہاتھ نہ ہوگی، اس مال میں سے کچھ نہ کچھ اس کے پاس باقی ہوگا میں نہیں جانتا کہ میرے بعد کیا ہوگا۔[1]

بخاری وغیرہ میں ایک طویل حدیث ہے کہ تین اشخاص ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے، لیکن خداوند تعالیٰ کی طرف سے محض ان کی نیکیوں کے صلے میں انھیں نجات ملی۔[2] تیسرے شخص نے کہا کہ میں نے مزدوروں کو کام پر لگایا تھا اور میں نے ان کی اجرت ادا کر دی سوائے ایک مزدور کے جو اس کو چھوڑ کر چلا گیا تھا میں نے اس کی اجرت کو سودمند کاروبار میں لگا دیا اور اس اجرت کی رقم سے آمدنی ہونے لگی (فَثَمَّرْتُ اَجْرَهٗ)[2] نیکی جو اُس شخص نے کی وہ یہ تھی کہ اس نے اجرت کی رقم بےکار ڈال نہ رکھی بلکہ اس کو کاروبار میں لگائی اور جب مزدور واپس ہوا تو نہ صرف اس کی معمولی اجرت عطا کی جو اس کو قابل وصول تھی، بلکہ کاروبار سے جو مزید دولت کمائی گئی تھی، وہ بھی عطا کی۔

ہر شخص یا تو خود اپنے لیے کماتا ہے یا پھر اپنی اولاد کے لیے جن سے اس کو فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ پیغمبر خدا نے اس خیال سے کہ بعض لوگ کوتاہ اندیشی سے غفلت نہ برتیں، دولت کے اضافے کی ہدایت فرما دی، جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے کہ

اِنَّكَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ[3]	اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے انھیں نادار چھوڑا جائے کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔

[1] فتوح البلدان بلاذری صفحہ (۴۵۳) حضرت عمرؓ کے زمانے میں عطا کی ابتدا اور اس کا انتظام۔
[2] بخاری پ کتاب البیوع نیز بخاری کے دیگر ابواب۔ [3] بخاری ۱۹ پ کتاب الوصیت نیز بخاری ۲۷ پ کتاب الفرائض نیز مسلم، ابوداؤد وغیرہ۔

اجتماعِ اصل کے شرائط

اصل میں اضافے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ملک میں ہر طرف امن و امان ہو، جہاد کا منشاء اور مقصد بھی قرآن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ (پ۲ البقرۃ ع۲۴)

یہاں تک کہ ملک میں فتنہ فساد باقی نہ رہے اور "الدین" (یعنی انسان کی آئینی زندگی) صرف خدا کے مرضیات کے تابع ہو جائے۔

خود لفظ اسلام، سلم (امن، سلامتی) سے مشتق ہے رسول اکرمؐ نے مال کی حرمت کو جان کی حرمت کے مثل قرار دیا ہے چنانچہ آپ نے آخری حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ دیا اس میں اعلان فرمایا کہ

"بے شک تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو ایسی ہی حرام ہے، جیسی کہ تمہارے اس شہر میں آج کے دن کی حرمت ہے[1]

اجتماع اصل کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ باشندے فضول خرچ نہ ہوں، چنانچہ کئی مقاموں میں اسراف اور فضول خرچی سے قرآن نے روکا ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ کھاؤ پیو مگر فضول خرچی نہ کرو۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ بے شک خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

پ۸ الاعراف ع۳

اسلامی معاشیات نے معاملات میں خوش معاملگی، ایمان داری برتنے پر بھی زور دیا ہے، جس سے ساکھ بڑھتی ہے ہم اس پر مبادلۂ دولت کے باب۵ میں بحث کریں گے۔

شغلِ اصل کے طریقے

اسلامی معاشیات کاروبار میں شخصی جد و جہد اور خانگی جائداد رکھنے کی اجازت

---

[1] مسلم۔ ابواب البر والصلۃ ج ۹ نیز بخاری پ۱۸ حجۃ الوداع نیز تاریخ طبری صفحہ ۱۷۵۳

دیتی ہے۔ اشتمالی معاشیات نے ان اداروں کے خلاف ہیں اس وجہ سے علم بغاوت بلند کیا ہے کہ اس سے نتیجے میں دولت چند افراد کے ہاتھ میں اکٹھی ہو جاتی ہے۔ دولت چند لوگوں کے پاس جمع نہ ہونے کے لیے اسلامی معاشیات نے جو اصول پیش کیے ہیں انھیں آئندہ ابواب میں بیان کیا گیا ہے، البتہ یہاں صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ مذکورہ اداروں کی موقوفی سے انفرادی اولوالعزمی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی معاشیات کاروبار میں خانگی کوششوں کو تسلیم کرتی ہے اور اس کو "فضل الہٰی" سے تعبیر کرتی ہے اور کاروبار کی واضح طور پر اجازت دیتی ہے کہ

أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا — خدا نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے

پ۳ البقرہ ع ۳۸

(۱) انفرادی کاروبار شغل اصل کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ انسان اپنے سرمایہ سے خود ہی کاروبار کرے چنانچہ اگلی صراحت کے موافق تجارت ابتدا میں اکابر اسلام کا خاص مشغلہ رہا ہے، آج بھی چلر فروشی کے بے شمار تجارتی فرم ایک فرد ہی کی ملکیت میں چلائے جاتے ہیں زراعت میں بھی عام طور پر یہی طریقہ جاری ہے۔

انفرادی کاروبار ہی کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنی نگرانی میں چند مزدور رکھ کر ان سے اجرت پر کام لیا جائے، چنانچہ اکثر چھوٹے کارخانے اسی طریق پر چلتے ہیں اسلامی ماخذوں سے پتا چلتا ہے کہ بعض صحابہ اور تابعین حبشیوں کو اپنے کھیتوں پر رکھ کر اجرت پر ان سے کام بھی لیتے تھے[۱]

(۲) قراض یا مضاربت شغل اصل کا ایک اور طریقہ قراض[۲] ہے، اگر کسی کاروبار میں ایک شخص تمام سرمایہ فراہم کرے اور دوسرا صرف محنت کرے اور دونوں منافع میں شریک ہوں تو اسے قراض یا مضاربت سے تعبیر کیا جاتا ہے

۱۔ بخاری پ۴ کتاب الصلوٰۃ، صلوٰۃ الجمعہ۔ رزیقؓ حاکم ایلہ کا قصہ

۲۔ اہل حجاز قراض کہتے ہیں اور عراق والے مضاربت کہتے ہیں (زرقانی شرح موطا الجزء الثالث صفحہ ۱۵۱) انگریزی اصطلاح میں اس کو سلیپنگ پارٹنر شپ کہتے ہیں۔

"اس کی صفت بیان کرنے میں تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ قراض میں ایک شخص دوسرے کو تجارت کرنے کے لیے ایک مقرر کردہ معاوضے پر اپنا مال دیتا ہے اور کارکن (عامل) مال کے نفع میں پاؤ تہائی یا آدھا جو بھی آپس میں طے ہو جائے لے لیتا ہے"[1]

اُجرت اور قراض میں فرق:۔ "اُجرت اور قراض میں یہ فرق ہے کہ اُجرت کی ادائی سرمایہ دار (ربُّ المال) کے ذمے ہوتی ہے، خواہ مال میں نفع ہو کہ نہ ہو، اور قراض میں یہ صورت ہے کہ اگر نفع ہوتا ہے تو کارکن (عامل) کو اس کا ایک حصہ ملتا ہے ورنہ کچھ بھی نہیں ملتا"[2]

قراض کا عمل در آمد اسلام سے پہلے:۔ اسلام سے پہلے بھی عرب میں قراض کے ذریعے کاروبار کرنے کا رواج تھا اور خود رسول اکرمؐ سے حضرت خدیجہؓ نے قراض پر کام لیا تھا چنانچہ مورخ طبری ابن اسحاق سے روایت کرتے ہیں کہ "خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی نہایت مالدار تاجر بی بی تھیں، دوسرے لوگ ان کے مال کی تجارت کرتے تھے اور منافع میں سے وہ کچھ ان کو دیدیا کرتی تھیں، قریش تاجر قوم تھی چنانچہ جب حضرت خدیجہؓ کو رسول اکرمؐ کی راست گفتاری، امانت داری اور نیک کرداری کا علم ہوا تو انھوں نے آپؐ کو بلا بھیجا اور درخواست کی آپؐ میرا تجارتی مال لے کر شام جائیں، میں اب تک دوسرے تاجروں کو منافع میں سے جس قدر دیتی تھی، اس سے زیادہ آپ کو دونگی، اور اپنے غلام میسرہ کو ساتھ کر دوں گی، آپ نے یہ تجویز منظور فرمالی اور ان کا مال لیکر روانہ ہوئے"[3]

رسول اللہؐ کا عمل:۔ خیبر فتح ہوا تو رسول اللہؐ نے وہاں کی زمینیں بٹائی پر یہودیوں کو دی تھیں "رسول خداؐ نے خیبر یہودیوں کو اس شرط پر دیا تھا کہ وہ اس میں کام کریں اور

---

[1] بدایۃ المجتہد لابن رشد الحفید ج ۲ صفحہ ۱۹۷ کتاب القراض، مطبع جمالیہ مصر۔
[2] بدایۃ المجتہد لابن رشد الحفید ج ۲ صفحہ ۲۰۳ کتاب القراض، القول فی حکم القراض الفاسد۔
[3] تاریخ طبری صفحہ ۱۱۲۷ رسول اکرمؐ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے نیز ابن سعد صفحہ ۸۳۔

جو کچھ اس کی پیداوار ہو اس کا نصف ان کو ملیگا۔[1]

صحابۂ کرام کا عمل:۔ صحابہ کرام بھی قراض کے ذریعے کاروبار کرتے تھے چنانچہ "یعقوب المدنی کا بیان ہے کہ انھیں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے قراض کے طور پر مال دیا تھا کہ وہ اس پر محنت کریں اور منافع میں دونوں شریک ہوں"[2]

قراض کے متعلق فقہاء کے بیانات:۔ قراض کے جواز کے بارے میں فقہاء میں کوئی اختلاف نہیں ہے انھوں نے اس کے چند مضر پہلوؤں کا سدباب کرکے اس کی سود مندی بڑھا دی ہے۔[3] "قراض یا مضاربت ایک معاہدہ ہے جس میں ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا محنت (عمل) بہم پہنچاتا ہے اور دونوں نفع میں شرکت کے مستحق اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ ان میں سے ایک شخص سرمایہ (مال) لگاتا ہے اور دوسرا محنت کرتا ہے"[4] غرض مضاربت یا قراض میں سرمایہ دار سرمایہ سے اور محنت والا محنت سے نفع اٹھا سکتا ہے۔

منافع میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کا حصہ:۔ قراض کا مقصد ہی نفع کمانا ہوتا ہے کہ

وَالْمَقْصُودُ مِنْهُ الْاِسْتِرْبَاحُ	اس کا مقصد نفع کمانا ہوتا ہے۔

قراض کے کاروبار میں سرمایہ دار اور محنت کرنے والے دونوں نفع پاتے ہیں

فَاِنَّ رَبَّ الْمَالِ يَسْتَحِقُّ نَصِيْبَهُ مِنَ الرِّبْحِ بِمَالِهِ، وَالْمُضَارِبُ بِعَمَلِهِ۔[5]	سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی وجہ سے اور مضارب اپنی محنت (عمل) کی وجہ سے نفع کا حق دار ہوتا ہے

یہاں قطع کلام کرکے یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اب جبکہ یہ مقالہ طباعت کے لیے بھیجا جا رہا ہے چینی کمیونسٹ علاقے کی زندگی کا نقشہ اخباروں میں طبع ہوا ہے کمیونسٹ مزدوروں کی انجمنوں اور مالکان صنعت کے درمیان

---

[1] بخاری پ۱ کتاب الشروط۔ [2] موطا کتاب القراض۔
[3] بدایۃ المجتہد ج ۲ صفحہ ۱۹۷ کتاب القراض۔ [4] ھدایہ ج ۳ کتاب المضاربۃ۔
[5] ھدایہ ج ۳ کتاب المضاربۃ۔

ایک سمجھوتہ ہوا ہے سمجھوتے کی بنیاد یہ ہے کہ

"مزدور اور سرمایہ دار دونوں کو نفع حاصل ہو"

"اس کا اثر یہ ہے کہ ہر کوئی مزدور خواہ وہ سرکاری کارخانہ میں ملازم ہو یا خانگی کارخانے میں مسرت کے ساتھ یہ بیان کرے گا کہ اب اس کی حالت کسی قدر زیادہ بہتر ہے اور یہ کہ پیداوار میں اضافہ کے لیے شخصی طور پر وہ کیا کوشش کر رہا ہے کئی سرمایہ داروں نے بھی مجھ سے بیان کیا کہ حالات اب سابق کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہیں اور یہ کہ وہ صنعتوں میں جس قدر سرمایہ لگا سکتے ہیں، لگا رہے ہیں[1]"

اسلامی معاشرے میں قراض کی اہمیت :- مضاربت یا قراض کے ذریعے کاروبار کرنے کی اسلامی معاشرے میں خاص اہمیت ہے کیونکہ ہر ایک معاشرے میں مالدار اور نادار، ذہین اور کند ذہن ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان سب کے اتحاد سے معاشرے کا ہر فرد کاروبار سے لگ جاتا ہے چنانچہ فقہاء بیان کرتے ہیں کہ "مضاربت کی شریعت نے اس وجہ سے اجازت دی ہے کہ لوگوں کو اس کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ لوگوں میں بعض لوگ تو مالدار ہوتے ہیں لیکن انھیں اپنے مال میں تصرف کی صلاحیت نہیں ہوتی اور بعض اشخاص گو کہ مال کا تصرف اچھی طرح جانتے ہیں لیکن نادار ہوتے ہیں پس اس قسم کے کاروبار کے مشروع ہونے کی ضرورت پیدا ہوئی تاکہ کند ذہن اور ذہین، مالدار اور نادار کی مصلحتیں انتظام کے ساتھ قائم ہوں۔ جس وقت رسول کریمؐ مبعوث ہوئے تو لوگ مضاربت سے کاروبار کرتے تھے چنانچہ آپ نے اس کو برقرار رکھا اور صحابۂ کرامؓ نے بھی اس پر عمل کیا[2]"

۱۔ چینی کمیونزم، مقبوضہ علاقے کا نقشہ از آلن ونگٹن بحوالہ الہدیٰ ج ۱ شمارہ ۲۹ مورخہ ۵ ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ مطابق ۴ فروری ۱۹۴۹ء۔

۲۔ ہدایہ ج ۳ کتاب المضاربۃ۔

پروفیسر الفرڈ مارشل کے خیال کے مطابق اگر کوئی شخص کسی تجارت یا صنعت میں مہارت حاصل کرنے اور اس کے ذریعہ سے دولت مند ہو جائے تو اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس کی

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ "مضاربت کے جواز میں صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ مضاربت جائز ہے، کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ عمل کرتے ہوئے ملاحظہ فرمایا اور ان کے اس عمل کی توثیق فرمائی" اس فقرے کی توثیق میں ابن ہمام لکھتے ہیں کہ مضاربت کے جواز کے لیے بہ نسبت کسی خاص حدیث کے زیادہ تر صریح دلیل موجود ہے یعنی رسول اللہؐ کے زمانے سے لوگوں کا لگاتار عمل کرنا اسی بنا پر کسی خاص حکم تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے[1]

اس موقع پر یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا یورپ کے بعض ملکوں میں کاروبار کا یہ طریقہ کاروباری مسلمانوں کے عمل درآمد سے رائج ہوا چنانچہ پروفیسر ارنسٹ نیس نے اپنی کتاب ہسٹری آف اکنامکس میں شہادت دی ہے کہ "کمنڈا کی اصل عربی ہے، حضرت محمدؐ کے زمانے میں بھی اس کا رواج تھا مسلمانوں کی پوری تجارت کا یہی سرچشمہ تھا جس وقت کہ عیسائی تاجر قراض مضاربت کے ذریعے کاروباری مہم چلانا جانتے ہی نہ تھے، اس وقت مسلمانوں نے ایشیا و افریقہ کے بڑے بڑے علاقوں میں اس کو رواج دیا۔ بحیرۂ روم کے عیسائی ممالک خاص کر لاطینی مشرقی ممالک اور اسپین وغیرہ میں بھی اس کا رواج ہوا، پندرھویں صدی عیسوی میں یہ تجارتی کاروبار کرنے کا ایک عالمگیر طریقہ بن گیا خصوصاً سود کو ممنوع قرار دینے کی بنا پر فرانس کے بادشاہ لوئی دہم نے بھی اس کے متعلق قانون وضع کیے"[2]

موجودہ سرمایہ داری کے نظام میں نادار لوگوں کو صرف اجرت پر اداروں کے دست نگر بن کر ہی کام کرنا پڑتا ہے اور صرف چند ہی لوگ تاجر اور منتظم کاروبار بن سکتے ہیں، اجرت پر اداروں کے دست نگر کام کرتے کرتے حقیقت یہ ہے کہ مزدوروں سے آزادی کا جوہر فنا ہو جاتا ہے غرض قراض یا مضاربت کا موجودہ تمدن میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اولاد باوجود فراغت اور کام سیکھنے کے مواقع حاصل ہونے کے اس طرف توجہ نہیں کرتی جس کی وجہ سے کاروبار زیادہ تر ملازموں کے سپرد کر دیے جاتے ہیں یہ ملازمین، مالک کی تن آسانی اور ناواقفیت کے سبب سے کاروبار کے جزلاینفک بن جاتے ہیں ان کی اہمیت کے مدنظر ایک نوبت ایسی آتی ہے کہ مالک ان کو شریک بنا لینا مناسب سمجھتے ہیں چنانچہ قدیم ترین اور آسان ترین طریقہ کسی کاروبار کو عمدگی سے چلانے کا یہ ہے کہ اس کے چند قابل ملازموں کو اس کاروبار میں شریک کر لیا جائے (مارشل: پرنسپلز آف اکنامکس ص ۳۰۲)

[1] سر عبدالرحیم: اصول فقہ اسلام فصل ۱ صفحہ ۲ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ۔ [2] ارنسٹ نیس: ہسٹری آف اکنامکس صفحہ ۲۰۶۔

پتہ نہیں پس ایک غیر سرمایہ دار بجز مزدوری کے کچھ کاروبار نہیں کرسکتا۔

شرائط :۔ اب ذیل میں مضاربت کے شرائط درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) اصل دار جو سرمایہ فراہم کرتا ہے اس پر لازم ہے کہ اپنے سرمایے کو زر کی شکل میں متعین کر دے چنانچہ "تمام فقہا اس امر پر متفق ہیں کہ قراض درہم اور دینار ہی میں درست ہو سکتا ہے[1]۔ بالفاظ دیگر ہندوستانی زر کی اصطلاح میں روپیہ، اشرفی اور انگلستان کے زر کی اصطلاح میں پونڈ، شلنگ نیز اسی طرح ڈالر اور فرانک وغیرہ ہی میں قراض کا کاروبار جائز ہے۔

(۲) سامان (عروض، گڈس) سے قراض صحیح نہیں ہو سکتا "تمام شہروں کے فقہا کی رائے یہ ہے کہ قراض سامان (عروض) میں جائز نہیں ہے لیکن ابن ابی لیلیٰ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اگر اصل (راس المال) سامان کی شکل میں ہو تو دھوکا ہوگا اور اصل اور نفع نامعلوم رہے گا اس لیے اس کا جواز نہیں ہے ابن ابی لیلیٰ جو اس کے جواز کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو کپڑا فروخت کرنے کے لیے دیتا ہے کہ اس میں جو کچھ نفع ہوگا وہ دونوں کو ملے گا اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ پارچہ جس قیمت پر خرید اگیا تھا اس کو اصل مال قرار دیا جائے[2]۔"

مضارب (محنت کرنے والے کے) اختیارات

(۱) مضارب اپنی محنت اور کوشش کی وجہ سے نفع پانے کا مستحق ہوتا ہے۔

(۲) سرمایے کی نوعیت اس کے پاس امانت کے مماثل ہے اس لیے اگر سرمایہ ضائع ہو جائے تو اس صورت میں اس سے کوئی تاوان نہیں لیا جائے گا

(۳) اس کی حیثیت وکیل (ایجنٹ) کی بھی ہے اور اصل دار کی رضامندی سے

---

[1] بدایۃ المجتہد ج ۲ صفحہ ۱۹۷ کتاب القراض۔ [2] بدایۃ المجتہد ج ۲ صفحہ ۱۹۷ کتاب القراض

وہ اس مال میں تصرف کر سکتا ہے، اسے اشیاء کے خریدنے، فروخت کرنے، کسی اور کو وکیل بنانے اور نیز سامان کو دوسرے کے پاس ودیعت رکھوانے کا اختیار حاصل ہے۔

(۴) جب مال میں نفع ہو تو وہ اپنے کام کے معاوضے میں نفع میں شریک ہوتا ہے اگر بالغرض معاہدہ فاسد ہو جائے تو محنت کرنے والا (عامل) اجرت پانے کا مستحق ہوگا اور اگر وہ معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو غاصب سمجھا جائے گا کیونکہ اس نے دوسرے کے مال پر زیادتی کی[1]۔

(۵) "اپنے ہی شہر میں کاروبار کرنے کی صورت میں مضارب صرف منافع سے حصہ پائے گا لیکن اگر اس کو سفر کرنے کی ضرورت پڑے تو کھانے پینے کے اخراجات، لباس اور سواری کے اخراجات رواج کے موافق جو کہ اور دیگر تاجروں میں رائج ہے پانے کا مستحق ہوگا نیز وہ اپنے کپڑوں کی دھلوائی کے اخراجات، ملازم کی تنخواہ جو اس کی خدمت کرے اور سواری کے لیے چارے کے اخراجات پانے کا مستحق ہوگا" (اور موجودہ زمانے میں ریل، بس کے اخراجات یا پٹرول کے اخراجات حاصل کر سکے گا۔)

"امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ بیمار ہو جانے کی صورت میں وہ دوا کے اخراجات پانے کا مستحق ہوگا کیونکہ دوا سے بدن کی اصلاح ہوتی ہے اور صحت کے بغیر تجارتی کاروبار چل نہیں سکتے لہٰذا دوا کے اخراجات بھی اُسے ملنے چاہئیں[2]"۔

"امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر قراض کا مال بہت زیادہ ہو اور خرچ کا بار اٹھا سکتا ہو تو مقارض کو درست ہے کہ سفر کی حالت میں اپنا کھانا، کپڑا دستور کے موافق اس مال سے حاصل کرے یا قراض کے مال سے ہی کسی شخص کو اجرت پر نوکر رکھے جب کہ اکیلے اس سے محنت نہ ہو سکے، بعض کام تو ایسے ہوتے ہیں کہ خود اکیلا مقارض نہیں کر سکتا جیسے کہ قرض داروں سے تقاضا کرنا، اسباب باندھنا اور اس کو اٹھا کر لے چلنا البتہ جب مقارض اپنے ہی شہر میں رہے تو قراض کے مال سے کھانا، کپڑا نہ لے[3]"۔

---

[1] - نمبر ۱ تا ۴ ھدایہ ج ۳ کتاب المضاربۃ اور بدایۃ المجتہد ج ۲ کتاب القراض سے ماخوذ ہیں۔
[2] - ھدایہ ج ۳ کتاب المضاربۃ۔ [3] - امام مالکؒ: موطا کتاب القراض۔

غرض" قراض کے کاروبار کی انجام دہی کے لیے مقارض اُجرت پر مزدوروں کو رکھنے، قراض کا سامان رکھنے کے لیے کرایے پر مکانوں کو حاصل کرنے اسی طرح قراض کے سامان کی باربرداری کے لیے کرایے پر جانوروں کو حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے[1]

اصل دار کے اختیارات:۔ نفع کی تقسیم سرمایہ دار کی موجودگی میں ہوگی" تمام شہروں کے علماء کی یہی رائے ہے کہ محنت کرنے والا (عامل) اپنا حصہ اس وقت تک نہیں لے سکتا جب تک کہ سرمایہ دار موجود نہ ہو اور مال کی تقسیم کے وقت سرمایہ دار کا موجود رہنا ضروری ہے اور محنت کرنے والا اپنا حصہ لے لے گا[2]۔

اختلافات کا تصفیہ:۔ "امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر کوئی کسی کو بطور قراض کے رقم دے اور وہ اس سے مال و اسباب خرید لے پھر سرمایہ دار مال فروخت کر ڈالنے کے لیے کہے اور جس شخص نے رقم حاصل کی وہ کہے کہ میں ابھی مال فروخت کرنے کی کوئی وجہ نہیں پاتا، اس بناپر آپس میں اختلاف ہو جائے تو اس مال و اسباب کے بارے میں ان لوگوں سے رائے لی جائے گی جو اس پیشے میں مہارت اور سمجھ بوجھ رکھتے ہوں، اگر وہ ماہرین فروخت کرنے کا مشورہ دیں تو مال فروخت کر دیا جائے گا ورنہ انتظار کیا جائے گا[3]"

انفساخ کی صورتیں۔ (۱) "امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ قراض کے معاہدے کو ہر ایک فریق جب چاہے فسخ کر سکتا ہے[4]"۔ البتہ اس کی اطلاع فریق ثانی کو دینی ضروری ہے۔

(۲) کسی ایک فریق کے انتقال سے قراض کا معاہدہ خود بخود کالعدم قرار پاتا ہے کہ "اگر سرمایہ دار یا مضارب مرجائے تو مضاربت کالعدم قرار پاتی ہے کیونکہ مضاربت توکیل ہے جیسا کہ سابق میں بیان ہوا اور جس طرح موکل کی موت سے

---

[1] امام مالکؒ المدونۃ الکبریٰ ج ۴ صفحہ ۵ کتاب القراض۔
[2] بدایۃ المجتہد ج ۲ صفحہ ۲۰۱ کتاب القراض۔ [3] امام مالکؒ: موطا، کتاب القراض
[4] بدایۃ المجتہد ج ۲ صفحہ ۲۰۰ کتاب القراض۔

وکالت باطل ہو جاتی ہے اسی طرح وکیل کی موت سے بھی وکالت باطل ہو جاتی ہے اور وکالت ایسی شئے نہیں جو کہ موروثی ہوتی ہے[۱] البتہ متوفی کے ورثا اگر چاہیں تو معاہدے کی از سرِ نو تجدید کر سکتے ہیں[۲]

یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب معاملہ میں دو ہی آدمی شریک ہوں لیکن مضارب نے اگر ایک سے زیادہ آدمیوں کا سرمایہ حاصل کیا ہے، یا شرکت میں ایک سے زیادہ آدمی ہوں تو معاہدہ صرف ایک شریک کی حد تک ختم ہو جائے گا اوروں کا باقی رہے گا۔

(۳) **کمیشن کا کاروبار**:- کمیشن لے کر کاروبار کرنے کی بھی اسلامی معاشیات نے اجازت دی ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس میں کچھ حرج نہیں کہ کسی کمیشن ایجنٹ (سمسار) سے کہے کہ یہ کپڑا فروخت کردو، اور میری مقررہ قیمت پر جس قدر زیادہ ملے وہ تمہارا ہے[۳]

(۴) **شرکت**[۴]:- شغل اصل کا ایک اور طریقہ جو قدیم زمانہ سے رائج ہے وہ شرکت کا کاروبار ہے یہ کسی بڑی تجارتی یا صنعتی مہم کو انجام دینا ایک فرد سے ممکن نہیں، اس لیے چند افراد مشترکہ سرمایہ اور محنت کے ساتھ اس مہم کو پورا کرنے کا ارادہ کرتے ہیں مثلاً دو برابر دولت والے کسی بڑے کاروبار کے لیے شریک ہو جائیں[۵]

شرکت کے کاروبار میں دو یا دو سے زیادہ اشخاص مل کر سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور نفع و نقصان میں شریک ہوتے ہیں یہ دنیا کے اور حصوں کی طرح شغل اصل کا یہ طریقہ اسلام سے پہلے عرب کے قدیم معاشی نظام میں بھی جاری تھا اور اسلام کے معاشی نظام میں بھی اس کو برقرار رکھا گیا[۶] شرکت کے ذریعے کاروبار اسلام میں

۱۔ ہدایہ ج ۳ کتاب المضاربۃ۔

۲۔ قراض کی تفصیل کے لیے موطا امام مالک کتاب القراض، کتاب الأم امام شافعیؒ، مبسوط السرخسی کتاب المضاربۃ ج ۲۲ ، نیز بدایۃ المجتہد کتاب القراض اور ہدایہ کتاب المضاربۃ ملاحظہ فرمایئے۔

۳۔ بخاری کتاب الاجارہ، سمسار کی اجرت۔

۴۔ اسلامی قانون کی اصطلاح میں شرکت کو شرکتُ العقود (پارٹنرشپ آف کنٹراکٹ) کہتے ہیں، یعنی ایسی شرکت جو معاہدے کے ذریعے عمل میں آئی ہو۔ ۵۔ مارشل پرنسپلز آف اکنامکس ص ۳۰۱

جائز ہے کیونکہ جس وقت آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تو لوگوں میں شرکت کا معاملہ جاری تھا پس آپؐ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا[۱] اور رسول اکرمؐ کے بعد سے لے کر آج تک لوگ شرکت کے ذریعے کاروبار کرتے آئے ہیں[۲]

اسلامی نظام معیشت میں مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں اور شراکتوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شراکتی کاروبار عام طور پر بہت مقبول تھے، یہاں تک کہ زراعت میں بھی شراکت کا رواج تھا رسول کریمؐ نے شراکت ہی کے ذریعے بے روزگار مہاجرین کو کاروبار سے لگایا تھا چنانچہ "انصار نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ہمارے اور ہمارے بھائیوں (مہاجرین) کے درمیان باغ تقسیم فرما دیجئے آپؐ نے فرمایا نہیں۔ انصار نے مہاجرین سے کہا تم محنت اپنے ذمے لے لو، اور ہم میوے میں شریک کرلیں گے، انھوں نے کہا ہاں ہم نے اس کو مانا[۳]

فقہی اصطلاح میں اگر شرکت زراعت سے متعلق ہو تو اسے مزارعۃ اور درختوں یا گلاب وغیرہ کی کیاریوں سے متعلق ہو تو اسے مساقات کہتے ہیں[۴]۔

"تمام علمائے اسلام ایسی شرکت کے جواز کے قائل ہیں جس میں ہر ایک شریک دوسرے شریک ہی کی طرح اس قسم کا مال یعنے درہم و دینار کاروبار میں لگا دیتا ہے اور انھیں اسی طرح خلط ملط کر دیتا ہے کہ وہ مل کر ایک ہی مال بن جاتے ہیں اور تمیز باقی نہیں رہتی کہ کس کا مال فروخت ہوا، اور کس کے مال سے تجارت کا سامان خرید اگیا اگر نفع ہوتا ہے تو سب کو نفع میں حصہ رسدی ملتا ہے اور نقصان ہو تو سب کا حصہ ہوتا ہے[۵]"

۱۔ ھدایہ ج ۲ کتاب الشرکتہ۔ ۲۔ مبسوط السرخسی ج ۱۱ کتاب الشرکتہ ص۱۰۱

۳۔ بخاری ج۱ کتاب الشروط۔

۴۔ ہر ایک فقہ اور حدیث کی کتاب میں قراض اور شرکت کے مثل مزارعۃ اور مساقاۃ سے متعلق بھی علیحدہ ابواب پائے جاتے ہیں۔

۵۔ بدایۃ المجتہد ج ۲ ص۲۱۴ کتاب الشرکۃ۔

شرائط:۔ الف۔ شرکت ایک معاہدہ ہے، اس کے لیے ایجاب قبول لازمی ہے۔[1]

(ب) "معاہدہ شرکت درہم، دینار اور رائج الوقت پیسوں سے منعقد ہوتا ہے۔"[2] لیکن امام ابو حنیفہؒ اور قاضی ابو یوسفؒ کی یہ رائے ہے کہ صرف دینار (سونے کے سکے) اور درہم (چاندی کے سکے) سے ہی شرکت کا معاہدہ ہو سکتا ہے اور (تانبے کا پیسہ) فلوس سے نہیں ہوتا کیونکہ "ان کی قیمت گھڑی گھڑی بدلتی رہتی ہے اور ان کی نوعیت مثل دوسرے سامان کے ہو جاتی ہے۔"[3]

اگر مال اشیاء کی شراکت کی شکل میں ہو تو شراکت کا کاروبار شروع کرنے سے پہلے اس کی قیمت کا تعین زر کی شکل میں ہونا ضروری ہے، یا ایک شریک اپنا نصف مال دوسرے کے نصف مال سے تبادلہ کرلے، اور اس طرح سامان ہی کو سرمایہ قرار دیا جائے تو اس میں عذر باقی نہیں رہتا اور نہ مالیت کے متعلق جھگڑا ہو سکتا ہے جیسا کہ سرخسی کاسانی وغیرہ نے لکھا ہے۔

(ج) امام شافعیؒ نے شراکت کے لیے ایک اور شرط بڑھائی ہے، چنانچہ "امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جب تک مال خلط ملط نہ ہو جائے اور ایک شریک کے مال اور دوسرے شریک کے مال میں امتیاز نہ رہے شرکت صحیح نہیں ہوتی۔"[4] چنانچہ انھوں نے شرکت کے لیے سرمایے کو ضروری قرار دیا ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ شرکت کے کاروبار کے لیے سرمایہ ضروری نہیں ہے، اور شراکت کے کاروبار بغیر سرمایہ کے صرف ساکھ اور وجاہت (اعتبار) سے ہو سکتے ہیں۔

شمس الائمہ سرخسی شراکت کے معاہدے کے لیے دستاویز کا لکھا جانا ضروری قرار دیتے ہیں "شرکت ایسا معاہدہ ہے، جو ایک مدت تک جاری رہتا ہے، لہٰذا اس کے لیے دستاویز کا لکھا جانا ضروری ہے تاکہ اگر کبھی جھگڑا ہو تو اس کے ذریعے سے فیصلہ کیا جا سکے خدائے تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۔	مسلمانو! جب تم ایک مدت کے لیے قرض لو تو اس کو لکھ لیا کرو۔

پ ۳ بقرہ ع ۳۹

---

[1] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ۔ [2] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ۔ [3] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ [4] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۱۱ کتاب الشرکۃ۔

"نیز دستاویز کا مقصد توثیق اور احتیاط ہے پس اس کے لیے لازمی ہے کہ دستاویز لکھی جائے تاکہ ہر ایک کے لعن طعن سے بچے رہیں۔" انھوں نے اس خاص معاملے میں دستاویز کا فارم بھی بتا دیا ہے کہ فارم اس طرح لکھا جائے۔

هٰذَا مَا اشْتَرَاكَ عَلَيْهِ فُلَانٌ وَفُلَانٌ — یہ وہ (دستاویز) ہے جس میں فلاں فلاں نے اشتراک کیا ہے۔

بعض اصحاب الشروط نے اس پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ

هٰذَا إِشَارَةٌ إِلَى الصَّكِّ — اس سے تو چک کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

پس احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو یوں لکھا جائے کہ

هٰذَا الْكِتَابُ فِيهِ ذِكْرُ مَا اشْتَرَكَ فُلَانٌ فُلَانٌ — یہ وہ دستاویز ہے جس میں فلاں فلاں شخص نے جو اشتراک کیا ہے اس کا تذکرہ ہے۔

"اور یوں جب کبھی رسول اکرمؐ نے کوئی غلام خریدا تو آپؐ نے اس کے لکھنے کا حکم دیا چنانچہ ایک مرتبہ یوں لکھا گیا کہ" یہ وہ دستاویز ہے جس میں محمدؐ اللہ کے رسول نے عداد بن خالد بن ہوذہ یہودی سے جو غلام خریدا اس کا تذکرہ ہے اسی طرح رسول اکرمؐ نے حدیبیہ کے دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو صلح نامہ لکھنے کا حکم دیا کہ

هٰذَا مَا اصْطَلَحَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَسُهَيْلُ بْنُ عَمْرٍو عَلٰى أَهْلِ مَكَّةَ — یہ وہ صلح نامہ ہے جو محمدؐ بن عبد اللہ اور سہیل بن عمر کے درمیان مکہ والوں کے لیے ہوا

اور یہ شرکت کا معاہدہ تو امانت کا معاہدہ ہے اور اس کا مقصد نفع کمانا ہوتا ہے "پھر اس دستاویز میں ہر ایک کے سرمایے کی مقدار واضح کی جائے کیونکہ منافع کی تقسیم کے وقت ہر ایک کے سرمایے کی مقدار کا معلوم ہونا ضروری ہے" تاکہ اس سے نفع کی مقدار معلوم ہوسکے اس لیے اس کا شرکت کی دستاویز میں لکھا جانا ضروری ہے کہ جھگڑے کے وقت اس کی طرف رجوع کیا جاسکے اس دستاویز میں یہ بھی لکھے کہ

وَذٰلِكَ كُلُّهُ فِي أَيْدِيهِمَا — اور یہ (سرمایہ) ان کے ہاتھ میں (نقد) موجود ہے

اور اس طرح لکھنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ سرمایہ غائب نہیں ہے اور نہ قرض ہے بلکہ وہ زر ہے جو ان کے ہاتھ میں موجود ہے، پھر اس شرکت کی

دستاویز میں ہر ایک کو ان کی مقدار سرمایہ کے موافق جو نفع ملے گا اس کا تذکرہ کیا جائے،
نیز یہ بھی لکھا جائے کہ انھوں نے فلاں مہینے اور فلاں سال میں اشتراک کیا اور تاریخ کا
تعین ہو جانے سے جھگڑے ہونے نہیں پاتے، اور ان میں سے کوئی ایک اس بات کا
دعوی نہیں کر سکتا کہ اس تاریخ سے پہلے اس نے مال خریدا اور اس میں اس کا حق ہے[1]

شرکت کے اقسام:- بلحاظ نوعیت اور سرمایہ فقہاء اسلام نے شرکت کی چار قسمیں قرار دی ہیں:-

(۱) شرکت المفاوضہ (۲) شرکت العنان
(۳) شرکت الصنائع (۴) شرکت الوجوہ

ان سب کی وضاحت سے پہلے یہ معلوم کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اجتماعی کاروبار یا چند آدمیوں کے مل کر کاروبار کرنے کی حالت میں ظاہر ہے کہ یہی چند احتمالات ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس کچھ سرمایہ ہے یا کسی کے پاس کچھ نہیں ہے، یا بعضوں کے پاس ہے بعضوں کے پاس نہیں۔ پہلی صورت یعنی اگر ہر ایک شریک کاروبار میں سرمایہ اگر لگا سکتا ہے تو یہی دیکھنا چاہیے کہ سب افراد برابر لگا سکتے ہیں یا کسی شخص میں کم یا کسی شخص میں زیادہ سرمایہ لگانے کی صلاحیت ہے عقلاً یہی صورتیں ممکن ہیں اور اسلامی معاشیات نے اجتماعی کاروبار میں اس سے استفادہ کی راہیں کھول دی ہیں۔

اگر شرکاء برابر سرمایہ لگا کر کاروبار کریں تو اس کا نام شرکت مفاوضہ ہے
اگر کاروبار میں کسی شریک کا کم اور کسی شریک کا زیادہ سرمایہ ہو تو وہ شرکت عنان ہے اس صورت میں نہ سب کے سرمایہ کا برابر ہونا ضروری ہے اور نہ نفع کا۔

اسی طرح اگر کسی شریک کے پاس سرمایہ نہیں ہے تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ کسی قسم کے ہنر و دستکاری یا صنعت وغیرہ سے واقف ہے یا نہیں اگر ہنرمندوں اور دستکاروں کا گروہ ہے جو مل کر کاروبار کو اس طرح چلانا چاہتے ہیں کہ لوگوں سے

---

[1] مبسوط السرخسی ج ۲ صفحہ ۱۵۶ کتاب الشرکۃ

اپنے متعلقہ پیشے کے سلسلے میں کام لیا کریں، اور جو نفع ہو وہ باہم تقسیم کر لیں مثلاً دھوبیوں کا کوئی گروہ چاہے تو واشنگ کمپنی بنا کر دھونے کے لیے لوگوں سے کپڑے لے سکتا ہے اور کمپنی کا جو نفع ہوگا وہ باہم تقسیم ہوتا رہے گا اسی کا اصطلاحی نام شرکت تقبل و شرکت صنائع ہے امام ابو حنیفہ کے نزدیک تو اس میں اتنی وسعت ہے کہ دو مختلف پیشے یا ہنر والے جیسے درزی اور رنگریز چاہیں تو مل کر شرکت کا معاملہ کر سکتے ہیں یعنی جسے جو کام آتا ہے وہ انجام دے گا اور کمپنی کو جو نفع ہوگا بانٹا جائے گا۔

اگر شرکت قایم کرنے والوں کے پاس نہ سرمایہ ہی ہو اور نہ وہ کسی قسم کے ہنر سے واقف ہوں تو اپنی ساکھ یعنی وجاہت اور امانت کا اعتماد دلا کر لوگوں سے چیزیں لے کر اجتماعی طور پر کاروبار کر سکتے ہیں اور کاروبار کے اس طریقے سے جو نفع ہو بانٹ سکتے ہیں اور اسی کا نام شرکت الوجوہ ہے۔

ذیل میں مختصر طور پر الگ الگ ہر ایک کی خصوصیتیں بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) **شرکت المفاوضہ**:۔ "شرکت المفاوضہ اس قسم کی شراکت کو کہتے ہیں کہ جس میں ہر شریک کا سرمایہ لازمی طور پر برابر ہوتا ہے خود عربی زبان میں مفاوضہ کے معنی مساوات یا باہمی تفویض کے ہیں[1]"

"شرکت المفاوضہ کی صورت یہ ہے کہ دو اشخاص نہ صرف سرمایہ لگانے میں باہم شرکت کریں بلکہ تصرف کرنے اور قرض کی ادائی میں بھی دونوں برابر کے شریک ہوں چونکہ یہ شرکت تمام تجارتوں میں عام طور پر رائج ہے اس طرح دونوں میں سے ہر ایک شریک امر شرکت کو اپنے ساتھی کی جانب سے علی الاطلاق تفویض کرتا ہے[2]"

شرائط شرکت المفاوضہ:۔ (۱) "شرکت مفاوضہ جب عمل میں آئے تو لفظ "مفاوضہ" کہنا لازمی ہے، کیونکہ عام لوگ اس کی شرطوں سے لاعلم ہوتے ہیں[3]"

(۲) اس شرکت میں شرکا کی حیثیت مساوی ہونی چاہئے "معاہدہ مفاوضہ دو ایسے اشخاص میں جائز قرار دیا گیا ہے، جب کہ دونوں شریک بالغ ہوں،

---

[1] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

[2] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

[3] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

آزاد ہوں، اور مسلمان ہوں[1]" اسی وجہ سے "آزاد اور غلام میں شرکت مفاوضہ جائز قرار نہیں پاتی اسی طرح بچہ اور جوان میں بھی جائز نہ ہوگی، کیونکہ دونوں میں مساوات اہلیت موجود نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر آزاد اور بالغ شخص کو اپنے مال میں تصرف کرنے کا اختیار ہوتا ہے، اور غلام کو ان دونوں میں سے کوئی اختیار نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا آقا اجازت نہ دے اسی طرح بچے کو بھی ان ان امور میں سے کسی پر اختیار نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا ولی اجازت نہ دے[2]"

یہ بات واضح کردینی مناسب ہے کہ صاحب ہدایہ کی جو عبارت نقل کی گئی ہے اس سے یہ خیال پیدا نہ ہوجائے کہ صرف دو اشخاص ہی اس معاملے کو انجام دے سکتے ہیں یہ تو انھوں نے مثال کے طور پر واضح کیا ہے، ورنہ دو بلکہ دو سے زیادہ اشخاص بھی اس قسم کا معاہدہ اور معاملہ عمل میں لاسکتے ہیں۔

اختیارات اور ذمہ داریاں:۔ اس معاہدے کی رو سے ہر شریک اپنے ساتھی کا وکیل ہوتا ہے، اس لیے "ہر شریک دوسرے کی جانب سے مال کو فروخت کرنے، خریدنے، قرض دینے اور امانت (ودیعت) رکھوانے کا حق رکھتا ہے، جب کہ ایسا کیا جانا ضروری ہو، لیکن شرکت کے مال سے وہ کسی اور شخص کو ہبہ نہیں کرسکتا[3]" "اگر ایک شریک نے اپنے ساتھی شریک سے کہا کہ وہ (مال فروخت کرنے کے لیے) نیشاپور جائے، اور وہ اس سے اگلے مقام کو گیا اور مال تباہ ہوگیا تو شریک کو تاوان ادا کرنا پڑے گا[4]" غرض شرکت مفاوضہ میں "ہر ایک شریک تصرف کرنے میں اپنے دوسرے ساتھی کا قائم مقام ہوتا ہے، اور اگر ان میں سے کوئی ایک مال خریدے تو سمجھا جائے گا کہ دونوں کی جانب سے خریدا گیا الا یہ کہ انھوں نے شرکت کی دستاویز میں کوئی بات مستثنیٰ کرلی ہو[5]" شرکت مفاوضہ میں گو شرکاء کی حیثیت اور اہلیت میں بھی مساوات کی شرط لازم ہے، لیکن اصلی اور خاص خصوصیت صاحب ہدایہ کے الفاظ میں

۱۔ ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ۔ ۲۔ ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

۳۔ بدایۃ المجتہد ج ۲ صفحہ ۲۱۴ کتاب الشرکۃ ۴۔ فتاویٰ قاضی خاں ج ۳ صفحہ ۲۴۴ کتاب الشرکۃ مطبوعہ مصر۔

۵۔ ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

یہ ہے کہ

فَلَابُدَّ مِنْ تَحَقُّقِ الْمُسَاوَاةِ ابْتِدَاءً وَانْتِهَاءً وَذَالِكَ فِي الْمَالِ (یعنی راس المال)[۱] — مال یعنی راس المال (سرمایہ) میں ابتداء تا انتہا مساوات کا ہونا ضروری ہے۔

(۲) **شرکت العنان**:۔ شرکت کے کاروبار کی ایک دوسری قسم شرکت العنان ہے اگر شرکاء سرمایہ یا نفع میں برابر نہ ہوں تو اس کو شرکت العنان سے موسوم کیا جاتا ہے اسلام سے پہلے بھی عرب میں شرکت العنان کا رواج تھا چنانچہ جاہلی عرب کے قدیم اشعار میں بھی شرکت العنان کا تذکرہ پایا جاتا ہے[۲]۔

شرائط شرکت العنان (۱) پہلی شرط یہ ہے کہ "اس شرط میں ہر شریک کا سرمایہ مساوی ہونا ضروری نہیں ہے[۳]۔ مثلاً ایک شریک دس ہزار روپے اور دوسرا شریک پانچ ہزار روپے لگا سکتا ہے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ "شرکاء کا سرمایہ مشغولہ برابر ہو لیکن نفع میں ایک شریک کا حصہ زیادہ رہے[۴]۔ مثلاً ایک شریک دو تہائی نفع لے تو دوسرا شریک صرف ایک تہائی لے" نفع کا استحقاق جیسے مال سے ہوتا ہے ویسے ہی محنت (عمل) سے بھی ہوتا ہے جیسے کہ مضاربت میں ہوتا ہے جہاں کہ سرمایہ دار اپنے سرمایے کی وجہ سے نفع پاتا ہے اور مضارب اپنی محنت (عمل) کی وجہ سے نفع حاصل کرتا ہے۔ کبھی دونوں میں سے ایک شریک کو کاروبار کا ڈھنگ زیادہ اور کام زیادہ آتا ہے اور اپنے شریک کار سے زیادہ قوی ہوتا ہے تو ایسا شخص مساوی نفع پر راضی نہ ہوگا اس ضرورت کی وجہ سے کم وبیش نفع جائز ہے۔ برخلاف اس کے کل نفع ایک کے واسطے ہو تو شرکت کا معاہدہ باقی نہیں رہتا نہ مضاربت بلکہ قرضہ ہو جاتا ہے[۵]۔

---

[۱] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

[۲] النابغۃ الجعدی کہتا ہے کہ ؎

وَشَارَكْنَا قُرَيْشًا فِي تُقَاهَا ✤ وَفِي أَحْسَابِهَا شِرْكَ الْعِنَانِ

[۳] فتاویٰ قاضی خاں ج ۳ صفحہ ۶۴ کتاب الشرکۃ، مطبوعہ مصر۔

[۴] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ۔

[۵] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ چونکہ شرکت العنان میں مساوات لازمی نہیں ہے اس لیے "ایسی شرکت مردوں اور عورتوں جوانوں اور بچوں کے درمیان — جن کو ان کے سرپرست نے اجازت دی ہو — اسی طرح آزاد اور غلام کے درمیان — جس کو کہ اس کے آقا نے اجازت دی ہو — جائز قرار دی گئی ہے، اسی طرح مسلمان اور کافر کے درمیان بھی جائز ہے"[۱]

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ "شرکت العنان میں ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے لیکن کفیل نہیں ہوتا"[۲] نیز "کسی شریک کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ مشترکہ مال میں سے کسی کو قرض دے، اور اگر کسی شریک نے شرکت کے سامان کو رہن کرایا کہ اس کا قرض دونوں پر عائد ہو تو یہ جائز نہیں ہے"[۳]

(۳) شرکت الصنائع یا شرکت الابدان: شرکت کی ایک قسم شرکت الصنائع ہے۔ صناع، کاریگر اور دوسرے جسمانی محنت کرنے والے مزدور بھی اگر عمل پیدائش کو انجام دینے کی غرض سے اتحاد قائم کریں، تو اس کو شرکت الصنائع کہتے ہیں۔

"شرکت الصنائع کو شرکت التقبل بھی کہتے ہیں یعنی کام قبول کرنا جیسے کہ دو (صناعوں) مثلاً دو درزیوں یا دو رنگریزوں نے اس شرط پر باہم شرکت کی کہ وہ لوگوں کے کام (آڈر) قبول کریں گے اور اس سے جو کچھ آمدنی ہو گی، وہ دونوں کے لیے مشترکہ ہو گی"[۴]

شرکت الصنائع کے بارے میں فقہا کی اختلافی رائے

شرکت الصنائع کے کاروبار کو اکثر حنفی فقہائے نے جائز قرار دیا ہے لیکن "امام زفر اور امام شافعیؒ نے اس کو جائز قرار نہیں دیا، کیونکہ یہ ایسی شرکت ہے جس سے شرکت کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا یعنے نفع سے مال بڑھانا یہ بات اس سے حاصل نہیں ہوتی کیونکہ نفع کے واسطے مال

۱۔ فتاوی قاضی خاں ج ۳ صفحہ ۶۲۰ کتاب الشرکۃ مطبوعہ مصر۔
۲۔ ھدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ۔
۳۔ فتاوی قاضی خاں ج ۳ صفحہ ۶۲۲ کتاب الشرکۃ۔ ۴۔ ھدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

ضروری ہے[1] بالفاظ دیگر امام شافعیؒ اور زفرؒ نے مزید دولت پیدا کرنے کے لیے محنت کے ساتھ اصل کو ضروری قرار دیا ہے۔

حنفی فقہاء کی "دلیل یہ ہے کہ شرکت کے معاہدے سے مقصود مال (دولت) حاصل کرنا ہوتا ہے، اور یہ وکیل ہونے سے ممکن ہے کیونکہ ہر ایک شریک جب دوسرے کی طرف سے نصف میں وکیل ہوا تو نصف میں اصیل ہوا، پس جو مال حاصل ہوا، اس میں شرکت ثابت ہوئی ہے[2] "عبداللہ بن مسعودؓ نے سعدؓ کے ساتھ جنگ بدر میں شرکت کا معاہدہ کیا اور سعدؓ کو دو قیدی ہاتھ آئے، اور ابن مسعود کو کچھ بھی ہاتھ نہ آیا، اور رسول اللہؐ نے اس کا انکار بھی نہیں فرمایا[3] دوسرے لفظوں میں اگر اس قسم کی شرکت ناجائز ہوتی تو رسول اکرمؐ اس سے منع فرما دیتے۔"

شمس الائمہ سرخسی نے کاریگروں کی صنعت کو سرمایہ سے تعبیر کیا ہے۔

وَتُسَمّٰى بِشَرِكَةِ الصَّنَائِعِ لِأَنَّ رَأْسَ مَالِهِمَا صَنْعَتُهُمَا[4]	اور اس کو شرکت الصنائع کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں راس المال (اصل) ان کی صنعت ہے

شرائط:۔ منافع سے شرکاء برابر برابر کا حصہ لیں تو بھی شرکت الصنائع جائز ہے اسی طرح اگر ایک شریک زیادہ اور دوسرا شریک کم حصہ مقرر کرے تو بھی جائز ہے مثلاً ایک معمولی سی مثال پیش کی جاتی ہے۔ دو مزدور معاہدہ شرکت الصنائع کرتے ہیں اور لکڑی توڑنے یا پتھر پھوڑنے کا ٹھیکہ قبول کرتے ہیں اب فرض کیجئے کہ ان میں سے ایک تو نوجوان قوی ہیکل ہے اور دوسرا سن رسیدہ اور کمزور چونکہ نوجوان لکڑہارے کی کارکردگی اپنے ساتھی کے مقابلے میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس لیے وہ زیادہ منافع حاصل کرتا ہے نوجوان دو روپے لیتا ہے اور عمر رسیدہ صرف ایک روپیہ غرض فقہائے اسلام نے کام کی مقدار کے لحاظ سے معاوضہ پانے کو جائز قرار دیا ہے چنانچہ صاحب الہدایہ لکھتے ہیں کہ "اگر دو اشخاص کام کریں اور جو کچھ حاصل ہو اس میں سے دو تہائی ایک کے

۱۔ ھدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ۔ ۲۔ ھدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

۳۔ بدایۃ المجتہد ج ۲ صفحہ ۱۱۳ شرکۃ الابدان نیز ابوداؤد کتاب البیوع، باب فی شرکۃ

۴۔ مبسوط السرخسی ج ۱۱ صفحہ ۱۵۲ کتاب الشرکۃ

واسطے اور ایک تہائی دوسرے کے واسطے ہو تو جائز ہے...... کیونکہ یہاں سرمایہ (راس المال) کام (محنت) کو قرار دیا گیا ہے اور نفع میں سے جو کچھ اس نے لیا وہ اپنے کام و محنت کا معاوضہ لیا اور ہر ایک کام کی قیمت لگائی جا سکتی ہے اور باہمی رضامندی سے اس کی جو قیمت لگائی جائے وہی اس کی قیمت قرار پائے گی اور وہ کمی وبیشی سے حرام نہ ہو گی[1]

(۴) شرکت الوجوہ[2] "شرکت کے کاروبار کی ایک اور قسم شرکت الوجوہ بھی ہے اگر دو اشخاص بغیر کسی سرمائے کے یہ معاہدہ کریں کہ دونوں اپنی وجاہت (ساکھ، اعتبار) و امانت کی وجہ سے خرید و فروخت کریں گے اور نفع نقصان میں شریک رہیں گے تو اس قسم کے معاہدے کو شرکت الوجوہ کہتے ہیں۔ اس قسم کی شرکت کا نام شرکت وجوہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ، لوگوں سے ادھار مال وہی خرید سکتا ہے جس کی لوگوں میں وجاہت (ساکھ، اعتبار) ہو[3]" موجودہ زمانے میں قرضہ اور اعتبار کا انحصار زیادہ تر قرض لینے والوں کی شخصیت اور کاروبار کی شہرت اور نیک نامی پر مبنی ہوتا ہے[4]"

غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ مسلم فقہاء نے جس طرح شرکت الصنائع میں صنعت کو سرمایۂ دولت قرار دیا تھا، اسی طرح وجاہت (ساکھ) اور اعتبار کو بھی وہ دولت ہی کی ایک شکل قرار دیتے ہیں اور گویا اس قسم کی شرکت میں وجاہت اور امانت کو سرمایہ قرار دیا گیا ہے جس کے ذریعے وہ مزید دولت پیدا کرتے ہیں۔

"شرکت الوجوہ میں ہر شریک کو مساوی مساوی منافع ملے گا اور اس میں کمی بیشی جائز نہیں ہے[5]"

شرکت شراکت کا بیان ختم کرنے سے پیشتر یہ بات باعث دلچسپی ہو گی کہ امام مالکؒ اور ان کے شاگردنے مدونہ نامی فقہ کی مستند کتاب میں شراکتی کاروبار کی

---

[1] - ھدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ۔

[2] - شرکت الوجوہ کو شرکت الضمان اور شرکت المفالیس بھی کہتے ہیں اور مفالیس اس وجہ سے کہ مفلس نادار بغیر سرمایہ کے کاروبار چالو کرتے ہیں۔

[3] - ھدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

[4] - طاسگ پرنسلز آف اکنامکس جلد ا باب ۶

[5] - ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

بہت سی مثالیں بیان کی ہیں ان میں سے چند اہم شراکتوں کا تذکرہ یہاں بے جا نہ ہوگا۔

طبی شراکت:۔ دو یا دو سے زائد ڈاکٹر مل کر مشترکہ طور پر علاج معالجے کے لیے دواخانے (ہسپتال) قایم کر سکتے ہیں نیز مشترکہ سرمایہ سے ادویات خرید کر ہسپتال چلا سکتے ہیں۔ اور اخراجات کی منہائی کے بعد جو خالص آمدنی ہو اس کو آپس میں علی السویہ یا حسب معاہدہ تقسیم کر سکتے ہیں۔[1]

تعلیمی شراکت:۔ طبی شراکت کی طرح دو یا دو سے زاید اساتذہ مل کر بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مشترکہ تعلیمی ادارے ٹیوٹوریل اسکول کھول کر آمدنی کما سکتے ہیں۔[2]

زرعی شراکت یا مشترکہ کاشت:۔ اوپر شرکت کے بیان میں مزارعت کا تذکرہ ہوا ہے، مزارعت میں ایک شخص زمین مہیا کرتا ہے اور دوسرا محنت کرتا ہے اور کھیت کی پیداوار میں دونوں شریک رہتے ہیں۔ لیکن آج کل روسی طریقے کی "اجتماعی کاشت" اور ڈنمارک وغیرہ میں مروجہ "اتحادی کاشت" کا بہت چرچا ہے۔ ظاہر ہے کہ امداد باہمی اور شرکت و تعاون کی بنا پر "اجتماعی کاشت" کے اصول پر اسلامی معاشیات کو کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا بشرطیکہ مملکت کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ اس طریقہ کاشت سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی ضمانت ہو کہ کسانوں اور کھیتوں پر کام کرنے والے زرعی مزدوروں کے حقوق کا پورا تحفظ ہوگا۔

غرض امداد باہمی کے اصول پر زرعی شراکت قائم کی جا کر سائنٹفک طریقے پر زراعت کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ قبل ازیں بتایا جا چکا کہ عہد رسالت ؐ اور عہد خلافت راشدہ میں شراکتی کاروبار کافی مقبول تھے حتیٰ کہ زراعت میں بھی ان کا رواج تھا۔ امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ مشترکہ سرمایہ سے مویشی، آلات زراعت

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو المدونۃ الکبریٰ للامام مالک بن انسؒ ج ۴ صفحہ ۲۶ شرکۃ الاطباء والمعلمین مطبع خیریہ مصر۔

[2] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو المدونۃ الکبریٰ للامام مالک بن انسؒ ج ۴ صفحہ ۲۶ شرکۃ الاطباء والمعلمین مطبع خیریہ مصر۔

اور بیج وغیرہ خرید کر مشترکہ عمل سے زراعت کریں تو جائز ہے۔[1]

معدنی شراکت:۔ کان سے معدنی دولت حاصل کرنے کے لیے بھی شراکتی کمپنی قائم کی جاسکتی ہے۔[2]

کانیں قوم کی مشترکہ ملک شمار ہوتی ہیں اس لیے اس کی مزید تفصیل تقسیم دولت کے باب ۴ میں اور نیز مالیات کے باب ۵ میں بیان کی گئی ہے۔

شراکت حمل ونقل (ٹرانسپورٹ کمپنی):۔ دو یا دو سے زائد اشخاص ملکر حمل ونقل اور باربرداری کے کام کے لیے تجارتی اصول پر حمل ونقل کی شراکت (ٹرانسپورٹ کمپنی) قائم کر سکتے ہیں۔[3] کتاب مدونہ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ مشترکہ سرمایہ سے یا ہر شریک اپنی طرف سے جانور فراہم کرتا اور کمپنی بنا کر بری حمل ونقل کے لیے شراکت قائم کرتا۔ بحری جہازرانی کی کمپنیاں تو عرصے سے چلی آرہی ہیں اب ہوائی جہاز کی کمپنیاں بھی قائم ہونے لگی ہیں۔ مشترکہ مفاد کی خاطر حمل ونقل کے ذرائع کو اسلامی حکومت اپنے ہاتھ میں بھی لے سکتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تمام شرکاء کا ایک ہی شہر کے باشندے ہونا لازمی نہیں ہے۔ کتاب مدونہ میں بتایا گیا ہے کہ مختلف شہروں کے باشندے ملکر کثیر سرمایے سے شراکتی کاروبار کر سکتے ہیں۔[4]

انفساخ شرکت:۔ ذیل کی صورتوں میں ہر قسم کی شراکت کے کاروبار منسوخ قرار پائیں گے۔

(۱) جب کہ کوئی شریک معاہدے کو فسخ کرنے کا اختیار کام میں لاتا ہے۔ واضح ہو کہ ہر ایک شریک کو معاہدۂ شرکت فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے لیکن جب ایک شریک معاہدہ فسخ کرے تو اس وقت تک انفساخ جاری نہ ہوگا

۱۔ المدونۃ الکبریٰ ج ۴ صفحہ ۲۹ الشرکۃ فی الزرع۔

۲۔ المدونۃ الکبریٰ ج ۴ صفحہ ۲۸ الشرکۃ فی حفر القبور والمعادن

۳۔ المدونۃ الکبریٰ ج ۴ صفحہ ۲۷ الشرکۃ الحمالین علی رؤسہما او دوابہما

۴۔ المدونۃ الکبریٰ ج ۴ صفحہ ۳۷ فی الشرکین فی البلدین

جب تک کہ دوسرے شریک کو اس کی اطلاع نہ ہو جائے[1]

(۲) جب کہ کوئی شریک مر جائے چونکہ شرکت کے معاہدے میں ہر شریک دوسرے کی جانب سے نمائندگی (وکالت) کرتا ہے اس لیے موت نمائندگی کو باطل کر دیتی ہے۔

فَاذَا بَطَلَتِ الْوَكَالَةُ بَطَلَتِ الشِّرْكَةُ۔[2] جب نمائندگی (وکالت) کالعدم ہو جائے تو شرکت بھی کالعدم قرار پاتی ہے۔

البتہ اگر ورثاء چاہیں تو شرکت کے معاہدے کی از سر نو تجدید کر سکتے ہیں۔

(۵) **مشترکہ سرمایہ دار کمپنی**: شغل اصل کا ایک اور طریقہ مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کے حصوں کی خریداری ہے۔

نئے زمانے کے اکثر حوصلہ مندانہ کاروبار اتنی زیادہ مقدار میں اصل چاہتے ہیں کہ کوئی ایک شخص اس کی بہم رسانی تنہا نہیں کر سکتا نیز ہر حوصلہ طلب کاروبار میں کچھ نہ کچھ خطرہ یا جوکھم ضرور مول لینا پڑتا ہے خاص کر اس کے ابتدائی مرحلوں میں نیز کارخانے کے مکمل ہو کر چلنے کے لیے کم از کم سال ویڑھ سال لگتا ہے اور بعض بڑے کاروبار کی تیاری کے لیے کئی سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے مثلاً پشاور سے راس کماری تک ریل کی پٹریاں ڈالنے کے لیے اور اسی طرح نہر سوئز اور نہر پناما کی تیاری کے لیے برسوں کا عرصہ لگا تھا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایک فرد یا چند اشخاص اس طرح کا بڑا کاروبار انجام نہیں دے سکتے اور نہ اس طرح سرمایہ لگانا پسند کرتے ہیں اسی بناء پر مشترکہ سرمایے کے کاروبار کا طریقہ اختیار کیا گیا۔

مشترکہ سرمایے کے کاروبار نے عظیم الشان صنعتی سہولتیں پیدا کی ہیں جس کی وجہ سے صنعت و حرفت تجارت اور دیگر مختلف قسم کے کاروبار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے، کاروبار کے لیے جس قدر سرمایہ درکار ہوتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے بے شمار حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر شخص جس قدر حصے چاہے خرید سکتا ہے۔

---

[1] ۔ ھدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ [2] ۔ ھدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مشترکہ سرمایہ دار کمپنیاں عہد جدید کی پیداوار ہیں بلکہ قدیم سے اس کا رواج رہا ہے جاہلی عرب میں بھی یہی طریقہ رائج تھا چنانچہ عرب کے قدیم معاشی نظام کے باب میں واضح کیا گیا ہے کہ، قریش کے تجارتی کاروان مشترکہ سرمایے سے چلتے تھے خاص کر بدر کے کاروان میں مختلف اشخاص کا سرمایہ لگا ہوا تھا[1]۔ البتہ عصر حاضر میں ان سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا گیا اور متعلقہ قوانین میں وسعت اور لچک پیدا کی گئی۔

قراض اور شراکتی کاروبار میں یہ خامی ہے کہ ایک شریک کار کے مرنے پر شراکت اور قراض کے کاروبار کو بند کرنا پڑتا ہے، یا از سر نو تجدید کرنی پڑتی ہے نیز کوئی ایک شریک جس وقت چاہے شراکت اور قراض کے کاروبار بند کر سکتا ہے، لیکن مشترکہ سرمایے کی کمپنی کے حصے مال منقولہ کے مثل بازار میں فروخت ہو سکتے ہیں، اگر ذرا غور کیا جائے تو مشترکہ سرمایہ دار کمپنیاں شرکت کی ترقی یافتہ شکل ہیں، جہاں ایک شخص کی بجائے کئی اشخاص سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور منتظم کاروبار ہزاروں مزدوروں سے اُجرت پر کام لیتا ہے قراض کے بیان میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ مقارض اگر مال زیادہ ہو تو اُجرت پر مزدوروں سے کام لے سکتا ہے، جبکہ اکیلے اس سے محنت نہ ہو سکے۔

الغرض مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں میں سرمایہ دار اپنے سرمایے کی وجہ سے اور منتظم کاروبار اپنی تنظیمی محنت کی بنا پر نفع پانے کا مستحق ہوتا ہے، اور مزدور اپنی محنت کی وجہ سے اُجرت کا مستحق ہوتا ہے۔ مشترکہ سرمایہ دار کمپنی ایک حیثیت سے شرکت العنان سے مشابہ ہے کہ ہر ایک شریک کی ذمہ داری محدود رہتی ہے۔ اور مجلس نظماء ہر شریک سرمایہ کی جانب سے بحیثیت نمائندہ کے کاروبار کی نگرانی رکھتی ہے ہر شریک جس وقت چاہے اپنا حصہ دوسری منقولہ چیزوں کے مثل بازار میں فروخت کر سکتا ہے۔

"ایک بڑی بحث یہ کی جاتی ہے کہ معاشی ترقی میں سرمایہ داری کو ترقی کرنے سے روکنا چاہیے، اس کو قومی بنانا چاہیے، لیکن ہر معاشی کاروبار کو قومی یا سرکاری بنانا اور افراد کو ترقی کا موقع نہ دینا اسلامی معاشی نظریات کے مخالف ہے سرمایہ داری کی افراط تفریط دونوں قابل اعتراض ہیں یہ امر ممکن ہے کہ عام طور پر مشترکہ کاروبار میں انتہائی حصہ داری کو

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام عنوان "مکہ" نیز وہیں پر عربی کتابوں کے ماخذ بھی ملیں گے

قانوناً محدود رکھا جائے اور کم مقدار کے حصص کافی تعداد میں جاری کیے جائیں تاکہ عامۃ الناس اس کو حاصل کر سکیں۔[1]

مغربی دنیا میں تمسکات کی خرید و فروخت کا جو طریقہ جاری ہے، یا مشرق میں اب جاری ہو رہا ہے، اصلاح طلب ہے، کیونکہ جیسا کہ پروفیسر ٹاسگ نے لکھا ہے کہ تمسکات کے خریداروں اور فروشندوں کی پوری جماعت ایک دوسرے کو دھوکا دینے کی تاک میں رہتی ہے۔[2]

(۶) ڈبینچرس :- مغربی دنیا میں شغل اصل کا ایک اور طریقہ رائج ہے، جو ڈبینچرس کی خریدی ہے۔[3] ایک کمپنی ڈبینچرس اجرا کر کے مقررہ شرح سود پر عام لوگوں سے قرض حاصل کرتی ہے، اور عام طور پر کمپنی کے اثاثے کی کفالت پر اس کا تحفظ کیا جاتا ہے، اور حاملین ڈبینچرس کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ اگر ان کا سود کمپنی ادا نہ کرے تو اثاثے کو ضبط کریں، حاملین ڈبینچرس کی حیثیت منتظمین کاروبار کی نہیں ہوتی، بلکہ ان کی حیثیت قرض خواہوں کی ہوتی ہے، کیونکہ وہ صرف سود کے مستحق قرار پاتے ہیں، چاہے نفع ہو کہ نہ ہو۔[3] ظاہر ہے کہ ڈبینچرس بالکل اسلامی اسپرٹ کے خلاف ہیں، اس لیے وہ ناجائز ہیں، کیونکہ حاملین ڈبینچرس نفع میں تو شریک ہوتے ہیں، لیکن نقصان میں شریک نہیں ہوتے، اس زمانے میں لوگ بنک سے قرض لے کر صنعتی اور تجارتی کاروبار کرتے ہیں اور بنک کو مقررہ سود ادا کرتے ہیں۔

اسلام نے سود کو ممنوع قرار دیا ہے۔ خلافت راشدہ کے درخشاں عہد میں بنک کا بہتر بدل خود سرکاری خزانہ یا "بیت المال" تھا، مسلمان بیت المال سے قرض لے کر بڑے پیمانے پر تجارتی کاروبار کرتے تھے اور منافع کا کچھ حصہ بیت المال میں داخل کرتے تھے اس کی وضاحت تفصیل سے مبادلہ دولت کے باب میں بیت المال کے تحت بیان کی گئی ہے۔

(۷) حکومتی کاروبار موجودہ زمانے میں سرکار اور بلدیات سڑکوں، ریلوں،

---

[1] مضمون حافظ محمد مظہر صاحب منقول از اخبار صحیفہ مورخہ ۱۹ رجب ۱۳۶۴ھ م ۳۰ جون ۱۹۴۵ء

[2] ٹاسگ، پرنسپلز آف اکنامکس جلد (۲) باب ۶ صفحہ ۸۸ - [3] ہنھام اکنامکس ص ۱۷۴

ٹرام کاروں، روشنی، بجلی، واٹر ورکس وغیرہ جیسے پیدا آور کاروبار کے لیے روپیہ قرض لیتی ہیں اور تمسکات والوں کو کچھ فی صد سود کی شکل میں ادا کرتی ہیں لیکن ان تمسکات والوں کو کاروبار کے نفع نقصان سے کچھ سروکار نہیں ہوتا اسلامی حکومت بھی قرض پر روپیہ لے سکتی ہے مگر بشرکت نفع ونقصان۔ اس کی وضاحت آئندہ سرکاری مالیات کے باب میں کی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی معاشیات نے ہر قسم کے نفع آور کاروبار کو جائز قرار دیا ہے بلکہ اس کا سارا رجحان کاروبار کرنے پر زور دیتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر قسم کے سودی کاروبار کو ناجائز قرار دیا ہے۔" رہی سود اور منافع کی بحث جو اہل اسلام سے خاص تعلق رکھتی ہے وہ در اصل زیادہ پیچیدہ نہیں ہے کاروبار کی مالی شرکت میں اگر معاوضہ کی شرح پہلے سے معین نہ کی جائے بلکہ حسب حال کمی بیشی کے ساتھ نفع و نقصان میں شرکت رہے تو سود کی صورت باقی نہیں رہتی جو کچھ ملتا ہے منافع ہوتا ہے اور منافع ہر طرح جائز ہے بلکہ بلاکسی لحاظ مذہب علمی تجربہ سے بھی دینا سود کی مضرت اور منافع کی منفعت کی قائل ہو رہی ہے[1]۔"

بہرحال اجتماعی طور پر کاروبار اور سرمایہ ومحنت سے مل جل کر بڑے سے بڑے پیمانہ پر نفع اٹھانے کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں ان میں سے کسی صورت کو بھی اسلامی معاشیات نے نظر انداز نہیں کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ اس معاشی تنظیم کے باوجود ملک میں وہی شخص بے کار اور بے روزگار رہ سکتا ہے جو خواہ مخواہ بے کار بے روزگار رہنا ہی چاہتا ہو ورنہ سرمایہ ہو کہ نہ ہو، کسی پیشے یا ہنر سے واقف ہو کہ نہ ہو، کام کرنے والے دوسروں سے مل کر کام کر سکتے ہیں اور جتنا چاہیں نفع کما سکتے ہیں۔

اور یہ تو گزر ہی چکا کہ مساقاۃ یا مزارعۃ، شرکت ہو یا حکومتی کاروبار سب میں اجتماعی کاروبار کے دروازے اسلام کے نظام معیشت میں کھلے ہوئے ہیں ملک کی

---

[1] - پانچویں معاشی کانفرنس حیدرآباد کا خطبہ صدارت از پروفیسر الیاس برنی صاحب مجلہ طیلسانین عثمانیہ جلد ۷ حصہ معاشیات جلد ۲ شمارہ ۲ بابتہ ۱۰ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ مطابق مارچ ۱۹۴۳ء۔

اجتماعی قوتوں سے پیداوار کے حاصل کرنے اور سرمایہ اور محنت دونوں کو جوڑ کر بہتر نتیجے پیدا کرنے اور اس طرح بے روزگاری دُور کر کے خوش حالی اور فارغ البالی کا دَور قائم کرنا اسلامی معاشیات کا مقصد اور اس کی غرض و غایت ہے۔

(۵) تنظیم

تنظیم ایک قسم کی دماغی محنت ہے کاروباری قابلیت یا تنظیم کے بغیر کوئی ملک اعلیٰ پیمانے پر دولت پیدا نہیں کر سکتا اس بناء پر معاشئین نے تنظیم کو ایک علیحدہ عامل پیدائش قرار دیا ہے۔

اسی "پیدائش دولت" کے باب میں محنت کے تحت واضح کیا گیا کہ قرآن مجید میں ایسی محنت کا بھی تذکرہ ہے جس میں بجائے جسم کے زیادہ تر دماغ سے کام لیا جاتا ہے یوسف علیہ السلام کو بادشاہ مصر نے قحط کے زمانے کے لیے غلے کی فراہمی اور راتب بندی کے کاروبار کی تنظیم پر مقرر کیا تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں انھیں رسد اور اغذیہ کی فراہمی کا وزیر مقرر کیا گیا تھا چنانچہ بادشاہ مصر نے ان سے گفتگو کے بعد خواہش کی کہ

إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ۔ — آج سے تم ہمارے نزدیک معزز و معتبر ہو۔

پ ۱۳ یوسف ۱۲ ع

حضرت یوسفؑ نے نوکری کی اس درخواست کو قبول فرمایا اور پھر اپنے متعلق یہ کہا کہ

اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ۔ پ ۱۳ یوسف ۲ ع — ملک کے خزانوں پر مجھے مامور کر دو میں ان کی حفاظت کرنے والا اور بڑا واقف کار ہوں۔

غرض اسی طرح حضرت یوسفؑ مختار کل بن کر سات سال تک مصر میں راتب بندی اور رسد کی فراہمی کی تنظیم کرتے رہے۔

مسئلہ تنظیم پر اگر غور کیا جائے تو اسلام تنظیم ہی تنظیم نظر آتا ہے نماز میں امامت، حکومت میں خلافت، حج میں امارت، غرض یہ سب اسلامی تنظیم کے مظاہر ہیں۔

حضور اکرمؐ کو تنظیم پر اتنا اصرار تھا کہ جب دو تین آدمی بھی سفر کرتے تو ایک کو امیر اور

دوسروں کو مامور بنا دیا کرتے تھے چنانچہ ابو سعید الخدری کا بیان ہے کہ "رسول اکرم نے فرمایا کہ جب سفر کے لیے تین شخص روانہ ہوں تو ایک کو امیر بنا لیا جائے"[1]

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کو اگر ایک ہفتہ کے لیے بھی چھوڑتے تو کسی کو وہاں کا نائب بنا دیتے۔ یہی نہیں بلکہ بیعت عقبہ جیسے ابتدائی زمانے میں نقبائے مدینہ کی قلیل جماعت کے لیے ماموری کا حکم دیا۔ تنظیم کی پابندی کے متعلق ان حدیثوں سے بھی اندازہ ہوتا ہے جس میں جماعت کی پابندی پر زور دیا گیا ہے مثلاً
يَدُ اللهِ علىٰ الجماعةِ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّار[2] اللہ کا دست قدرت جماعت پر ہے جو الگ ہوا وہ دوزخ میں جائے گا۔

تنظیم کو باقاعدہ چلانے کے لیے تقسیم عمل وغیرہ پر زور دیا جاتا ہے اس سلسلے میں صرف اتنا اشارہ ہی کافی ہے کہ جنگ خندق کے موقع پر کئی میل کی کھائی کھودی گئی تو اس میں حضور اکرم نے خندق کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ہر چالیس چالیس گز کا فاصلہ دس دس صحابیوں میں تقسیم کیا۔[3]

(۶) فراہمی روزگار کا مسئلہ

بے روزگار لوگوں اور مظلوم مہاجرین کو روزگار پر لگانے کا مسئلہ آج نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ کرۂ ارض کے بڑے اہم معاشی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ہے۔ اکثر مزدوروں کو باوجود اس کے کہ جسمانی حیثیت سے قوی و تنومند اور دماغی حیثیت سے ہوشیار کاریگر ہوتے ہیں پھر بھی روزگار ملنے میں خاصی دشواریاں پیش آتی ہیں۔

---

[1] ابو داؤد کتاب الجہاد۔ [2] ترمذی
[3] تفصیل کے لیے تاریخ طبری صفحہ ۱۴۶۷ ۵ھ جنگ خندق کے واقعات۔

آج سے کئی ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے، مصر کی سرزمین ہے، فرعونی اقتدار عروج پر ہے، ایک شخص دوڑتا ہوا آتا ہے اور حضرت موسیٰ کو خبر سناتا ہے کہ مصری پارلیمنٹ یہ فیصلہ صادر کرنے والی ہے کہ تمھیں جان سے مار ڈالا جائے تم بھاگ کھڑے ہو۔

قَالَ: یٰمُوْسٰی! اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِکَ لِیَقْتُلُوْکَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَکَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ
پ۲۰ القصص ع۳ ۔

کہنے لگا کہ اے موسیٰ! یہاں کے سردار تمھارے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں تاکہ تمھیں قتل کر دیں۔ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ بے شک میں تمھارے خیرخواہوں میں سے ہوں۔

بے چارے موسیٰ خوف زدہ اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر مدین سرزمین شام کا رخ کرتے ہیں، مدین کے پانی پر پہنچتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ چرواہے اپنی بکریوں کو پانی پلا رہے ہیں اور دو دوشیزہ لڑکیاں دور کھڑی ہوئی انتظار میں ہیں کہ چرواہے ہٹیں تو اپنی بکریوں کو بھی لے جا کر پانی پلائیں، موسیٰ علیہ السلام ان کی بکریوں کو پانی پلا دیتے ہیں اور پھر ایک درخت کے سایہ تلے آ بیٹھتے ہیں پہلے تو بارگاہِ رب العزت میں رجوع ہوتے ہیں جو حقیقت میں روزگار کا فراہم کرنے والا ہے۔

فَقَالَ: رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ۔
پ۲۰ القصص ع۳

پس کہا کہ اے میرے پروردگار! بے شک میں اس نعمت کا جو تو میری طرف نازل کرے میں محتاج نادار ہوں۔

ناگاہ ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی سراپا شرم بن کر آتی ہے اور کہتی ہے کہ ہمارے ابا جان تمھیں بلاتے ہیں بکریوں کو جو تم نے پانی پلایا اس کا معاوضہ اجرت دینا چاہتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچتے ہیں اور اپنا قصۂ درد سناتے ہیں، حضرت شعیبؑ انھیں دلاسا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب تم ظالموں کے ظلم سے نجات پا چکے ہو۔ اب ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی اپنے باپ سے استدعا کرتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اجرت پر مزدور بنا لیا جائے۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا: یٰٓاَبَتِ! اسْتَاْجِرْهُ

ان میں سے ایک نے کہا کہ اے ابا جان! تم اسے مزدوری پر رکھ لو

اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ۔ بے شک جنھیں تم مزدور بناؤ تو ان میں وہی بہتر ہے جو طاقتور اور امانت دار ہو۔
پ۲۰ القصص ع۳

شعیب علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کو اپنے مویشی چرانے کے لیے مزدور مقرر فرماتے ہیں۔

اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ
پ۲۰ القصص ع۳

بے شک میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تم سے اس شرط پر کر دوں کہ تم آٹھ سال میرے ہاں مزدوری کرو پھر اگر دس برس پورے کر دو تو یہ تمھاری طرف سے ہے۔

آجر اور مزدور کا تذکرہ آتے ہی عام طور سے آجر کے ظلم و استبداد کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے لیکن سب آجر ظالم نہیں ہوتے اور قرآن پاک تو ایک بہترین آجر کے کردار کو بطور نمونہ پیش کرنا چاہتا ہے چنانچہ شعیب علیہ السلام جو آجر ہیں مذکورہ الفاظ کے بعد ہی اپنے مزدور موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ
سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ
پ۲۰ القصص ۲۸ ع۳

میں تم پر سختی کرنی نہیں چاہتا۔
انشاءاللہ تم مجھے نیکو کار پاؤ گے۔

اُجرت کے اس معاملے کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام اس طرح مزدور کی ذمہ داری قبول فرماتے ہیں۔

ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكَ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ وَ اللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ۔
پ۲۰ القصص ۲۸ ع۳

میرے اور تمھارے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا۔ جو بھی مدت چاہوں پوری کر دوں مجھ پر زیادتی نہ ہونے پائے۔ بس پر خدا گواہ ہے جو ہم کہتے ہیں۔

غرض یوں شعیب علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے لیے روزگار فراہم کرتے ہیں اور کاروبار پر لگا لیتے ہیں۔

آٹھ دس سال محنت مزدوری کرنے کے بعد یہ تنومند مزدور جو حسن دولت مزدوری میں کمایا تھا اور اپنے خاندان کو لے کر اپنے وطن لوٹنے کے ارادے سے

وادیِ ایمن میں پہنچتا ہے تو کوہ طور پر تجلی نظر آتی ہے جاڑے کے دن تھے، مزدور نے آگ لانے اور آگ تاپنے کے لیے قدم آگے کیا بڑھائے کہ ربانی تجلی نے پیغمبرانہ جلال کا خلعت پہنا دیا۔ ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال ✥ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اب یہی مزدور پیمبری سے سرفراز ہو کر مصر پہنچتا اور فرعونی استبداد اور یوں اپنے زمانے کی سب سے بڑی سامراجی طاقت کو سرنگوں کر دیتا ہے، لیکن تفصیلات میں جانا پیش نظر نہیں ہے، کیونکہ یہ بحث ہم کو معاشی مسائل سے نکال کر سیاسی میدان میں پہنچا دیتی ہے تمہید صرف یہ دکھانا تھا کہ بے روزگاروں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ ان میں ایسے ایسے تابناک جوہر کس مپرسی کی گرد میں دبے ہوئے ہوتے ہیں کہ اگر دستگیری اور حوصلہ افزائی کی ڈھارس ملے تو ان کی تابناکی سے نظریں خیرہ ہوں۔

بے روزگار مہاجرین کے مسئلے کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تشریف آوری کے بعد جس خوش اسلوبی سے سلجھایا تھا اسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں سیرۃ طیبہ کے ایک سرسری مطالعے سے معلوم ہو گا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو روزگار کی فراہمی کے عملی طریقے بھی بتائے تھے، اور بے روزگاروں کو روزگار پر لگایا تھا اس کو تو پیغمبرانہ مشن کا ہی ایک پہلو قرار دینا چاہیے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک بے روزگار انصاری نے حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سوال پیش کیا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ آیا تمہارے پاس کسی قسم کی کوئی چیز ہے، انھوں نے عرض کیا کہ ہاں ایک کمبل ہے، جس کا کچھ حصہ پہنتا ہوں اور اسی کے کچھ حصے کو اوڑھ لیتا ہوں، نیز ایک پیالہ ہے جس سے پانی پیتا ہوں آپ نے فرمایا کہ اسی کو لے آؤ چنانچہ وہ لے آئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک میں ان دونوں چیزوں کو لے کر ہراج کرنا شروع کیا تو ایک صحابی نے ایک درہم دام لگایا۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ کوئی دینے والا کسی اور صحابی نے دو درہم دام لگائے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کے حوالے کر دیا اور دو درہم لے کر سوال کرنے والے بے روزگار انصاری کے حوالے کر دیے

اور ارشاد فرمایا کہ ایک درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر لاؤ، کلہاڑی آئی، دنیا والوں نے دیکھا کہ آسمان و زمین کے سردار خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود اپنے دست مبارک سے اس کلہاڑی میں لکڑی ٹھونکی اور سوال کرنے والے بے روزگار انصاری کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ جاؤ اس سے جنگل جا کر لکڑی کاٹو اور میں چاہتا ہوں کہ پندرہ دن تک تمھیں نہ دیکھوں، چنانچہ انصاری نے یہی کیا اور پندرھویں دن حاضر خدمت ہوئے، پوچھا کہ کیا حال ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ اس عرصے میں دس درہم کی آمدنی ہوئی جن میں سے چند درہم کے تو میں نے کپڑے خریدے اور چند درہم کا اناج حضور کریمؐ نے فرمایا کہ یہ اس بات سے بہتر ہے کہ تم کسی سے بھیک مانگو اور قیامت کے دن ذلت اٹھاؤ[1]

غور کرنے کی بات ہے کہ بجائے اس غریب کے کمبل اور پیالے کے یہ بھی ممکن تھا کہ خود رسالت مآبؐ یا آپ کسی صحابی سے اُن کو دو درہم دلوا سکتے تھے لیکن آپؐ کی جو غرض تھی وہ بخوبی اس شکل میں حاصل نہ ہوسکتی تھی اور آپؐ یہ چاہتے تھے کہ جہاں تک ہوسکے ہر شخص اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہونے کی کوشش کرے اور دوسرے پر بار نہ بنے اور یہ مقصد بہترین طریقے پر اسی تدبیر سے حاصل ہوسکتا تھا کسی اور طریقے سے نہیں۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم عام طور سے یہ ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ بات کہ کوئی شخص تم میں سے رسی لے کر جنگل جائے، لکڑی کاٹے اور اس کو اپنی پیٹھ پر لاد کر بیچے اس کے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ کسی شخص کے پاس جائے اور اس سے سوال کرے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اس کو دے یا نہ دے"[2]

غریبوں کو محنت کی رغبت دلائی ❊ کہ بازو سے اپنے کرو تم کمائی
خبر تا کہ لو اس سے اپنی پرائی ❊ نہ کرنی پڑے تم کو در در گدائی

(مسدس حالی)

[1] ابوداؤد، ترمذی نیز سنن ابن ماجہ وغیرہ [2] بخاری پ۸ کتاب البیوع نیز مسلم، ابوداؤد وغیرہ

فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ایک قوی ہیکل نوجوان یہ کہتا ہوا مسجد میں داخل ہوا کہ جہاد کرنے میں کون میری مدد کرتا ہے؟ عمر فاروقؓ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مجمع سے فرمانے لگے کہ اپنی زمین پر کام کرانے کے لیے اس شخص کو مزدوری پر کون لیتا ہے؟ کسی انصاری نے کہا کہ میں لیتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ

بِكَمْ تَاجِرُهُ كُلَّ شَهْرٍ — تم اس کو ماہانہ کتنی اجرت دو گے؟

انصاری نے اجرت بتائی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اچھا تم اس کو نوکر رکھ لو، غرض نوکر ہو کر وہ نوجوان چلا گیا۔

چند مہینے بعد حضرت عمرؓ نے انصاری سے پوچھا کہ میرے رکھائے ہوئے نوکر نے کیا کیا؟ انصاری نے عرض کیا ٹھیک ہے اے امیر المومنین! حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کی جمع شدہ اجرت کے ساتھ میرے پاس لایا جائے۔ مزدور حاضر کیا گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ مزدور حاضر ہوا اور اس شکل میں حاضر ہوا کہ درہموں سے بھری ہوئی ایک تھیلی بھی اس کے ساتھ تھی۔ فاروق اعظمؓ نے اس نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا: لو یہ تھیلی! اب جی چاہے جا کر جہاد کرو جی چاہے گھر بیٹھو[1]۔

فاروق اعظمؓ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "جب میں کسی شخص کو دیکھتا ہوں اور مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے تو میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ آیا وہ کوئی پیشہ بھی کرتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہے کہ نہیں بے کار ہوں تو میری نظر سے گر جاتا ہے[2]۔ اکثر آپ مسلمانوں کو نصیحت کرتے تھے کہ

لَا تَكُونُوا عِيَالًا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ — مسلمانوں پر اپنی پرورش کا بوجھ نہ ڈالو۔

ایک امریکی پروفیسر کارور کی زبانی اس کی وجہ سنیئے وہ کہتا ہے کہ "اگر معاشرے کے افراد سے ایک حصہ کام کرے تو اس صورت میں یا تو کام کرنے والوں پر زیادہ بار پڑے گا یا کم پیدا ہوگا اور اس طرح کم دولت پیدا ہوگی[3]۔"

---

[1] کنز العمال ج ۲ صفحہ ۲۰۷ کتاب البیوع [2] کنز العمال ج ۲ صفحہ ۲۰۸ کتاب البیوع

[3] کارور اینڈ کارمیکائیل: ایلیمنٹس آف اکنامکس صفحہ ۹۶۔

غرض اسلامی تعلیمات کی رو سے مسلمانوں پر معاشی جد وجہد لازم ہے۔

طَلَبُ الْکَسْبِ فَرِیْضَۃٌ عَلیٰ کُلِّ مُسْلِمٍ [1] روزگار کی تلاش ہر ایک مسلمان پر فرض ہے

حضرت عمرؓ تو اہم صورتوں میں کاروبار کو جہاد پر ترجیح دیتے تھے [2]

انسدادِ گداگری

گذشتہ فصلوں میں جو مباحث بیان ہوئے، ان میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان اپنی جد وجہد کو کام میں لاکر کیونکر عطیات قدرت پر محنت۔ سرمایہ اور تنظیم کے عمل سے دولت پیدا کر رہا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ پیدائش دولت اور حصول معاش کی جد وجہد کے متعلق حضور اکرمؐ کا جو طرزِ عمل تھا، مسلمان اگر اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا پر چلنے کو اپنی سعادت قرار دیں تو شاید مشکل ہی سے کوئی مسلمان بے کار یا بے روزگار رہ سکتا ہے اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ "میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ کسی شخص کو بے کار بیٹھا ہوا دیکھوں جو نہ دنیا کا کام کرے اور نہ آخرت کا" [3]

بھیک (گداگری) دنیا کے بعض مذہبوں میں مذہبی فرائض کے لوازم سے ہے اور دان پُن کا زیادہ استحقاق اسی کو حاصل ہے جو مذہب سے زیادہ تعلق رکھتا ہو جیسا کہ ہمارے ملک میں برہمنوں کا حال ہے [4] جن لوگوں نے اپنی مذہبی تعلیمات سے متاثر ہو کر ترکِ دنیا کو اپنا مسلک بنایا نیز ان کے جانشین جو زیرک اور انسانی نفسیات کے عالم تھے ان سب نے مختلف ذریعوں سے عوام کی کمائی میں خود کو حصہ دار بنا لیا کہ کمائے کوئی، کھائے کوئی۔ لیکن اسی گروہ میں جو بے چارے بیوقوف اور احمق تھے انھوں نے گداگری کو اپنا پیشہ بنایا اور رفتہ رفتہ یہ ان کا خاندانی پیشہ بن گیا۔

اسلامی نظامِ معیشت میں جس طرح ترکِ دنیا کو ممنوع ٹھیرایا گیا ہے اسی طرح

---

[1] مبسوط السرخسی ج ۳۰ صفحہ ۲۴۵ کتاب الکسب۔ [2] مبسوط السرخسی ج ۳۰ صفحہ ۲۴۴ کتاب الکسب نیز کنز العمال ج ۲ صفحہ ۱۰۔ [3] طبرانی۔

[4] برہمن کے فرائض میں دان لینا بھی ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو منوسمرتی ادھیائے ۱ منتر نمبر ۸۸ نیز ادھیائے ۱۰ منتر ۷۵ نیز گیتا بر موقع۔

گداگری کو بھی مذموم قرار دیا گیا ہے آنحضرت صلعم نے بھیک کے لقمے کو جہنم کی آگ کا تپایا ہوا پتھر قرار دیا ہے۔

رضفًا یا کلۂ فی جھنم [1] جہنم کی آگ میں تپایا ہوا پتھر چبائے گا۔

آپؐ فرماتے تھے، جیساکہ بخاری وغیرہ میں ہے کہ "تم میں جو کوئی بھیک مانگتا ہے، وہ جب خدا کے سامنے جائے گا تو اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی"[2]

غرض اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کی ذہنیت میں اتنا بڑا انقلاب برپا کردیا کہ وہ سوال کرنے کو بڑا گناہ سمجھتے تھے۔

حکیم بن حزام اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ "میں نے ایک مرتبہ رسول اکرمؐ سے کچھ مانگا تو آپؐ نے مجھے دیا پھر میں نے آپؐ سے مانگا تو آپ نے مجھے دیا۔ پھر میں نے آپؐ سے مانگا تو آپ نے مجھے دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اے حکیم! یہ مال ایک میٹھی سبزی ہے، جو شخص اس کو بے طمعی سے لیتا ہے، اس کے لیے اس میں برکت دی جاتی ہے، اور جو شخص اس کو لالچ سے لیتا ہے اسے اس میں برکت نہیں دی جاتی اور وہ شخص مثل اس شخص کے ہوتا ہے جو کھائے اور سیر نہ ہو، اور اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا کہ میں آپ کے بعد کسی سے کچھ نہ لوں گا، یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہو جاؤں"

"جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو حکیم بن حزام کو وظیفہ دینے کے لیے بلاتے رہے مگر انھوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا"

"پھر جب حضرت عمرؓ نے انھیں بلایا تاکہ انھیں وظیفہ دیں، مگر انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے مسلمانو! میں تمھیں گواہ کرتا ہوں کہ میں نے حکیم کے سامنے ان کا حق پیش کیا مگر وہ اس مال غنیمت سے اپنا حق فئی لینے سے انکار کرتے ہیں القصہ حکیم بن حزامؓ نے رسول اکرمؐ کے بعد کسی سے

---

[1] ۔ ترمذی۔ [2] ۔ بخاری پ ۶ کتاب الزکوٰۃ

کچھ نہ لیا، یہاں تک کہ وفات پائی۔[1]

سوال تو ایک طرف حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ کسی سے کچھ مانگنے کو کسر شان سمجھتے تھے حضرت ابوبکرؓ کا کوڑا سواری میں گر جاتا تو اونٹ سے اُتر کر خود ہی اٹھا لیتے۔[2] ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت ثوبانؓ کا اسی قسم کا واقعہ لکھا ہے۔[3]

اس موقع پر انگلستان میں انسداد گداگری کے سلسلے میں جو واقعات پیش آئے ان کا یہاں سرسری سا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ "ہنری ہشتم اس بات پر مجبور ہوا کہ گداگروں کے خلاف سخت کارروائی کرے، چنانچہ ہٹے کٹے مضبوط گداگروں کو گاڑی کے سرے سے برہنہ باندھ دیا جاتا اور شہر میں پھرا کر اتنے کوڑے لگائے جاتے کہ تمام جسم خون آلود ہو جاتا۔"[4]

"ایک زمانے میں تو ہنری ہشتم کے زمانے سے زیادہ گداگری کے خلاف سخت کارروائی کی گئی چنانچہ ۱۵۴۷ء کے قانون کے ذریعے گداگروں کو داغ دیئے جاتے تھے جو کوئی بھی خواہش کرتا اس گداگر کو غلام کی طرح کسی کو دو سال کے لیے دے دیا جاتا اگر کوئی شخص اس کو لینے کی خواہش ظاہر نہ کرتا تو اس سے عام راستے پر کام کروایا جاتا اور اگر ضرورت سمجھی جاتی تو زنجیروں ہی میں کس کر کام لیا جاتا۔"[5]

لیکن رسول اکرمؐ کی تعلیمات کی بدولت بغیر کسی جبر و ستم کے عرب سے گداگری کا انسداد ہو چکا تھا آپ بکثرت اعلان فرماتے تھے کہ

اَلصَّدَقَةُ تُمِيتُ الْقَلْبَ — صدقہ آدمی کے فطری احساسات کو مردہ کر دیتا ہے

اور تجربہ شاہد ہے کہ صدقہ کھانے والے لوگ خودداری، عزت نفس، رحم وغیرہ کے جذبات سے نا آشنا ہو جاتے ہیں حضور انورؐ اکثر یہ بھی فرماتے تھے کہ کسی کا اپنی پیٹھ پر بوجھ لادنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ کسی سے سوال کرے۔[6]

۱۔ بخاری پ ۶ کتاب الزکواۃ، بخاری پ ۱۲ کتاب الجہاد نیز بخاری پ ۲۶ کتاب الرقاق نیز مسلم وغیرہ
۲۔ مسند احمد حنبل بحوالہ سیوطی: تاریخ الخلفاء صفحہ ۳۴ فضائل ابی بکرؓ
۳۔ ابن ماجہ باب کراہیۃ المسائلۃ۔
۴۔ ملٹن برگس اینڈ پرسی جارڈن: اکنامک ہسٹری آف انگلینڈ صفحہ ۱۳۴ چوتھا ایڈیشن
۵۔ ملٹن برگس اینڈ پرسی جارڈن: اکنامک ہسٹری آف انگلینڈ صفحہ ۱۳۴ چوتھا ایڈیشن۔
۶۔ بخاری پ ۶ کتاب الزکواۃ۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسلامی معاشرے میں پیشہ ور گداگروں کا کوئی مقام نہیں ہے البتہ کسی شخص کو کوئی ایسی احتیاج پیش آئی ہو کہ وہ مانگنے پر مجبور ہو جائے تو معذوری کے اسی معیار پر سائل کی سفارش کی گئی ہے کہ

وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ	اور سائل کو نہ جھڑک

پ ۳۰ الضحیٰ ع ۱

ایسے محتاج جو بظاہر خوش باش نظر آتے ہیں اور اپنی خودداری کے سبب کسی سے مانگتے نہیں اُن کے متعلق صاحبِ استطاعت کو حکم ہے کہ قیافہ شناسی سے کام لے کر اُن کی دستگیری کریں

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۔	خیرات اُن حاجتمندوں کے واسطے ہے جو خدا کی راہ میں مقید ہو گئے ہیں اور زمین پر گھومنے کی استطاعت نہیں رکھتے نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف انھیں دولت مند سمجھتا ہے تو اُن کے چہروں کو دیکھ کر پہچان لے گا کہ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے
وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۔	اور جو مال تم خرچ کروگے بے شک حق تعالیٰ اس کو جانتا ہے ۔

پ ۳ بقرہ ع ۳۷

حدیثوں میں بتایا گیا ہے کہ سائل کی ظاہری خوش حالی سے سائل پر بدگمانی نہ کرنی چاہیے مبادا کوئی ایسی احتیاج پیش آئی ہو کہ باوجود ظاہری خوش حالی کے سائل نے بے غیرتی کو گوارا کر لیا ہو اور مانگنے پر مجبور ہوا ہو ۔ امام حسینؓ ابن علی کرم اللہ وجہہٗ فرمایا کرتے تھے کہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ : لِلسَّآئِلِ حَقٌّ وَ اِنْ جَآءَ عَلٰى فَرَسٍ [1]	رسول اللہ نے فرمایا کہ مانگنے والے کا حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہو ۔

یہی حدیث آج کل سیکل سواروں پر صادق آتی ہے ۔

تبصرہ :۔ اس میں شک نہیں کہ مفلس اور غریب عربوں کی معاشی پست حالی کے متعلق

---

[1] ۔ ابو داؤد ۔

تاریخی کتابوں میں عجیب و غریب واقعات درج ہیں۔ ابن خلدون ہی کا بیان ہے کہ عرب کے دیہاتی بیچارے "سوسار کا گوشت، ٹڈے، گوبریلے اور بچھو کھاتے تھے، اور بھوک سے بیتاب ہوتے تو اونٹ کے بال خون میں کوٹ کر کھاتے تھے، اور قریش کا بھی تقریباً یہی حال تھا"[۱]

مغیرہ ابن شعبہؓ سے کسریٰ کے گورنر نے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟ تو مغیرہؓ نے کہا تھا کہ "ہم عرب کے باشندے ہیں، ہم پر سخت تنگی گذرتی تھی اور آفتوں میں گرفتار تھے، بھوک سے بیتاب ہو کر چمڑا اور کھجور کی گٹھلیاں کھاتے تھے اور بالوں کے لباس پہنتے تھے"[۲]

پھر اسی عرب کو اسلام کے بعد پایا گیا، جس حال میں پایا گیا یقیناً اس معاشی انقلاب میں سیاسی فتوحات کو بھی دخل ہے لیکن محض یہی ایک سبب نہیں ہے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی راہ نمائی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے قدرت نے کی تھی وہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف ان کو بلکہ سارے جہاں کو ایک آخری معاشی پیغمبر بھی دیا گیا۔

آخر غور کرنے کی بات ہے کہ جہاں دنیا کے اور پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کے لیے مغفرت و ہدایت کی دعائیں کی تھیں وہیں حضور اکرمؐ ان دعاؤں کے ساتھ ساتھ اس غریب عرب کے لیے یہ بھی دعا فرمایا کرتے تھے کہ

اَللّٰھُمَّ! اِنَّھُمْ حُفَاۃٌ فَاحْمِلْھُمْ — پروردگار! یہ پیدل ہیں، تو انھیں سوار کر

اَللّٰھُمَّ! اِنَّھُمْ عُرَاۃٌ فَاکْسُھُمْ — پروردگار! یہ ننگے ہیں، تو انھیں کپڑے پہنا

اَللّٰھُمَّ! اِنَّھُمْ جِیَاعٌ فَاَشْبِعْھُمْ — پروردگار! یہ بھوکے ہیں، تو انھیں پیٹ بھر کھلا

معاشی دعا کا اس سے بہتر نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے! حضور اکرمؐ کو اگر ایک طرف عربوں کے اعتقادی و اخلاقی بربادیوں سے اتنی تکلیف ہوتی کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ فرماتا ہے

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ — شاید کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دے دیں گے۔

پ ۱۹ الشعراء ۲۶ ع ۱

---

[۱] ابن خلدون [۲] بخاری پ ۱۲ کتاب الجہاد [۳] ابوداؤد۔

قریب قریب اسی قسم کی اذیت آپ کے رؤف و رحیم قلب مبارک کو عربوں کی معاشی پست حالی ان کے افلاس فقر و فاقہ سے بھی ہوتی تھی۔

صحیح مسلم میں ایک طویل روایت ہے، جس کو حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ نے بیان کیا ہے اس حدیث کا ابتدائی حصہ یہ ہے کہ ہم دوپہر کے وقت رسول اکرمؐ کے پاس تھے کہ ناگاہ کمبل پوش ننگے پاؤں تلوار لٹکائے ہوئے ایک قوم آئی، ان میں اکثر بلکہ سب کے سب مضر قبیلے کے تھے۔

فَتَمَعَّرَ وَجْہُ رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل گیا۔

رسول اللہ کے چہرۂ مبارک پر رنگ کے بدل جانے "تمعر" کی یہ کیفیت کیوں طاری ہوئی حضرت جریرؓ ہی اس کے بعد وضاحت فرماتے ہیں۔

لَمَّا رَاٰی مَا بِھِمْ مِنَ الْفَاقَۃِ — جب آپ نے ان کی فاقہ کشی کی حالت دیکھی۔

حضور انورؐ کے لیے یہ حالت اتنی ناقابل برداشت ہوئی کہ پہلے آپ اندر زنانے میں تشریف لے گئے اور اسی پریشانی کے عالم میں باہر نکلے بظاہر گھر میں ایسا سامان نہ تھا جس سے انؓ کمبل پوش ننگے پاؤں والوںؓ کی امداد فرما سکتے ہوں اسی وقت بلالؓ بلائے گئے۔ اذاں دینے کا حکم ہوا نماز ہوئی اور باوجودیکہ جمعہ کا دن نہ تھا، آپ منبر پر تشریف لے گئے اور آیت قرآنی

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ — اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔

پ ۴۔ النساء ع ۱

تلاوت کرتے ہوئے "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کی طرف توجہ دلا کر آدمیت کے ہر ہر عضو کو بے چین کر دیا پھر آیتیں تلاوت فرمائیں اور فرمایا کہ کل لینے کے لیے آج اگر کوئی دینا چاہے تو دے سکتا ہے چنانچہ عطیوں کی بارش شروع ہوئی۔ ڈھیر لگ گیا اور وہی چہرۂ انور جو فاقہ کو دیکھ کر "متمعر" ہوا تھا، حضرت جریرؓ ہی کے الفاظ میں

رَاَیْتُ وَجْہَ رَسُوْلِ اللّٰہِ یَتَھَلَّلُ کَاَنَّہٗ مُذْھَبَۃٌ [1] — میں نے رسول اللہؐ کے چہرۂ مبارک کو دیکھا کہ چمک اُٹھا ایسا معلوم ہوا کہ گویا کندن فک ہے۔

ایک "معاشی روح" اور "معاشی دل" کے احساسات کیا اس سے زیادہ ہو سکتے ہیں؟

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ

"خوبانِ ہمہ دارند" کا جو تنہا مظہر اتم تھا اس کی ان باتوں پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔ وہی جس کے قدم مبارک نمازوں میں قیام کی وجہ سے سُوجے ہوئے دیکھتے تھے، رہی لوگ اس کا بھی تماشا کرتے تھے کہ آپ بازار میں تشریف لے جا رہے ہیں، غلّے کا ایک ڈھیر سامنے نظر آتا ہے، اپنے دست مبارک کو اس انبار میں ڈال دیتے ہیں، آپ کی انگلیوں میں تری لگ جاتی ہے۔

انبار کے مالک سے پوچھا جاتا ہے کہ

مَاهٰذَا ؟ يَاصَاحِبَ الطَّعَامِ ! — غلّے والے ! یہ کیا ہے ؟

وہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ کے رسول ! اس پر بارش ہوگئی۔

معاشی تعلقات کی تصحیح کرنے والے پیغمبر کی زبان مبارک سے آواز آتی ہے۔

اَفَلَاجَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتّٰى يَرَاهُ النَّاسُ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا[1] — پھر تم نے اس تر اناج کو اوپر کیوں نہ رکھا، کہ لوگ دیکھتے، جو فریب کرے وہ ہم سے نہیں ہے۔

سکھائے معیشت کے آداب اُن کو
پڑھائے تمدن کے سب باب اُن کو

(مسدس حالی)

---

[1] ۔ ترمذی، کتاب البیوع

تقسیم دولت کے سلسلے میں قرآنی تعلیم کا نچوڑ یہ ہے کہ

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ

تاکہ دولت تمہارے الداروں ہی میں گھومتی نہ رہے

چوتھا باب

تقسیم دولت

خلاصہ:۔ اس باب میں تقسیم دولت سے متعلق اسلامی زاویہ نگاہ پیش کیا گیا ہے۔

ابتدا میں معاشرہ کے اندر تقسیم دولت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جن ملکوں میں دولت کے سمندر موجزن ہیں وہیں کے رہنے والوں کی بڑی سے بڑی جماعت انتہائی غربت اور افلاس کا شکار ہے وجہ یہ ہے کہ دولت کی تقسیم نہایت ناقص اور حد سے بڑھ کر غیر مساویانہ ہے

اسلامی معاشیات کے پیش نظر یہ اصول رہا ہے کہ دولت ملک کے سب طبقوں میں مناسب طور پر تقسیم ہو اور وہ کسی خاص طبقے اور گروہ میں گھر کر نہ رہ جائے۔

قانون وراثت کے بارے میں واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی قانون وراثت کے

وہ معاشی پہلو جن کو فون کریمر فقہ اسلامی کے قابل تقلید شعبے سے تعبیر کرتا ہے دنیا کی تقسیم دولت کے نظام میں بے نظیر ہیں۔ اسلامی قانون وراثت کا میلان یہی ہے کہ دولت کے بڑے فرق اور اختلاف کو روکا جائے پھر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دولت کا بہت سوں میں تقسیم ہونا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ گنتی کے کچھ لوگوں میں اس کا بڑا حصہ محدود ہو کر رہ جائے یہی وہ معاشی راز تھا جو دوسری قوموں کو معلوم نہ ہو سکا اسی وجہ سے ان کا قانون وراثت بھی نا تمام رہا اور دوسرے پہلو جنھیں اسلامی معاشیات نے اُجاگر کیا ان کی طرف لوگوں کی توجہ نہ ہوئی۔

وراثت کے بعد زرعی نظام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مسئلہ اراضی کے سلسلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ زمین کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے جس میں قوم کے ہر فرد کو بحصہ رسدی ملکیت کا حق حاصل ہے۔

اسلامی ماخذوں سے رسول کریمؐ کے عہد میں اراضی کے مسئلے کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پھر حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور اس سے بڑھ کر حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد میں جب کہ فتوحات کا سلسلہ دُور دُور تک پھیلتا چلا اُس وقت تقسیم اراضی کے جو پیچیدہ مسائل پیش آئے وہ بیان کیے گئے ہیں اور ان مسائل کا جو حل خلفائے راشدینؓ نے اُمت کے روبرو پیش کیا اس کی صراحت کی گئی ہے کہ انھوں نے کس طرح آئندہ نسلوں کا خیال رکھتے ہوئے اراضی کو تقسیم نہ کر کے زمینداری نظام کو رائج ہونے نہ دیا بلکہ زمین کو قوم کی مشترکہ ملک قرار دی لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اسلامی معاشیات شخصی تملیک کی قائل نہیں صحیح نہیں ہے اس لیے کہ مال غنیمت کی تقسیم فاروق اعظمؓ کے زمانے میں شخصی تملیک کی صورت میں ہوتی تھی نیز رسول کریمؐ نے بنو نضیر، قریظہ اور خیبر کی اراضی کو صحابہ میں تقسیم فرما دیا نیز خلفائے راشدین نے بھی چند ایک جاگیریں عطا فرمائیں پس معلوم ہوا کہ

تملیک ہو یا تقسیم اسلامی معاشیات ان دونوں کے متعلق اضافی رائے رکھتی ہے، تقسیم میں تسویہ اور تفضیل دونوں ضرورت اور موقع کے مطابق حکومت وقت کی صوابدید سے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔

تقسیم اراضی کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی نظام معیشت نے زمین سے دلچسپی پیدا کرانے اور زمین سے سونا اگلوانے کے لیے کاشت کاروں کو مالکانہ حقوق عطا کیے آخر میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشیات نے کس طرح میانہ روی کی حکمت عملی کو پیش کیا ہے جس میں خانگی املاک کے تصور کو پوری طرح دور کر کے زمین کو اشتراکیت کے نقصان سے بچایا زمین پر افراد کا حق ملکیت تسلیم کیا گیا ہے اور عام حالات میں ان میں کوئی مداخلت نہیں کی جاتی جب تک کہ زمین کے مالک حکومت کو مقررہ لگان ادا کرتے رہیں لیکن مفاد عامہ کا تقاضہ ہو تو حکومت معقول معاوضے کے بعد ضرورت کے لحاظ سے مداخلت کا اختیار رکھتی ہے۔

پھر مسئلہ لگان کو لیا، قدیم زمانے میں طائف اور مدینہ میں لگان ادا کرنے کے جو طریقے رائج تھے اور رسول اللہؐ نے اس میں جو ترمیم فرمائی اس کو واضح کیا گیا ہے۔ پھر خلفائے راشدین اور کچھ بعد کے زمانے کی مالگذاری کے نظام کو پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے بندوبست اراضی کے ایسے بہتر طریقے رائج کیے تھے کہ جن سے کاشت کاروں پر زیادہ بار نہ پڑے اور یہ وہی طریقے تھے جن کی آج مہذب سے مہذب حکومتیں بھی پیرو نظر آتی ہیں۔

پھر عشر اور خراج کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ خراج زمین سے اور عشر زراعت سے لیا جاتا ہے۔

آخر میں معاشی لگان اور اس کے حصہ داروں سے بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشیات کا یہ قانون ہے کہ جو زمین آب رواں یا آب باراں سے سیراب ہو اس کا دسواں حصہ ملک کے غریب طبقے کی امداد کے لیے حکومت حاصل کرتی ہے اور جو زمین آبپاشی کے

مصنوعی طریقوں سے سیراب ہوتی ہے اس میں بیسواں حصہ حکومت کا حق ہے
ریکارڈو کے جس نظریہ کا ذکر معاشی لگان کے ذیل میں کیا جاتا ہے
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی معاشیات نے کس وضاحت سے
اپنا حل پیش کیا ہے یعنے مالک زمین کی جانب سے محنت جس قدر
کم ہوتی ہے، اسی قدر قوم یا حکومت کا حصہ آمدنی میں زیادہ ہوتا ہے
معدنی دولت کے حصہ داروں۔ رائلٹی، جاگیرات اور
حمیٰ (اجارہ دمونوپولی) کی بحث میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اجارے کا
دولت کی تقسیم کو غیر مساوی بنا دینا جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے بعض
اوقات یہ صحیح نہیں ہوتا۔

پھر جنگلات اور دریاؤں وغیرہ کے بیان میں ظاہر کیا گیا ہے کہ
یہ قوم کی مشترکہ ملک شمار ہونے چاہئیں۔

اس کے بعد عصر جدید کے ایک اور اہم مسئلہ یعنی مسئلہ اجرت کی اہمیت
دکھائی گئی ہے اور عام طور پر پھیلے ہوئے خیالات کی تردید کی گئی ہے کہ
صنعتی انقلاب سے پہلے بڑے پیمانے پر کاروبار کا پتا تک نہ تھا۔

مسئلہ اجرت کی گتھی کو جس خوش اسلوبی سے سلجھایا گیا تھا، اس کو
پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ مزدوروں کی آسودہ حالی کے لیے
سر ولیم بیورج نے حال ہی میں جو انقلابی تجویزیں پیش کی ہیں اس کے
اچھے اصول آج سے تیرہ سو پچاس برس پہلے اسلامی نظام معیشت میں
عملی طور پر رائج تھے حضرت عمرؓ نے تو باقاعدہ تجربے کیے تھے، کہ ہر شخص
کے لیے ماہانہ کس قدر غذا درکار ہوتی ہے پھر اسی حساب سے روزینے
مقرر کیے تھے۔ آخر میں بتایا گیا ہے کہ آجر اور مزدور کے معاملات میں
دخل دینے کا اسلامی مملکت کو کس حد تک حق تھا۔

شراکت منافع کو مالی منفعت کا ایک اہم اور مستقل سرچشمہ
قرار دیتے ہوئے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ معمولی اجرت کے نظام کے
تحت نہ صرف مادی نقصانات بلکہ روحانی اور اخلاقی مضرتیں بھی مضمر ہیں۔

مسئلہ اجرت سے گزر کر ایک اور اہم مسئلے یعنی سود کے متعلق اسلامی نظریہ پیش کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ سود اور شرح سود کی تشریح اور تعین کے بارے میں خود معاشئین میں جتنا اختلاف رائے ہے اتنا اختلاف نظر معاشیات کے کسی دوسرے شعبے میں نہیں۔

سود کو اسلام ہی برا نہیں کہتا بلکہ یونان کا ارسطو، روما کے مقنن بھی ہندو اور یہودی مصلح بھی اور سب سے عجیب یہ کہ جدید ترین رجحانات ــــ کیمبرج اور امریکہ وغیرہ کے پروفیسروں میں ــــ سود کی حرمت ہی کی طرف مائل ہیں۔ پھر امام رازیؒ کے نظریے پیش کیے گئے ہیں اور آخر میں لارڈ کینز کے جدید ترین نظریوں کو پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ موجودہ معاشی تخیل رفتہ رفتہ اسلامی نظریے کی طرف گامزن ہو رہا ہے۔

اسلامی حکومت نے اگر ایک طرف اپنی قلمرو میں سودی لین دین کو ناروا قرار دیا تو دوسری طرف ساتھ ہی ساتھ بیت المال یعنے سرکاری خزانے سے بلا سود بالفاظ دیگر صفر شرح سود پر قرضے کا انتظام کیا تھا سود اور منافع کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ حسب حال کمی بیشی کے ساتھ نفع اور نقصان میں شرکت رہے تو سود کی صورت باقی نہیں رہتی جو کچھ ملتا ہے منافع ہوتا ہے اور منافعہ ہر طرح جائز ہے پھر کساد بازاری تجارتی بحران، حتیٰ کہ بیروزگاری کو بھی سودی کاروبار کی بدولت ثابت کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم میں اسی تمدن اور تہذیب کا مستقبل درخشاں رہے گا جو سود کو ناجائز قرار دے کر اس پر عمل بھی کرا رہا ہو۔

پھر اجرت تنظیم اور منافعہ کے مسئلے کو لے کر بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشیات نے آجر کے وجود کو تسلیم کیا ہے اور ہر شخص آزاد ہے کہ خود کاروبار کرے یا دوسروں کو اجرت پر رکھ کر کام لے منتظم کاروبار اپنی خدمات کا معاوضہ پانے کا ویسے ہی حق رکھتا ہے جیسے کہ مزدور اپنی محنت کے صلے میں اجرت پانے کا۔

تقسیم دولت کے ان تمام مباحث سے گزر کر اسلامی قلمرو میں تقسیم دولت کا جو اصول کارفرما تھا، اسے دکھا گیا ہے اس سلسلے میں رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد میں تقسیم دولت کے جو طریقے رائج تھے، ان پر یہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ معاش کے معاملے میں مساوات ہی کو بہتر سمجھتے تھے، لیکن فاروق اعظمؓ نے تقسیم دولت میں ترجیحی حقوق قایم کیے لیکن آخر زمانے میں نئے سال کا جو پروگرام بنایا گیا تھا، اس میں ایسی رائے اختیار کرلی تھی جو حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے سے ملتی جلتی تھی تسویۂ دولت کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، عزبت میں تسویہ یا تمول میں تسویہ ۔ فاروق اعظمؓ آخری صورت کے قائل تھے ۔

دیوان کی تفصیل پیش کرتے ہوئے دکھا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو عطائیں مقرر کی تھیں وہ گویا ایک اعلیٰ معیار، اور بہترین قسم کی بیورج اسکیم تھی۔ عطا کے اس سماجی تحفظ میں عربی اور عجمی چھوٹے بڑے آزاد اور غلام مرد عورت، دیہاتی اور شہری سب ہی شریک تھے ۔

غرض سرمایہ داری۔ پیدائش دولت پر زیادہ سے زیادہ زور دیتی ہے اور اشتراکیت، تقسیم دولت پر، لیکن اسلامی معاشیات پیدائش اور تقسیم دونوں پر یکساں زور دیتی ہے ۔

عطیات قدرت پر جب محنت، اصل اور تنظیم اپنا اپنا عمل کرتے ہیں تو اس سے دولت پیدا ہوتی ہے اب سوال یہ ہے کہ اسلامی احکام کے بموجب دولت، دولت پیدا کرنے والوں میں کس طرح تقسیم ہونی چاہیے؟ اسی طرح ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ قدرت کے بعض عطیے مثلاً ارضی دولت، معدنی دولت، بحری دولت، خاص کر جنگلات، سنگلاخ، تالابوں اور دریاؤں کے متعلق کیا اصول اختیار کیا جائے یعنے ان چیزوں کا مالک ایک ہی فرد ہوسکتا ہے یا تمام باشندگان ملک؟ پھر عطیات قدرت کی تقسیم کے علاوہ حکومتی تنظیم کے

مقررہ اور متوالی دولت مثلاً لگان، جزیہ، خراج، زکوٰۃ، عشر وغیرہ
یا غیر مقررہ اور موقتی دولت مثلاً وہ مال جو غنیمت یا رکاز سے حاصل ہوتا ہے
اس کی تقسیم اور نیز شخصی دولت، میراث جائداد وغیرہ جو کسی کے مرنے پر
اس کے وارثوں میں تقسیم ہوتی ہے ان تمام امور کے متعلق آئندہ فصلوں
میں ضروری مواد پیش کیا گیا ہے۔

تقسیم دولت کی اہمیت

کسی ملک میں دولت چاہے کتنی ہی افراط سے کیوں نہ پیدا ہوتی ہو، اگر اس کی تقسیم صحیح اصول پر نہ ہو تو ملک کی صلاح و فلاح نہیں ہو سکتی ہے۔ آج بھی دیکھیے ایک طرف اگر آپ کے سامنے ایسے ممالک ہیں کہ جہاں کے رہنے والے دولت کی قلت سے افلاس اور محتاجی کی زندگی گذار رہے ہیں تو دوسری طرف ایسے ممالک ہیں جن میں دولت کے سمندر موج زن ہیں لیکن اس کے باوجود تقسیم دولت چونکہ ان ملکوں میں صحیح اصول پر نہیں ہے اس لیے باشندوں کی اکثریت انتہائی غربت اور فلاکت کی مصیبت میں مبتلا ہے مثلاً انگلستان اور امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند ملک ہیں لیکن انگلستان میں تقریباً پچاس فی صدی ایسے بستے ہیں جنھیں مناسب غذا نہیں ملتی چنانچہ پروفیسر بنہام نے لکھا ہے کہ "حالیہ تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کے تقریباً آدھے گھرانوں کی اتنی حیثیت بھی نہیں کہ کم سے کم غذا جو انھیں بیماری سے بچا سکے حاصل کر سکیں[1]"

پروفیسر بنہام کا یہ بیان حالیہ جنگ سے بالکل تھوڑے ہی عرصہ قبل کا ہے جبکہ آبادی کا زیادہ سے زیادہ حصہ کاروبار میں لگا ہوا تھا، انگلستان اور ویلز میں تقسیم دولت کی جو حالت ہے اس سے متعلق کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر پیگو کا بیان معاشرتی اصلاح چاہنے والوں کے لیے ایک لمحۂ فکر مہیا کرتا ہے پروفیسر موصوف نے

---

[1] بنہام: اکنامکس باب ۴ صفحہ ۱۰۳

یہ اعداد دیے ہیں کہ "انگلستان اور ویلز میں ۲۵ یا اس سے زائد عمر والوں میں صرف ایک فی صدی لوگ (۶۰) فی صدی سرمایہ دولت کے مالک تھے، جبکہ دوسرے سرے پر کل آبادی کا تین چوتھائی حصہ جن کی عمر ۲۵ یا اس سے زائد تھی ۱۹۲۴ء سنہ ۱۹۳۰ء میں صرف (۵) فی صد سرمایہ دولت کے مالک تھے اگر اسباب خانہ داری فرنیچر اور شاید خانگی ملکیت کے مکانات اس سرمایہ دولت سے نکال دیے جائیں تو شرح فی صد ۵ فی صدی سے بھی کم ہو جائے گی[1]" اگر دولت صحیح اصول پر مستحقین میں تقسیم ہوتی تو کوئی شبہہ نہیں کہ اس ملک کے باشندوں کی اکثریت ایسے جان لیوا افلاس کے پنجوں میں گرفتار نہ ہوتی بہر حال اسی کا نتیجہ ہے کہ آبادی کا ایک طبقہ وجہی حصے بھی محروم ہو کر غم و غصہ میں مبتلا ہے اور غم و غصہ کے ان ہی جذبات نے اشتراکی اصول کی طرف لوگوں کے رجحانوں کو طبعی طور پر منتقل کرنا شروع کر دیا ہے اسلامی معاشیات نے تقسیم دولت کے جو اصول بتائے ہیں آئیے اب ہم ان پر غور کریں۔

اس سے پہلے کہ آگے بڑھیں گردش دولت کے ایک اسلامی قاعدے کا تذکرہ ضروری ہے واضح ہو کہ اسلامی معاشیات کا نقطۂ نظر اس باب میں یہ ہے کہ دولت کا بہت سے لوگوں میں گردش کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ چند کے پاس محدود رہے چنانچہ قرآنی آیت ہے کہ

...کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ۔ قرآن پ ۲۸ الحشر ۵ ع ۱ .... تاکہ (دولت) کی گردش صرف تمہارے مالداروں میں ہی نہ ہوا کرے۔

اسلامی معاشرہ میں دولت کی گردش کس اصول پر ہونی چاہیئے اسی کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ "اسلامی معاشیات کے پیش نظر یہ چیز رہی ہے کہ دولت کی ملک کے ہر طبقے میں تقسیم عمل میں آئے اور وہ یک جا اکھٹی نہ ہو بلکہ گردش کرتی رہے معیار سے زائد دولت پر لازمی محصول (یعنے زکواۃ) وصیت کرنے کے اختیارات کی تحدید اور کسی شخص کی جائداد سے اس کی وفات پر اس کے قریبی رشتہ داروں کو لازمی طور سے حصہ ملنا نیز غریبوں اور محتاجوں کے لیے حکومت کی آمدنی میں لازمی طور سے

---

[1] اے۔ سی۔ پیگو: سوشلزم درسز کیپٹلزم باب ۲ صد ۱۳

حصہ مقرر کیا جانا۔ یہ اور اس کے مماثل قاعدے قرآن مجید نے مقرر کیے ہیں جن سے تقسیم و گردش دولت کا مقصد پورا ہوتا ہے اور ساتھ ہی انفرادی ملکیت پر کسی قسم کی قید عائد نہ ہونے سے ہر شخص کو اپنے قوائے فطری سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی ترغیب بھی ہوتی رہتی ہے اور سود کی ممانعت اور قرضہ ہائے حسنہ کا انتظام جو جو قرآن مجید نے کیا ہے وہ اسلامی معاشیات کے قواعد کو ایک مکمل نظام کی حیثیت دیتے ہیں جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ اشتراکیت بلکہ اس میں ان دونوں کی خوبیاں ہیں اور ساتھ ہی دونوں کی برائیوں سے بھی اس نظام کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر دیا گیا ہے[1] اب شخصی دولت کی تقسیم سے متعلق بحث کی جاتی ہے۔

(ا) اسلامی قانون وراثت

وراثت کی اہمیت: - میراث وہ مال و جائداد ہے جو کسی کے مرنے پر خواہ شرعاً اس کے وارثوں پر تقسیم ہو یا وصیت کے ذریعے سے کسی اور کو ملے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ جانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ انھیں نادار چھوڑ دیا جائے اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں"[2]

چونکہ میراث کے قواعد مرنے والے اور زندہ رہنے والے دونوں کے لیے اہمیت رکھتے ہیں اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ان قاعدوں کو سیکھنے کے لیے زور دے کر فرمایا ہے کہ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوهَا النَّاسَ فَإِنَّهَا نِصْفُ الْعِلْمِ[3] مطلب یہ ہے کہ وراثت کے قواعد سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیونکہ وہ نصف علم ہے۔

تقسیم دولت میں وراثت کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ میراث کی

---

[1] - ڈاکٹر حمید اللہ؛ عہد نبوی میں نظام حکمرانی ج ۱ صفحہ ۱۴۲ باب قرآنی تصور مملکت بار اول جامعہ ملیہ دہلی

[2] - بخاری ج ۱ کتاب الصلوٰۃ عربی متن کے ساتھ حدیث مذکورہ حق کے بیان باب ۱۳ میں گذر چکی [3] سراجی ص ۲ مطبوعہ کانپور۔

غیر مساویانہ تقسیم ہی سے معاشرے میں عدم مساوات کی ابتدا ہوتی ہے" پروفیسر ٹاسگ اور ارونگ فشر اس بات پر ڈاکٹر کیانن کے ہمنوا ہیں کہ غیر مساوی میراث عدم مساوات کا ایک اہم سبب ہے[۱] پروفیسر ٹاسگ نے لکھا ہے کہ "میراث کا اثر بہت بڑا ہے، یہ بات عیاں ہے کہ صرف یہی چیز مالدار اور نادار کے درمیان ہمیشہ رہنے والی خلیج کو وسیع کرتی ہے[۲]" غرض "میراث، زمین اور اجارہ یہی تین طریق ہیں جن سے کافی محنت و کوشش کے بغیر بڑی بڑی دولتیں افراد کے ہاتھ آجاتی ہیں پس ان کی اس طرح پر اصلاح کرنی چاہیے کہ تقسیم دولت بہت زیادہ مساوی رہے[۳]" ان بیانوں سے تقسیم دولت میں وراثت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وراثت کے اسلامی اصول کی خوبی کے متعلق غیروں کا اعتراف

"دنیائے اسلام کو اسلامی قانون وراثت کے ان معاشی پہلوؤں کو ابھی منکشف کرنا ہے جس کو فان کریمر فقہ اسلام کے "بے انتہا جدت آمیز شعبے" سے تعبیر کرتا ہے[۴]"

مسٹر ریزے نے اپنی کتاب "محمڈن لا" کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے کہ "اسلام کا قانون وراثت زیادہ معقول اور مکمل اصول پر جو اب تک مہذب دنیا کو معلوم ہوئے مبنی ہے۔ اس کی خوبیاں اور اس کا تناسب ایسا ہے کہ یہ نہ صرف مقننین کے لیے قابل تحصیل ہے جن کو آئے دن اس فن کی ضرورت ہوا کرتی ہے بلکہ ان کے لیے بھی جو علم کو تعلیم کی خاطر حاصل کرنا چاہتے ہیں اور نیز ان لوگوں کے لیے بھی جن کا مطمح نظر عقلی تفریح ہے[۵]"

---

[۱] ۔ سر جوشیا ویجوڈ: اکنامکس آف ان ہیری ٹینس باب۳ صفحہ ۸۰۳ پینگوین سیریز
[۲] ۔ ٹاسگ پرنسپلز آف اکنامکس ج ۲ صفحہ ۲۴۶۔
[۳] ۔ پروفیسر الیاس برنی: علم المعیشت حصۂ سوم باب چہارم صفحہ ۲۶۷۔
[۴] ۔ مقالہ "ترکوں کا مذہب اور سیاست" از علامہ سر محمد اقبال مرحوم بحوالہ اخبار مملکت حیدرآباد دکن مورخہ ۷ر صفر ۱۳۶۲ھ م ۱۲ر فبروری ۱۹۴۳ء
[۵] ریزے: محمڈن لا صفحہ ۱۔

اسلامی قواعد کا عرب کے قدیم نظام سے تقابل

عرب کے قدیم معاشی نظام کے باب میں واضح کیا گیا ہے کہ جاہلی عرب کے باشندے اپنی بیٹیوں کو میراث نہیں دیتے تھے نیز متوفی کی بیوی نہ صرف ترکے سے محروم رہتی بلکہ کسی وارث کی میراث میں چلی جاتی تھی، اسی طرح متوفی کے چھوٹے لڑکے بھی ورثہ پانے سے محروم ہو جاتے تھے اور صرف بڑے بیٹے ورثہ پاتے اور بڑے بیٹے کی عدم موجودگی میں متوفی کا کوئی دوسرا رشتہ دار مثلاً باپ یا بھائی ورثہ پاتا کیونکہ وہ صرف ان ہی لوگوں پر ورثہ تقسیم کرتے جن میں دشمن سے جنگ کرنے کی صلاحیت ہوتی اور یہ لازمی نہ تھا کہ متوفی کی ذریت ہی ورثہ پائے۔

اگر کسی کو اولادِ نرینہ نہ ہوتی تو وہ کسی کو متبنیٰ بنا لیتا اور اپنی تمام دولت اس لے پالک کے لیے چھوڑ جاتا۔

اس نظام میں جو خامیاں ہیں وہ ظاہر ہیں یہ ایسا نظام تھا جس میں عورتوں کی کچھ حیثیت نہ تھی چونکہ اسلام امن و سلامتی لے کر آیا تھا اس لیے اُس نے ترکے کی تقسیم میں بجائے جنگی صلاحیت کے نسبی تعلق کا ایک دوسرا نقطۂ نظر اختیار کیا، اسلام نے قاعدہ قرار دیا کہ متوفی کی کوئی اولاد ورثہ پانے سے محروم نہ رہ جائے چاہے چھوٹی ہو کہ بڑی، چاہے مرد ہو یا عورت۔ اسی طرح اسلام نے بیوی کو بھی ترکہ پانے کا مستحق قرار دیا نیز چونکہ اس کو اپنی جائداد کا مختارِ کل قرار دیا ہے اس لیے اگر وہ چاہے تو اپنی جائداد میں سے ۱/۳ حصہ کی حد تک کسی کے نام وصیت کر سکتی ہے۔

اسی طرح اسلام نے مسلمانوں کو متبنیٰ بنانے سے روکا ہے کیونکہ لے پالک کو اس طرح دولت دے دینے سے خاندان محروم رہ کر دولت میں جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض حکم قرآن ہے کہ

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ۔	ماں باپ اور رشتہ دار جو چھوڑ جائیں اس میں مردوں کا حصہ ہے۔
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ۔	اور عورتوں کا بھی حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں۔

مِّمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۔ (پ۴ النساء ع۱) چاہے تھوڑا ہو، یا بہت ایک مقررہ حصہ ہے۔

عورتوں کو وراثت کا حق دینے پر ابتداءً میں لوگوں کا تذبذب

"جس وقت یہ آیت میراث نازل ہوئی کہ چھوٹے لڑکوں اور عورتوں کو بھی ورثہ پانے کا مستحق قرار دیا جائے تو لوگوں نے یا کم از کم چند لوگوں نے اس کو ناپسند کیا اور کہنے لگے کہ کیا ہم بیوی کو ¼ یا ⅛ دے دیں اور بیٹی کو ½ نصف دیں، اور چھوٹے لڑکوں کو ورثہ تقسیم کریں؟ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی جنگ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا اور نہ ان کے لیے مال غنیمت جائز ہے لہذا اس بات سے ابھی سکوت اختیار کرنا چاہیے ممکن ہے کہ رسول اللہؐ بھول گئے ہوں، یا ہم آپ سے کہیں گے کہ آپ اس کو تبدیل کر دیں اور چند لوگوں نے رسول خداؐ سے کہا بھی کہ اے اللہ کے رسولؐ! کیا ہم لڑکی کو آدھا حصہ دیدیں، جو اس کا باپ چھوڑ مرا ہے درآں حالیکہ وہ نہ تو گھوڑے کی سواری کرتی اور نہ دشمن سے لڑ سکتی ہے۔ اور کیا ہم بچے کو میراث دے دیں، حالانکہ وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا چنانچہ لوگ جاہلیت میں ایسا ہی کیا کرتے تھے، اور بڑے کو دیتے کیونکہ وہ بڑا ہوتا تھا[۱] اس سلسلے میں وہ قرآنی آیت نازل ہوئی جس میں بتایا گیا ہے کہ ورثہ پانے کے نہ صرف لڑکے مستحق ہیں، بلکہ لڑکیاں بھی ورثہ کا حق رکھتی ہیں۔

اسلامی قانون کا ارتقاء

ذیل میں ہم مختصر طور پر بیان کریں گے کہ کس طرح اسلامی قانون وراثت درجہ بدرجہ کمال کو پہنچا۔

"جب مہاجرین مدینہ میں آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اور انصار میں بھائی چارہ قایم کر دیا جس کے باعث مہاجر اپنے بھائی انصاری کا (اور انصاری اپنے بھائی مہاجر کا) وارث ہوتا تھا[۲] اور متوفی کا قریبی رشتہ دار

---

[۱] ۔ تفسیر طبری الجزء الرابع ص۱۷۱

[۲] ۔ بخاری پ۲۷ کتاب الفرائض بروایت ابن عباسؓ نیز تفسیر بیضاوی ج ا صفحہ ۳۲۴

اگر اس نے ہجرت نہ کی ہو، ورثہ پانے سے محروم رہتا تھا اس کا منشا غالباً یہ تھا کہ تمام مسلمان مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے آئیں یہ حکم اس آیت سے اخذ کیا جاتا تھا

اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا۔ (پ۱۰۔ الانفال ۸ ع۱۰)	جو لوگ کہ ایمان لائے اور خدا کی راہ میں ہجرت کی اور اپنے جان و مال سے جہاد کیا، اور وہ لوگ جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی تو وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو لوگ (صرف) ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی تو تمھیں ان کی دوستی سے کوئی کام نہیں جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔

پھر ورثہ میں توسیع ہوگئی اور مال اولاد (نرینہ) کو ملنے لگا لیکن پھر بھی والدین اور بیٹیوں کو دینا ہوتا تو وصیت کرنی پڑتی تھی کیونکہ والدین اور بیٹیوں کا حصہ ابھی مقرر نہیں ہوا تھا چنانچہ "ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ اسلام (کی ابتدا) میں یہ قاعدہ تھا کہ مال اولاد کا ہوتا تھا اور والدین کے لیے وصیت کرنی پڑتی تھی[۱]" یہ حکم اس قرآنی آیت کی بنا پر جاری تھا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ پ۲۔ البقرہ ۲ ع۲۲	مسلمانو! تمھیں حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کے مرنے کا وقت آجائے اور مال چھوڑے تو دستور کے موافق والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیت کر جائے۔ جو لوگ کہ خدا سے ڈرتے ہیں ان کے لئے یہ لازم ہے۔

لیکن جنگ بدر اور احد وغیرہ میں بہت سے صحابہ شہید ہوگئے جو وصیت نہ کر سکے اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ میراث کیونکر تقسیم کی جائے؟ اور اوس بن ثابتؓ کی بیوہ نے آنحضرتؐ سے عرض کی کہ ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا اور انھیں اور

---

[۱] بخاری پ۱۱ کتاب الوصیت نیز بخاری پ۲۷ کتاب الفرائض

ان کی چھوٹی بچیوں کو مرنے والے کی جائداد میں سے کچھ نہ ملا اس لیے کہ وہ پوری جائداد مرد وارثوں نے لے لی[1]۔ اسی طرح " جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ میری عیادت کو تشریف لائے، آپ کی تشریف آوری کے وقت میں بیہوش تھا، رسول کریمؐ نے وضو فرمایا اور بچا ہوا وضو کا پانی میرے اوپر چھڑکا جس سے مجھے ہوش آیا، میں نے عرض کی کہ یا رسولَ اللہ! میں اپنے مال کو کیا کروں ؟ اور اسے کیسے تقسیم کروں ؟ آنحضرتؐ نے کچھ جواب دیا یہاں تک کہ میراث کی آیت نازل ہوئی[2]۔

غرض قانون وراثت میں مزید توسیع ہوکر ہر ایک کا حصہ باقاعدہ مقرر کر دیا گیا" ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اسلام کی ابتدا میں (یہ قاعدہ تھا) مال اولاد کا ہوتا تھا اور والدین کے لیے وصیت کرنی پڑتی تھی، پھر اللہ نے اس حکم میں سے جس کو چاہا منسوخ کر دیا اور مرد کے لیے عورت سے دوگنا حصہ مقرر کیا اور ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ مقرر فرما دیا۔ بیوی کے لیے آٹھواں حصہ اور چوتھا حصہ شوہر کے لیے آدھا اور چوتھائی حصہ مقرر فرما دیا[3]۔

اسلامی قانون وراثت کی تفصیلات :۔ اب وہ قاعدے بیان کیے جاتے ہیں جن کی رو سے اسلام میں رشتہ داروں کے دعووں کو باریک بینی، بااصول اور منصفانہ طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ **اولاد کا حصہ** :۔ عام اصول یہ ہے کہ بیٹے کو بیٹی کا دوگنا حصہ ملتا ہے۔ اگر ایک ہی بیٹی ہو اور بیٹا نہ ہو تو اس کو نصف $\frac{1}{2}$ ملتا ہے مرنے والے کی اگر دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ہی ہوں اور کوئی بیٹا نہ ہو تو جملہ $\frac{2}{3}$ ملتا ہے۔ قرآن شریف میں حکم دیا گیا ہے کہ

(۱) يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ۔

خدا تمھاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابو داؤد، ترمذی ابن ماجہ، احمد نیز ابن سعد صفحہ ۲۸۲۔
[2] بخاری پ ۲۷ کتاب الفرائض نیز ابو داؤد پ ۱۲ کتاب الفرائض۔
[3] بخاری پ ۱۱ کتاب الوصیت نیز بخاری پ ۲۷ کتاب الفرائض۔

(۲) فَاِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۔ — اگر (متوفی کی) صرف لڑکیاں ہی ہوں دو سے زیادہ تو انھیں[1] متروکہ مال سے دو تہائی ملے گا

(۳) وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۔ پ۴ النساء ع۲ — اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا

۲ ۔ والدین کا حصہ :۔ والدین میں سے ہر ایک کو متروکہ مال کا چھٹا حصہ ملتا ہے جبکہ متوفی کو بیٹا یا پوتا ہو اگر بیٹا یا پوتا نہ ہو تو ماں کو صرف ایک تہائی ⅓ حصہ اور باپ کو باقی ملے گا۔ اگر متوفی کے کئی بھائی ہوں تو پہلی صورت کی طرح ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

(۱) وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۔ — اور اگر متوفی کے لڑکا ہو تو والدین میں سے ہر ایک کے لیے متروکہ مال میں سے چھٹا حصہ ہے۔

(۲) فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۔ — اگر متوفی کا کوئی بیٹا نہ ہو اور صرف والدین ہی وارث ہوں تو ماں کو تہائی حصہ ملے گا۔

(۳) فَاِنْ كَانَ لَهٗ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۔ پ۴ النساء ع۲ — پھر اگر متوفی کے کئی بھائی ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا (یہ تقسیم) متوفی کے قرض کی ادائی اور وصیت کے نفاذ کے بعد (عمل میں آئیگی) تمھیں نہیں معلوم کہ تمھیں تمھارے باپ یا بیٹے سے کون زیادہ فائدہ پہنچائیگا۔ یہ خدا کا مقرر کردہ ہے اور بے شک خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

۳ ۔ شوہر کا حصہ :۔ شوہر کو ½ نصف ملتا ہے جبکہ بیوی کا کوئی بیٹا یا پوتا نہ ہو اور اگر بیٹا یا پوتا ہو تو ¼ چوتھا حصہ ملے گا۔

---

[1] ۔ نوٹ ۔ زید بن ثابت رض جو صحابہ کرام میں علم فرائض کے ماہر تھے کہتے ہیں کہ "دو اگر دو بھی ہوں تو انھیں دو تہائی ہی ملے گا" بخاری پ۲۷ کتاب الفرائض باب: والدین کے مال میں بیٹے کی میراث ۔

(۱) وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۔

اور تمھاری بیویاں جو چھوڑ جائیں اس میں سے تمھیں نصف ملے گا بشرطیکہ اُن کی کوئی اولاد نہ ہو ۔

(۲) فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۔
پ۴ النساء ۴ ع۳

اور ان کی اولاد ہو تو تمھیں ان کے متروکہ مال سے چوتھا حصہ ملے گا اور (یہ تقسیم بھی) ان کی وصیت اور ان کا قرض ادا ہونے کے بعد ہی نافذ ہوگی

۴۔ بیوی کا حصہ :۔ اسی طرح بیوی کو ۱/۴ چوتھا حصہ ملے گا جبکہ شوہر کا کوئی بیٹا یا پوتا نہ ہو اور اگر بیٹا یا پوتا ہو تو اس صورت میں ۱/۸ آٹھواں حصہ ملے گا۔

(۱) وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۔

اور تمھاری بیویوں کو چوتھائی ملے گا جو تم چھوڑ جاؤ بشرطیکہ تمھاری کوئی اولاد نہ ہو ۔

(۲) فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۔
پ۴ النساء ۴ ع۳

اگر تمھاری کوئی اولاد ہو تو انھیں جو بھی تم نے چھوڑا ہے اس میں سے آٹھواں حصہ ملے گا ۔ اور یہ تقسیم بھی تمھاری وصیت اور تمھارے قرض کی ادائی کے بعد ہی نافذ ہوگی ۔

۵۔ کلالہ کے وارثوں کے حصے :۔ کلالہ اُس شخص کو کہتے ہیں جس کا نہ کوئی بیٹا ہو اور نہ اس کا باپ زندہ ہو[۱]

(۱) کلالہ کے وارثوں میں اگر اس کا کوئی بھائی یا کوئی بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک چھٹا حصہ پائے گا ۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ

اگر کوئی مرد یا عورت کسی کلالہ (لاولد شخص) کا وارث ہو اور اُس کا کوئی بھائی یا بہن ہو تو اُن میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا ۔

---

[۱] ۔ قال ابن عباسؓ : الْكَلَالَةُ مَنْ لَا وَلَدَ وَلَا وَالِدَ (تفسیر طبری ج ۴ صفحہ ۱۷۸)

(۲) اگر کلالہ کے ورثاء زیادہ ہوں تو وہ تہائی مال میں شریک ہوتے ہیں۔

فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۔ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۔

اگر (یہ بھائی بہن) زیادہ ہوں تو وہ سب تہائی مال میں شریک ہیں (یہ تقسیم بھی) (متوفی کی) وصیت اور قرض کی ادائی کے بعد ہی نافذ ہوگی ۔ بشرطیکہ وصیت والوں کو ضرر پہنچانے والی نہ ہو ۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اللہ جاننے والا اور بردبار ہے۔

پ۴ النساء ۴ ع ۳

کلالہ کے وارثوں کے حصوں کی سورۂ نساء کے آخری حصے میں مزید تشریح کی گئی ہے

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۔

(اے نبی) تم سے لوگ فتوی طلب کرتے ہیں تم کہدو کہ خدا تمھیں کلالہ کے بارہ میں فتویٰ دیتا ہے (وہ یہ ہے کہ)

(۱) اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۔

اگر کوئی ایسا شخص مرجائے جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اسے متروکہ مال کا نصف ملے گا۔

(۲) فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۔

اگر دو ہوں تو متروکہ مال میں سے دو تہائی ملے گا۔

(۳) وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۔ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔

اگر وہ (وارث) کئی مرد اور عورتیں ہوں تو مرد کو دو عورتوں کے حصے کے برابر حصہ ملے گا۔ اللہ نے ظاہر کردیا تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر ایک چیز سے واقف ہے۔

پ۶ النساء ۴ ع ۲۵

مذکورۂ بالا قرآنی احکام نیز حدیثوں اور خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں کی روشنی میں فقہاء اسلام نے قانون وراثت کو جس دقیقہ رسی سے مرتب کیا اسے مختصر طور پر یہاں بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) جب کوئی شخص مال اور جائداد چھوڑ جاتا ہے تو سب سے پہلے

اس مال کو مرنے والے کی تجہیز و تکفین کے اخراجات پر صرف کیا جاتا ہے۔ تجہیز و تکفین کے اخراجات نہ تو حد سے زیادہ ہونے چاہئیں اور نہ حد سے کم (مِنْ غَیْرِ تَبْذِیْرٍ وَلَا تَقْتِیْرٍ)[1]

(۲) پھر جو کچھ مال اور جائداد باقی رہے اس سے متوفی کے قرضے اگر ہوں تو انھیں بے باق کر دینا چاہئے۔ بیوی کا مہر بھی اسی میں داخل ہے۔

(۳) قرضہ ادا ہونے پر باقی مال میں ثلث کی حد تک متوفی کی وصیتوں کا نفاذ ہوگا اس کے بعد جو مال اور جائداد باقی رہے اس کو وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا اگر کوئی وارث نہ ہو تو مال بیت المال (سرکاری خزانے) میں داخل ہو گا۔[2]

اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ :۔ اسلامی قانون وراثت "الاقرب فالاقرب" کے اصول پر مبنی ہے یعنے متوفی سے جو رشتہ دار جتنا سب سے زیادہ قریبی تعلق رکھتا ہے اتنی ہی اس کو وراثت کے حق میں ترجیح ہوگی مثلاً اگر متوفی کے باپ اور دادا ہوں تو باپ کو دادا پر ترجیح دی جائے گی اسی طرح اگر بیٹا اور پوتا ہو تو بیٹے کو پوتے پر ترجیح ہوگی۔

اس اصول کو سامنے رکھ کر حنفی فقہاء نے وارثوں کو تین گروہ (گروپ) میں تقسیم کیا ہے۔[3]

---

[1] ۔ سراجی صفحہ ۲۔ [2] ۔ تفصیل کے لیے سراجی صفحہ ۴ ملاحظہ ہو۔

[3] ۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے ورثاء کے صرف دو گروہ قرار دیے ہیں عصبہ اور ذوی الفروض۔ کیونکہ قرآن مجید نے واضح طور پر ذوی الارحام کے حقوق کا ذکر نہیں کیا اس لیے وہ ذوی الارحام کو حق وراثت نہیں دیتے بلکہ اس کے بعد ہی مال بیت المال میں داخل ہو جاتا ہے "خلیفہ معتضد باللہ کے زمانے تک ذوی الارحام یا اناث کے ذریعے کے رشتہ دار کسی شخص متوفی کی جائداد سے حصہ نہیں پا سکتے تھے بلکہ عصبات کے موجود نہ رہنے پر جائداد متوفی بحق خلیفہ ضبط ہو جاتی تھی۔ معتضد نے ضبطی کا محکمہ موقوف کر کے حکم دیا کہ اگر کسی میت کے ذوی الفروض و عصبات موجود نہ ہوں تو متوفی کی جائداد اس کے ذوی الارحام کو ملا کرے نہ کہ خلیفہ کو" (اصول شرع محمدی سید امیر علی صفحہ ۳) نیز تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۱۵۔

(۱) ذوی الفروض یا اصحاب الفرائض :۔ یہ وہ رشتہ دار ورثار ہیں جن کے حصے قرآن مجید نے معین کر دیے ہیں۔

(۲) عصبات :۔ یہ دوسرے گروہ کے رشتہ دار ہیں جن کے حصے کی مقدار قرآن مجید نے مقرر نہیں کی۔ ذوی الفروض اپنا مقررہ حصہ پانے کے بعد جو مال بچتا ہے وہ عصبات لے لیتے ہیں اور بعض صورتوں میں مثلاً پہلے گروہ کی عدم موجودگی میں کل مال پا لیتے ہیں بیٹا بھی گو عصبہ ہی شمار ہوتا ہے کیونکہ اس کے حصے کی مقدار معین نہیں ہے لیکن حقیقت میں وہ سب سے بڑا وارث ہوتا ہے اور اس کو فوقیت اور برتری اس طرح دی گئی ہے کہ اس کی موجودگی میں ذوی الفروض بہت کم حصہ پاتے ہیں بلکہ بعض تو بالکل محروم ہی ہو جاتے ہیں۔

(۳) ذوی الارحام :۔ یہ تیسرے گروہ کے ورثار ہیں، اگر متوفی کے پہلے اور دوسرے گروہ کے ورثار نہ ہوں تو ذوی الارحام میراث پاتے ہیں، ذوی الارحام اور متوفی میں عموماً درمیان میں کسی عورت کے ذریعے سے رشتہ داری ہوتی ہے مثلاً بیٹی کا بیٹا یعنے نواسا، بہن کا بیٹا یعنے بھانجا، والدہ کی ماں یعنے نانی وغیرہ

وراثت سے محرومی :۔ ذیل کی صورتوں میں وارث اپنے مورث کا ورثہ پانے سے محروم ہو جاتا ہے۔

۱۔ قاتل :۔ اگر کسی شخص کو اس کا وارث ناحق قتل کر دے خواہ عمداً خواہ خطاً تو شریعت اسے ورثہ پانے سے محروم کر دیتی ہے اس حکم سے شریعت کا یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ وارث مال و جائداد کے لالچ میں اپنے مورث کو قتل نہ کرے۔

۲۔ اختلاف مذہب :۔ متوفی اور اس کے وارث کا مذہب اگر الگ ہو تو وارث ورثہ پانے سے محروم ہو جاتا ہے، اس کی تشریح میں ایک مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ قرآن مجید کی رو سے ایک مسلمان ایک اہل کتاب (یہودی، عیسائی) عورت سے شادی کر سکتا ہے[1] شوہر مسلمان ہو اور اس کی بیوی عیسائی یا یہودن ہو تو وہ ورثہ پانے سے محروم ہو جاتی ہے لیکن اگر شوہر اس کے نام

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو قرآن مجید پ۶ ع۱۔

وصیت کرے تو اس کی تعمیل ہوگی۔

اس طرح مسلمان شوہر اگر صرف اس عیسائی یا یہودی عورت کے مال اور جائداد کی خاطر اس پر فریفتہ ہوا ہے تو وہ اس مال کے پانے سے محروم ہوگا۔ غرض "مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا"[1] اس پر فقہائے اسلام کا اتفاق ہے۔

۳۔ اختلاف دارین :۔ متوفی کا وارث اگر دارالحرب (یعنی غیر اسلامی قلمرو) میں رہ پڑا ہو تو ایسی مستقل سکونت اس کو وراثت سے محروم کردیتی ہے چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو گویا ایک طرح سے جدید ترین زمانے کے انٹرنیشنل لا کے قریب قریب اسلام کا یہ قانون ہے جس کا مقصد یہی ہے کہ اسلامی مملکت کی دولت غیر اسلامی مملکت میں نہ چلی جائے اگر عارضی طور پر اسلامی قلمرو سے غیر اسلامی قلمرو میں سیاحت و تجارت وغیرہ میں سے کسی غرض سے کوئی شخص جائے تو اس پر یہ قانون جاری نہ ہوگا۔ ابتدا میں مسلمان مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے جو شخص ہجرت نہ کرتا وہ اپنے وارث کے ورثہ پانے سے محروم ہو جاتا اس کا مقصد یہ تھا کہ یوں مالی دباؤ کے تحت مسلمان ایک مرکز پر اکھٹے ہو جائیں۔ نیز دشمن کے علاقے میں اس کے وراثتی مال کا پہنچانا آسان بھی نہ تھا

وصیت :۔ ہر شخص اپنی زندگی میں اپنے مال اور جائداد کا ایسا مالک اور مختار ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے یا جس کو چاہے اپنا مال دے دے[2] لیکن مرنے سے پہلے مرض کی حالت میں دوسرے کے نام کوئی چیز اگر دی جائے جس کا اصطلاحی نام وصیت ہے اس وقت بھی مالک کو اپنی جائداد کے لینے دینے کا وہی اختیار رہتا ہے یا نہیں یا دوسرے الفاظ میں مرنے والا اپنی جائداد کے متعلق جس کے نام سے جو کچھ وصیت کرکے مرجائے تو اس کی یہ وصیت نافذ ہوگی یا نہیں۔ قرآن مجید سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وصیت کو نافذ ہونا چاہیے لیکن یہ بات کہ کن کن لوگوں کے لیے کس حد تک یہ وصیت نافذ ہوگی قرآن

---

[1] بخاری پ ۲۷ کتاب الفرائض

[2] ہدایہ ج ۴ کتاب الوصایا صفحہ ۳۳۷

اس سے ساکت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے شارح کی حیثیت سے اس کی تشریح فرمائی کہ وصیت کا نفاذ صرف ثلث مال کی حد تک ہوگا نیز وراثت کی راہ سے جو لوگ حصہ پانے کا حق رکھتے ہوں ان کے حق میں وصیت کا نفاذ نہ ہوگا۔[1]

ثلث مال ہی کی حد تک وصیت کے نفاذ کو کیوں محدود کیا گیا ہے حدیث کی کتابوں میں رسول کریمؐ سے یہ حدیث لکھی گئی ہے کہ "حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ حجۃ الوداع کے سال میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے عرض کی کہ مرض کی روزافزوں شدت سے میری یہ حالت ہو گئی ہے میں مالدار ہوں اور میرا وارث ایک بیٹی کے سوا اور کوئی نہیں۔ تو کیا میں اپنے مال کی دو تہائی خیرات کر دوں ؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کی کیا نصف ؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کی کیا ایک تہائی؟ آپ نے فرمایا ہاں ایک تہائی اور ایک تہائی بھی بہت ہے۔ تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ انھیں نادار چھوڑ جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں"[2]

فقہاء اسلام نے مذکورہ حدیث کی روشنی میں وصیت کے لیے انتہائی حد تہائی مال قرار دی ہے اگر زیادہ ہو تو وہ اس کو کالعدم قرار دیتے ہیں[3] یوں کوئی ایک ثلث سے زیادہ دولت وصیت کے ذریعے سے منتقل کرنے کا شرعاً اختیار نہیں رکھتا۔ حضرت ابن عباسؓ جو کہ رسول اکرمؐ کے چچازاد بھائی اور علم وراثت کے ماہر سمجھے جاتے تھے کہتے ہیں کہ "کاش! لوگ (وصیت میں)

۱۔ تفصیل ھدایہ ج ۴ کتاب الوصیت

۲۔ بخاری پ ۵ کتاب الصلواۃ نیز پ ۱۱ کتاب الوصیت پ ۱۸ حجۃ الوداع نیز پ ۲۴ کتاب الفرائض اس حدیث کے مزید حوالے اس سے پہلے گذر چکے ہیں۔

۳۔ قال : ولا تجوز بما زاد علی الثلث بقول النبی علیہ السلام فی حدیث سعد بن ابی وقاص الثلث والثلث کثیر۔ ھدایہ کتاب الوصایا ج ۴ صفحہ ۸۵۰ مطبوعہ نول کشور پریس۔

ربع ۱/۴ تک آجاتے کیونکہ رسول کریمؐ نے فرمایا تھا کہ ثلث (کا کچھ مضائقہ نہیں) اور ثلث بھی بہت زیادہ ہے[۱]

وصیت کے استحقاق کے ذریعے سے اسلامی قانون وراثت میں لچک پیدا کی گئی ہے اگر کسی مالدار کو معلوم ہو کہ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار ورثہ پانے سے محروم ہو رہا ہے تو متوفی اس کے لیے وصیت کر سکتا ہے مثالاً اس کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ ایک متوفی کے دو بیٹے تھے ان میں سے ایک بیٹا کچھ اولاد چھوڑ کر باپ کی زندگی میں مر گیا قانون وراثت کی دفعہ "الاقرب فالاقرب" کی رو سے زندہ بیٹے کو باپ کی پوری جائداد مل گئی اور متوفی بیٹے کی اولاد ورثہ سے محروم ہو گئی چنانچہ شخص مذکور اپنے متوفی بیٹے کی اولاد کے لیے وصیت کرنے کا اختیار رکھتا اور اپنے اختیار تمیزی سے کام لے سکتا ہے۔

غیر مسلموں کے لیے وصیت:- اسلامی قانون وراثت کی رو سے ایک مسلمان کسی کافر کا اور کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا لیکن وصیت کر سکتا ہے چنانچہ صاحب ھدایہ لکھتے ہیں کہ "جائز ہے کہ کافر کے لیے مسلمان اور مسلمان کے لیے کافر وصیت کرے" اس کی وجہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ "پہلی وجہ یہ ہے کہ

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔

پ ۲۸ الممتحنہ ۶۰ ع ۲

خدا تعالیٰ ان لوگوں سے جو دین کے بارے میں تم سے لڑے نہیں اور تمہارے گھروں سے تمہیں نہیں نکالا ان کے ساتھ بھلائی کرنے اور انصاف برتنے سے منع نہیں کرتا اور خدا انصاف کرنے والوں کو چاہتا ہے۔

"دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا عہد کرنے سے معاملات کی حد تک وہ مسلمانوں کے مساوی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں جس طرح زندگی میں جانبین آپس میں سلوک کرتے ہیں اسی طرح موت کے بعد بھی کر سکتے ہیں[۲]"

۱۔ بخاری پ ۱۱ کتاب الوصیت۔ ۲۔ ھدایہ کتاب الوصایا ج ۴ صفحہ ۶۳۳۔

اسلام کے معاشی نظام کا عام رجحان یہ ہے کہ دولت کی تقسیم اور گردش زیادہ سے زیادہ عمل میں آئے اس کی وجہ سے بینرجی کے الفاظ میں "یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر شخص کو کاروبار آغاز کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے، صنعتی نقطۂ نظر سے یہ ایک بہت بڑی سہولت بہم پہنچاتا ہے، ترکہ کا چھوٹا ہونا جو حق داروں میں جائداد کو مساویانہ طریقے پر تقسیم کرنے کا عام نتیجہ ہے بجائے خود اس بات کا محرک ہے کہ راحت و آرام کے عادتی معیار کو برقرار رکھنے کے خیال سے اس ترکہ میں اور اضافہ کی کوشش کی جائے"[1]

سب لڑکوں کو مساوی دولت :- اسلامی قانون وراثت کی رو سے سب لڑکوں کو مساوی حصہ ملتا ہے اور بڑے بیٹے کو دوسرے بیٹوں پر ترجیح نہیں ہے فرزند اکبر کے لیے کسی ترجیحی حق کی عدم موجودگی اصول مساوات اور منصفانہ تقسیم کے سراسر مطابق ہے، اس قانون کا میلان یہی ہے کہ دولت اور رتبوں کے بڑے فرق و اختلاف کو پیدا ہونے سے روکا جائے اور متوسط طبقہ کے افراد کی تعداد میں معقول اضافہ کیا جائے۔

عورتوں کو حق وراثت :- اسلامی قانون وراثت کی رو سے عورتیں بھی ورثہ پاتی ہیں چنانچہ متوفی کی بیٹیوں بیوی اور ماں کو ورثہ ملتا ہے اور ان عورتوں کے نہ ہونے کی صورت میں دادیوں نانیوں پوتیوں اور نواسیوں کو بھی ورثہ ملتا ہے۔

وصیت کے ذریعے اسلامی قانون وراثت میں مزید لچک رکھی گئی ہے اور پھر وصیت کی حد بندی اس طرح کی گئی ہے کہ صرف تہائی مال ہی کی حد تک وصیت نفاذ کے قابل ہو سکتی ہے اور اس سے زیادہ میں نہیں۔

اسلامی قانون وراثت کے سلسلے میں اسلامی قانون وقف علی الاولاد کا تذکرہ بھی ضروری ہے جس کی رو سے جائداد غیر منقولہ کو ٹکرے ٹکرے ہونے سے بچایا جا سکتا ہے آمدنی تقسیم ہوتی رہتی ہے لیکن جائدادجوں کی توں برقرار رہتی ہے

وراثت کے مختلف قوانین کا اسلامی قانون سے تقابل وراثت کے قوانین ہر ملک اور ہر مذہب میں جداگانہ ہیں۔ ایک ہی چھوٹے سے ملک برطانیہ میں

---

[1] بینرجی: انڈین اکنامکس صفحہ ۴۸

اسکاٹ لینڈ کے قوانین وراثت الگ ہیں اور انگلستان کے الگ فرانس جو انگلستان کے ساحل کے مقابل واقع ہے اس کے اور انگلستان کے قوانین وراثت میں زمین و آسمان کا سا فرق ہے چنانچہ "انگلستان کے قانون کی رو سے ایک انگریز اپنی آخری وصیت اور دستاویز کے ذریعہ اپنی کل جائداد جس کو دینا چاہے دے سکتا ہے[1] اور فرانس میں قانون نپولین (کوڈ نپولین) کی رو سے اپنی اولاد کے لیے بھی کچھ نہ کچھ چھوڑ جانا ضروری ہے اور اولاد کی تعداد کے لحاظ سے وصیت گھٹتی بڑھتی ہے روس میں سرے سے وراثت ہی کو ختم کر دیا گیا ہے مشرقی ملکوں میں الگ الگ وراثت کے قوانین جاری ہیں ان سب باتوں پر بحث اور تنقید ایسی ہی مستقل خامہ فرسائی چاہتی ہے جیسی کہ اس زمانے میں سر جوشیا ویجوڈ نے صرف یورپی قوانین خاص کر انگلستان کے قانون وراثت اور تقسیم دولت پر اس کے اثرات کی بحث پر ایک پورا مقالہ[2] لکھ کر داد نکتہ سنجی دی ہے۔

غرض" وراثت کے متعلق یورپ میں بالعموم" حق اولاد اکبر" کا قانون رائج ہے یعنے بڑا لڑکا کل ورثہ کا مالک ہوتا ہے اور باقی اولاد کو اپنا سہارا خود پیدا کرنا پڑتا ہے اس طرح کل دولت چند لوگوں کے پاس جمع رہتی ہے اور باقی لوگ محض اپنے قوت بازو سے دولت اور روزی کماتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ امریکہ، آفریقہ اور آسٹریلیا میں نئی بستیاں بسانے والے اور کاروبار پھیلانے والے اکثر اونچے گھرانے کے اولوالعزم نوجوان ہیں جو ورثے سے محروم رہ کر آبرو برقرار رکھنے کی خاطر محنت اور جفاکشی پر مجبور ہو گئے یہ طریق کتنا ہی خلاف انصاف بلکہ خلاف انسانیت معلوم کیوں نہ ہو اس سے دولت میں اجتماع ضرور پیدا ہوتا ہے اور اگر اولوالعزمی ہو تو لوگ کاروبار میں کوشش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تاہم ظاہر ہے کہ یہ طریق تقسیم دولت میں عدم مساوات کا مؤید بلکہ بانی ہے۔"

"اس باب میں اسلامی قانون بہت جامع نظر آتا ہے اس کی رو سے ترکہ

---

[1] - سر جوشیا ویجوڈ اکنامک آف ان ہیریٹنس باب ۲ صفحہ ۹

[2] - اکنامک آف ان ہیریٹنس

نہ صرف کُل اولاد کو ملتا ہے بلکہ عزیز و اقربا تک پہنچ سکتا ہے، جس قدر یورپ میں وراثت کی تقیید ہے اسی قدر اسلام میں اس کی تقسیم ہے، اس صورت میں وہ عدم مساوات جس سے یورپ روز بروز تنگ آرہا ہے اور جس کو رفع کرنے کے لیے سوشیلزم نمودار ہوا بہت کم جاگزیں ہو سکتی ہے، بڑی سے بڑی جائداد حصوں میں تقسیم ہوتے ہوتے کچھ بھی نہیں رہتی اور بالآخر لوگ اپنی قوت بازو پر آرہتے ہیں اولوالعزمی شرط ہے، اس طریق میں بھی کاروباری ترقی کی دعوت دی گئی ہے مگر دوسری طرز پر یعنے سب کو محروم کرکے کُل دولت ایک کے سپرد کرنے کے بجائے سب کو تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دینا تاکہ وہ اس پر قناعت بھی نہ کر سکیں اور اس کے سہارے سے کام بھی شروع ہو سکے اور کوئی شخص اجتماع دولت کی وجہ سے بیکاری اور عیش پرستی میں بھی مبتلا نہ ہو، کثرت تقسیم سے جو اندیشہ ہوتا تھا کہ بڑے پیمانے پر کاروبار چلانے دشوار ہوں گے مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کے رواج سے وہ اندیشہ بھی رفع ہو گیا اور موقع اور ہمت ہو تو اس طریق میں کاروباری ترقی کی بہت تاکید اور گنجائش موجود ہے اور دوسرے اعتبار سے بھی جس قدر قرین انصاف و مروت ہے ظاہر ہے۔"

"ہندوؤں کے قانون وراثت یورپ کے بالکل برعکس ہیں اس میں عدم مساوات کی بہت کچھ روک تھام کی گئی ہے اور جدید سوشیلزم کی صاف جھلک نظر آتی ہے، موروثی ملک و جائداد خاندان کا مشترکہ سرمایہ شمار ہوتی ہے، سب اراکین خاندان کی آمدنی اور خرچ بھی مشترکہ رہتا ہے اس طرح اگرچہ ہونہار اور کارگذار اراکین پر زیادہ بار پڑتا ہے لیکن بیکار اراکین کی بھی خاندان کے ساتھ گذر ہو جاتی ہے اور محتاج خانوں اور یتیم خانوں کی بہت کم ضرورت باقی رہتی ہے ہندو قانون کے دو بڑے طریق میں متکشرا اور دیا بھاگ، اول کے مطابق خاندان میں لڑکوں کا حق زیادہ باا‌ثر ہے اور خاص صورتوں میں وہ تقسیم جائداد کا بھی مطالبہ کر سکتے ہیں، دوسرے طریق میں باپ کا حق اور تصرف بہت وسیع ہے اور اس کے سامنے لڑکوں کی بہت کم چلتی ہے، متکشرا قانون ہندوستان کے اکثر حصوں میں رائج ہے اور دیا بھاگ خاص کر بنگال میں ہے۔"

"ہندو قانون میں تقسیم دولت کا طریق تو بُرا نہیں لیکن اشتراک کی وجہ سے پیدائش دولت میں سستی اور بددلی کا احتمال ضرور ہے اس کے برعکس یورپین قوانین ورثہ میں پیدائش دولت کے لیے تو کافی تحریک موجود ہے لیکن تقسیم دولت اطمینان بخش نہیں اسی کی بدولت وہاں آئے دن طرح طرح کی بے چینی نمودار ہوتی رہتی ہے اسلامی قانون نے تقسیم دولت کی مساوات اور پیدائش دولت کی آزادی کو ساتھ ساتھ نبھایا ہے یعنے جو کوئی جس قدر کمائے وہی اس کا مالک رہے دوسرے کو اس میں حصہ پانے کا حق نہیں لیکن بعد کو کل ملک وارثوں میں تقسیم ہو جانا یقینی ہے گویا دولت ایک سمندر ہے بڑی بڑی موجیں اٹھتی ہیں اور پھر خود ہی گر کر سطح سے آملتی ہیں یہی تموج اور چڑھاؤ اُتار تمدن کی حیات اور صحت ہے ورثہ میں لڑکوں کا حق تو کم و بیش ہر کہیں تسلیم ہے لیکن اسلامی قوانین نے مستورات کو بھی اس قدر وسیع اور آزاد حقوق دیے ہیں کہ ان کی مثال کم نظر آتی ہے غرض یہی ہے کہ دولت قوم میں بکثرت اور بہ سرعت گردش کرے گویا کہ خون جسم میں رواں دواں ہے اور یہی صحت کی اول و آخر شرط ہے۔ شاعر یہ کہہ سکتا تھا ؎

رکاؤ خوب نہیں مال کو روانی ہیں ❊ کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی میں[1]

غرض" وراثت کے قاعدے جو اسلام نے مقرر کیے ہیں وہ تمام دنیا کے قواعد وراثت سے الگ ہیں اور ایسے دقیق اور نازک اصول پر مبنی ہیں جو علانیہ اس بات کی دلیل ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی ان احکام کا واضع نہیں ہو سکتا۔ وراثت کا اصلی اصول یہ ہے کہ متوفی اگر جائداد کسی خاص شخص کو دے جاتا تو اسی کو ملتی لیکن جب اس نے کوئی ہدایت نہیں کی تو اس پر لحاظ ہوگا کہ اس کے فطری تعلقات کن کن لوگوں کے ساتھ کس کس تفاوت کے ساتھ تھے جو لوگ یہ تعلقات رکھتے تھے وہ اسی تفاوت درجات کے ساتھ اس کی جائداد کے مالک ہوں گے گویا متوفی کی یہ معنوی ہدایت ہے کہ لوگوں کو اسی مناسبت سے دیا جائے جس نسبت سے میرے تعلقات اُن کے ساتھ تھے۔ دوسرا اصول جو پولیٹیکل اکانمی کا عام اصول ہے

---

[1] - پروفیسر الیاس برنی صاحب: معیشت الہند صفحہ ۲۴۴ باب سوم دولت اور اس کے حصہ دار۔

یہ ہے کہ دولت کا بہت سے اشخاص میں تقسیم ہونا اس سے اچھا ہے کہ دو ایک شخص تک محدود رہے۔ یہ عمدہ اصول تمام اور قوموں کی نگاہ سے رہ گئے اور اس وجہ سے ان کا قانون وراثت بھی ناتمام اور محدود رہ گیا ...... [1]

(۲) مسئلہ اراضی

الف تقسیم اراضی

مختصر تاریخی سرگزشت اگر گذشتہ دو صدی کی معاشی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں معاشی جد و جہد کا سب سے بڑا سبب اراضی یا زمین کا حاصل کرنا تھا خواہ امریکہ یا کناڈا کو لیجیے خواہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو ان ملکوں میں یورپ کے باشندے اپنا گھر بار چھوڑ کر اسی لیے آباد ہوئے کہ وہ ان ملکوں کی وسیع اراضی پر قبضہ کر سکیں، یہ نوآبادکار جو ان ملکوں میں آباد ہوئے ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کے پاس اپنے ملک میں ان کی ضرورت کے لحاظ سے یا تو کافی زمینیں نہ تھیں یا وہ پورے طور پر محروم تھے دوسرے طبقے کی حیثیت محض مزدوروں یا کاشت کاروں کی سی تھی، جن زمینوں پر وہ کاشت کرتے تھے ان پر ان کا کوئی حق نہ ہوتا تھا، زمین کا مالک کوئی ہوتا تھا اور کام یہ لوگ کرتے تھے۔

یورپ کے گذشتہ دو صدی کے معاشی نظام کو دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے کم از کم یورپ کے اکثر ملکوں میں زمینداری طریقہ رائج تھا۔ زمینداری سے

---

[1] ۔ شبلی نعمانی مرحوم: سیرۃ النعمان ص ۲۶۲ ج ۲ مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ڈسمبر ۱۸۹۱ء۔

ایسا طریقۂ کاشتکاری مراد ہے جس میں کاشت کرنے والے عام طور سے زمینوں کے مالک نہیں ہوتے ان کی حیثیت مزارعین کی ہوتی ہے یورپ میں زمینداری نظام ہی نہیں بلکہ یورپ کے بہت سے حصوں میں خاص کر روس، پولینڈ، رومانیہ اور ہنگری وغیرہ میں تو شدید قسم کا جاگیری نظام رائج تھا ایک طرف تو وہ لوگ تھے جن کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین تھی اور دوسری طرف وہ بدنصیب مزارعین تھے جو اپنے جھونپڑوں کے بھی خود مالک نہ تھے، یہ کاشت کار دن رات بڑی محنت کرتے تھے، طرح طرح کے ظلم اور تشدد سہتے تھے، ان کی نوعیت زمینداروں کے غلاموں کی سی تھی جو محض اپنے آقاؤں کے عیش و عشرت کے لیے حقیر معاوضے پر اپنی جان ہلکان کرتے تھے، معاشی لحاظ سے اس نظام کی خرابیاں بالکل ظاہر ہیں۔ زرعی معاشیات کے ایک مشہور ماہر سر آرتھر ینگ کا مقولہ ہے کہ

"ملکیت کا جادو ریت کو سونا بنا دیتا ہے اور جہاں گھانس کی ایک پتی اگتی تھی وہاں دو پتیاں اگتی ہیں[1]"

کاشت کاروں کو زمین کے ساتھ کوئی ذاتی دلچسپی نہ تھی کیونکہ ان کو زمین پر کوئی حق نہیں تھا اس لیے وہ زمین پر اتنی محنت نہیں کرتے تھے جتنی کہ وہ اپنی ملک ہونے کی صورت میں کرتے۔

ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام صوبوں میں صوبہ پنجاب کا معیار زندگی باقی سب صوبوں سے بڑھا ہوا تھا اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ پنجاب کا بڑا حصہ اس زمینداری لگان کی لعنت سے آزاد تھا، وہاں کھیت چھوٹے چھوٹے تھے اور ان کی کاشت کرنے والے خود ہی اپنے کھیتوں کے مالک تھے اس لیے آرتھر ینگ کے قول کے مطابق ملکیت کے جادو نے ریت کو بھی سونا بنا دیا اور جہاں پہلے گھانس کی ایک پتی اگتی تھی وہاں اب دو پتیاں اگتی تھیں۔ غرض یورپ کے اس معاشی نظام میں جو نقص تھا اور کاشتکاروں پر جو طرح طرح کے مظالم ہوتے تھے ان کا اندازہ ٹالسٹائے اور دوسرے روسی افسانہ نگاروں کی تصنیفوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

ا۔ سر آرتھر ینگ: ٹراولز ان فرانس ج ا ص ۲۰۵ نیز ج ۲ ص ۱۸۱۔

اکثر زرعی معاشیات داں جاگیری اور زمینداری نظام کے سخت مخالف ہیں یہی وجہ ہے کہ گذشتہ پچیس تیس برس سے خود کار کاشتکار[1] بنانے کی تحریک بہت کامیاب ہوئی ہے اور گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سے یورپ کی کئی ایک حکومتوں خاص کر روس میں تو زبردستی بڑے بڑے زمینداروں کو بے دخل کر کے کاشتکاروں میں زمین تقسیم کر دی اور حق ملکیت کسانوں کو ہی عطا کر دیا۔ پولینڈ، رومانیہ اور ہنگری وغیرہ میں روس کے حالات سے سبق حاصل کر کے حکومت نے زمینداروں کو معاوضہ دے کر زمین کو کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

یورپ کے زرعی نظام میں اس وقت بھی سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ زمینوں کی حد تک وہاں قانون حق اکبر[2] رائج ہے، اس قانون کے لحاظ سے زمین صرف بڑے بیٹے کو ملتی ہے اور اسی باپ سے پیدا ہونے والے دوسرے بیٹے اور بیٹیاں اپنے باپ کی اس جائداد سے محروم کر دیے جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جاگیرداری یا زمینداری نظام کے ختم کرنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی اور زمینوں کے مساوی حصوں میں تقسیم ہو جانے میں یہ قانون سنگ گراں کی طرح حائل ہے۔

ان بدعنوانیوں اور زیادتیوں کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بغاوت کے دبے ہوئے بیج نشو و نما پا رہے ہیں، اس کا پہلا نتیجہ انقلاب روس کی شکل میں ۱۹۱۷ء میں رونما ہوا جہاں کاشتکاروں نے زمینداروں کے خون سے ہولی کھیلی اور ان کو ان کی املاک سے نہ صرف محروم کر دیا بلکہ ملک تک سے نکال دیا۔ اشتراکیت کی تحریک دن بدن ترقی کرنے لگی ہے، مزارعین اور مزدور اس میں پیش پیش حصہ لے رہے ہیں اور معاشرے کی مشکلوں کا حل یہی پیش کیا جا رہا ہے کہ زمین قوم کی مشترکہ ملک قرار دے دی جائے یعنے انفرادی طور پر لوگوں سے زمین کی ملکیت کا حق چھین لیا جائے چنانچہ یہی طریقہ روس میں رائج رہا۔

روس میں اشتراکیت کی تحریک کو بڑی کامیابی ہوئی جس کا اندازہ روس کی صنعتی ترقی سے ملتا ہے زار کے زمانے تک روس صنعتی لحاظ سے دنیا کے نہایت پست

---

[2] Primogeniture. 2e   [1] peasant proprietor. 1a

ملکوں میں تھا اس وقت روس سب سے زیادہ پیش پیش ہے لیکن اشتراکیت کو زراعت کی حد تک ایسی کامیابی نہیں ہوئی جیسی کہ توقع تھی بلکہ اس کے برعکس گذشتہ پچیس برس کے تجربہ کے بعد حکومت روس خود اس نتیجہ پر پہنچ رہی ہے کہ کاشتکاروں کو زمین سے دلچسپی پیدا کرانے اور سونا اگلوانے کے لیے کچھ نہ کچھ ملکیت کے حقوق دینے سے مملکت کا ہی فائدہ ہوگا خود روس نے یہ محسوس کیا ہے کہ زراعت میں اشتراکیت کی کامیابی کا زیادہ امکان نہیں ہے ان حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان معاشی مشکلوں سے بچنے کا اسلام نے کیا بندوبست کیا ہے ؟ اور اسلام کے زرعی معاشی نظام میں ان بے اعتدالیوں کو کیونکر دور کیا گیا ہے ؟

اسلام کا زرعی نظام

یورپ کے اکثر ملکوں میں بڑی بڑی جاگیروں کی بقا اس کے تسلسل پر منحصر ہے اور اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس کی بڑی وجہ وہ قانون ہے جس کی بنا پر حق اراضی صرف بڑے بیٹے کو ملتا ہے اور نسلاً بعد نسل یہ جاگیریں منقسم ہوئے بغیر جاری رہتی ہیں دوسروں تک زمین کی ملکیت کیا منتقل ہوگی جب زمین کے مالکوں کی اولاد بڑے بیٹے کے سوا مساوی تقسیم کے حق سے قانوناً محروم رہے اسلام نے اس خرابی کا بہت عمدہ حل پیش کیا ہے کہ اراضی نہ صرف سب بیٹوں میں مساوی تقسیم ہو بلکہ بیٹیوں اور بیوی کو بھی حصہ دیا جائے یہ حل آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے پیش کیا گیا تھا اور آج کی مہذب دنیا جو حقوق اور آزادیٔ نسواں کے راگ الاپتی رہتی ہے اس وقت تک اس فیصلہ میں یکسوئی نہیں پیدا کر سکی کہ مردوں کے ساتھ زمین کے مالک ہونے کا حق بیچاری عورتوں کو بھی ہے یا نہیں لیکن قرآن کریم نے مردوں کے ساتھ عورتوں کے تملیکی حقوق کا بھی منشور عطا کیا ہے

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ
وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ
مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا
پ۴ النساء ۴ ع۱

مردوں کے لیے حصہ ہے جو ماں باپ اور دیگر رشتہ دار چھوڑ جائیں عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے جو ماں باپ اور دیگر رشتہ دار چھوڑ جائیں خواہ ترکہ تھوڑا ہو یا بڑا اس کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے

مرنے کے بعد مورث کی جائداد قرآنی اصول پر تقسیم کرتے رہی کا یہ نتیجہ ہے کہ مغربی ممالک میں

جس قسم کا جمود جاگیری نظام کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے اسلام میں یہ خرابی پیدا نہ ہو سکی۔

غرض اسلام نے تقسیم اراضی پر زور دیا ہے بڑی بڑی زمینوں کو چھوٹے حصوں میں منقسم کرنے کا راستہ بتایا[1] لیکن اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو حق اراضی سے روس کی طرح محروم نہیں کیا یہ اسلامی معاشیات کی سب سے بڑی ذہانت ہے کہ اس نے حق ملکیت کو حق ورثہ کے ساتھ تقسیم کیا۔

ملکیت اراضی اراضی کے سلسلے میں ملکیت اراضی سے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اراضی پر کس کی ملکیت تسلیم کی جائے؟ انگلستان اور دوسرے کئی یورپی ملکوں میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ قطعی حق ملکیت خود مالکان اراضی کو حاصل ہے اور وہ اس کے پورے طور پر مالک ہیں اور حکومت کو اس پر کوئی اختیار نہیں اس کے برعکس ہندوستان اور دوسرے کئی ملکوں میں مالکوں کے بیع وشری کے حقوق کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن بالآخر ملکیت حکومت کی یعنے قوم کی تسلیم کی گئی ہے۔

زمین، عاملین پیدائش میں سے ایک اہم عامل ہے جس میں کوئی قابل لحاظ اضافہ کرنا انسانی کوشش سے باہر ہے اس حالت میں یہ اہم سوال ہوتا ہے کہ ایسا عامل پیدائش جو قدرت کا عطیہ ہے اور جس میں مزید اضافہ کرنا انسانی قوت سے باہر ہے تو قوم کو اس سے بالکل دست بردار کر دینا کس حد تک قرین مصلحت اور قرین دانش ہے؟

اسلامی معاشیات کی دوسری بڑی ذہانت یہ ہے کہ اگرچہ اس نے ملکیت اور وراثت کو تسلیم کیا ہے تاہم بے اعتدالیوں کو روکنے اور مفاد عامہ کو محفوظ رکھنے کے لیے زمین بالآخر قوم کی ملکیت تصور کی گئی ہے اس لیے کہ "یہ شئے کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے جس میں قوم کے ہر فرد کو حق ملکیت حاصل ہے"[2]

[1] پھر یہ بھی ممکن تھا کہ زمین ترکے میں بٹتے بٹتے گز دو گز میں اور انچوں میں آ جائے اور ساتھ ہی یہ بھی ممکن تھا کہ گھر والے کا باپ کے ٹکڑے کرنے پڑتے اس کی روک تھام وقف علی الاولاد کے اصول سے ہو سکتی ہے جس سے صرف آمدنی تقسیم ہوتی ہے جائداد کو نقصان نہیں پہنچتا۔ یہاں اسلامی قانون شفعہ کا تذکرہ بیجا نہ ہوگا اس قانون کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی اراضی کے پلاٹ کو فروخت کر دینا چاہتا ہے تو فروخت کے وقت ملحقہ اراضی کے مالک کو ترجیح دی جاتی ہے۔ [2] علامہ سر محمد اقبال مرحوم، علم الاقتصاد ص ۱۵۱۔

اس کے علاوہ یہ اہم سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام زمین افراد میں تقسیم ہوجائے تو پھر مفادِ عامہ کی ضرورت کے لیے زمین کہاں سے آئے گی؟ اور اس کے برعکس کی ملکیت رہے مثلاً شہروں کے لیے یہ محسوس کیا گیا ہے کہ شہر کے گرد و نواح باغوں، سرکاری پارکوں اور کھیل کود کے میدانوں کی ضرورت ہے اس کے علاوہ دیہات میں چراگاہوں اور دوسرے رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے بھی ایسی زمین کی ضرورت ہے جس کی ملک انفرادی نہ ہو پھر ایسے محفوظات کی بھی ضرورت ہے جس میں سے کبھی کبھی ضرورت مند لوگوں کو زمینیں دی جاسکیں۔ ان اہم سوالات پر اسلامی نقطۂ نظر آئندہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔

اسلامی فتوحات کی وسعت کے ساتھ ہی ساتھ تقسیم اراضی کا مسئلہ بھی اہمیت حاصل کرتا چلا گیا، اسلامی سلطنت جس کے حدود پہلے صرف ایک شہر مدینہ تک محدود تھے پچیس تیس سال کے اندر ہی اندر تین براعظموں پر پھیل گئے۔ اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں مفتوحہ اراضی کے متعلق جو انتظام کیا گیا اس کا تذکرہ کریں گے کیونکہ پس منظر کے لیے یہ ضروری ہے۔

آنحضرتؐ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد میں زمینات کا مسئلہ

عہدِ نبویؐ کی تفصیلات:۔ "رسول کریمؐ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے تو آپ نے یہودیوں سے اس شرط پر صلح کا معاہدہ کیا تھا کہ وہ آپ کے خلاف کسی کی اعانت نہیں کریں گے بلکہ اگر کوئی دشمن آپ پر چڑھائی کرے گا تو وہ آپ کی مدد کریں گے[1]"

(۱) بنو قینقاع:۔ "بنو قینقاع پہلے یہودی ہیں جنھوں نے اس معاہدہ کی جو ان کے اور رسول اللہؐ کے درمیان طے پایا تھا خلاف ورزی کی اور ان کی آپ سے جنگ بدر اور احد کے درمیانی زمانے میں جنگ ہوئی، زہری کہتے ہیں کہ یہ غزوہ

---

[1] تاریخ طبری غزوہ بدر ۲ھ ہجری کے واقعات، معاہدہ کا پورا متن کتاب الاموال ص ۲۰۲ میں موجود ہے۔

شوال ۲ھ ہجری میں واقع ہوا[1] آپ نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیا آخر انھوں نے عاجز آکر رسول اللہؐ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور ناچار اپنے آپ کو رسول اللہؐ کے حوالے کر دیا۔[2] پس آپ نے ان کو جلاوطن کر دیا اور ان کی املاک کو بطور غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ زمیندار نہ تھے بلکہ صرف کاشتکار تھے چنانچہ ان کے پاس سے اسلحہ اور کھیتی باڑی کے آلات کی بہت بڑی تعداد مال غنیمت میں ملی[3] اس فتح کے واقعات حدیثوں اور سیرت کی کتابوں یا تاریخوں میں ہیں کچھ زیادہ تفصیل سے نہیں ملتے البتہ بنو نضیر کے اراضی کی تقسیم کے حالات کچھ تفصیل سے ملتے ہیں چنانچہ غزوۂ بنو قینقاع کے بعد[4] پہلی زمین جو آپ کے قبضے میں آئی وہ بنو نضیر کی زمین تھی۔[5]

(۲) **بنو نضیر کی اراضی:۔** رسول کریمؐ نے محمد بن مسلمہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم جا کر یہودیوں سے کہدو کہ چونکہ تم نے میرے ساتھ غداری اور بدعہدی کی اس لیے ضرور ہے کہ تم میرے علاقوں سے نکل جاؤ اور میرے قریب نہ رہو۔[6] پھر رسول اللہؐ نے بنو نضیر کا پندرہ دن تک محاصرہ کیا اور اس زمانے میں ان کو بالکل بے بس کر دیا آخر کار انھوں نے آپ کے مطالبے کو منظور کیا اور اس شرط پر صلح کی کہ ان کو قتل نہ کیا جائے البتہ ان کے وطن اور زمینوں سے ان کو بے دخل کر دیا جائے اور ان کو شام کے بیابانوں میں جلاوطن کر دیا جائے۔ پھر رسول اللہؐ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی۔ انھوں نے اپنا ایسا تمام سامان جو اونٹ پر لادا جا سکتا ساتھ لے لیا چنانچہ یہ لوگ اپنے گھروں کے دروازے اور چوکھٹیں تک نکال کے اونٹوں پر لاد کر لے گئے۔ یہ لوگ پہلے خیبر گئے اور پھر وہاں سے شام چلے گئے۔

وہ بنو نضیر اپنے بال بچوں اور اسباب و سامان کو لاد کر لے گئے۔ ان کے ساتھ دف، ستار اور ڈومنیاں بھی تھیں جو ان کے پیچھے پیچھے گاتی بجاتی چلی جا رہی تھیں۔[6]

---

[1] طبری، صفحہ ۱۳۶۰ غزوہ بنو قینقاع ۲ھ کے واقعات [2] طبری، صفحہ ۱۳۶۱ غزوہ بنو قینقاع ۲ھ کے واقعات [3] فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۷ مدینہ کی طرف رسول اللہؐ کی ہجرت [4] طبری صفحہ ۱۴۵ بنو نضیر کی جلاوطنی۔ [5] طبری، صفحہ ۱۴۵۱ ۴ھ بنو نضیر کی جلاوطنی بروایت ابن عباسؓ [6] تاریخ طبری صفحہ ۱۴۵۲

مورخ مسعودی نے صراحت کی ہے کہ یہ ماہ ربیع الاول ۴ھ ہجری کا واقعہ ہے۔[1]

چونکہ بنو نضیر کی جائداد جنگ کے بغیر رسول کریمؐ کے قبضے میں آئی تھی اس لیے قدرتاً یہ سوال پیدا ہوا کہ اس صورت میں بنو نضیر کے مال اور جائداد کی کیونکر تقسیم ہونی چاہیے "چنانچہ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ آیت

وَمَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُولِهٖ مِنْهُمْ	اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے دلوایا

اموال بنی نضیر کے متعلق ہے اس لیے کہ

فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ	تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَشَاءُ	لیکن خدا اپنے رسولوں کو جس پر چاہے تسلط
پ ۲۸ الحشر ۹ ۵ ع ۱	دلا دیتا ہے۔

راوی کا بیان ہے کہ اس آیت میں خدا نے مسلمانوں کو یہ جتایا ہے کہ یہ اموال رسول اللہؐ کے خالصہ ہیں اور آپ کے سوا اور کسی کے لیے نہیں ہیں لیکن رسول کریمؐ نے اس کو مہاجرین میں تقسیم فرما دیا اور جب دو انصاریوں یعنے سہل بن حنیفؓ اور ابو دجانہؓ کے متعلق فقر کی شکایت کی گئی تو آپ نے انھیں بھی ایک حصہ عطا فرمایا۔[2] "حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ بنو نضیر کے اموال اس قسم میں تھے جو اللہ نے اپنے رسول کو بغیر جنگ کے دلائے تھے مسلمانوں نے اس پر گھوڑے اور سوار نہ دوڑائے تھے (یعنے جنگ کی نوبت نہ آئی تھی) پس وہ مال خاص کر نبی کریمؐ نے لے لیا اور آپ اس میں سے ایک سال کا خرچ اپنے گھر والوں کو دے دیتے تھے اس کے بعد جو باقی رہتا تھا اس کو ہتھیار اور گھوڑوں میں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے خرچ کرتے تھے"[3]

الغرض یہ مال و جائداد سرکاری ملک قرار پایا اور یوں رسول کریمؐ کو اختیار دیا گیا کہ جس طرح چاہیں تقسیم کریں چنانچہ رسول اللہؐ نے انصار سے ارشاد فرمایا کہ

۱۔ التنبیہ والاشراف۔ مسعودی حالات بنو نضیر ۲۔ فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۹۔ اموال بنی النضیر

۳۔ بخاری پ ۱۱ کتاب الجہاد نیز فتوح البلدان صفحہ ۲۰۔ اموال بنی النضیر۔

تمھارے بھائی مہاجر نادار ہیں اگر تمھاری مرضی ہو تو میں یہ مال اور تمھارے اموال مجموعاً دونوں پر تقسیم کر دوں اور اگر یہ نہ چاہو تو تم اپنے اموال اپنے ہی پاس رہنے دو میں یہ مال انھیں میں تقسیم کر دیتا ہوں انھوں نے عرض کیا یہ مال تو آپ ان ہی میں تقسیم فرما دیجئے لیکن ہمارے اموال میں بھی آپ جتنا چاہیے انھیں عطا فرمائے۔[1]

عرض آپ نے انصار کو چھوڑ کر اسے صرف پہلے مہاجرین میں تقسیم کر دیا۔ انصار میں سے سہل بن حنیف اور ابو دجانہ سماک بن خرشہ نے اپنی غربت کی وجہ سے درخواست کی کہ ہمیں بھی کچھ عطا فرمائیے۔ آپ نے ان کو بھی اس میں سے دیا بنو نضیر میں سے صرف دو شخص یامین بن عمیر بن کعب عمرو بن جحاش کے چچیرے بھائی اور ابو سعید بن وہب اس شرط پر اسلام لے آئے کہ ان کی املاک انھیں کے پاس رہیں گی چنانچہ یہ اس پر قابض رہے[2]

عرض بنو نضیر کے اموال رسول اللہؐ کے خالصہ (سرکاری) ہو گئے آپ ان کی زمینوں میں کھجور کے درختوں کے نیچے زراعت فرما کر ماحصل سے اپنے اہل و عیال کے لیے سال بھر کی روزی حاصل فرماتے تھے اور اس میں کچھ بچتا اسے گھوڑوں اور اسلحہ کی خریدی میں صرف فرماتے۔[3]

"ان زمینوں میں سے آپؐ نے ابو بکرؓ اور عبد الرحمٰن بن عوفؓ، ابو دجانہؓ وغیرہ کو جاگیریں عطا فرمائیں۔[4] خود امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ "رسول اللہؐ نے زبیرؓ کو بنو نضیر کی املاک میں سے ایک زمین عطا فرمائی تھی[5] نیز مورخ بلاذری نے لکھا ہے کہ "رسول اللہؐ نے بنو نضیر کی املاک میں سے جاگیریں عطا فرمائیں اور زبیرؓ کو بھی ایک جاگیر عطا فرمائی[6] اور اس میں کھجور کے درخت تھے[7]

(۳) **بنو قریظہ کی اراضی**:۔ بنو نضیر کی زمینات کے بعد بنو قریظہ کی زمین

۱۔ فتوح البلدان صفحہ ۲۱۔ اموال بنی النضیر۔ ۲۔ طبری، صفحہ ۱۴۵۳ بنو النضیر کی جلا وطنی۔
۳۔ فتوح البلدان صفحہ ۱۸۔ اموال بنی النضیر۔ ۴۔ بخاری کتاب الجہاد ۳۰، نیز ابو داؤد و کتاب القطائع۔ ۵۔ فتوح البلدان صفحہ ۲۱۔ اموال بنی النضیر۔
۶۔ فتوح البلدان صفحہ ۲۱۔ اموال بنی النضیر۔

رسول اللہؐ کے قبضے میں آئی رسول اللہؐ نے ۵ھ ہجری کے ذی القعدہ اور ذی الحجہ کی راتوں میں بنی قریظہ کا محاصرہ فرمایا جس کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ان لوگوں نے قریش کو (جنگ خندق میں) مدد دی تھی[1] " بنو قریظہ جہاں مقیم تھے وہ مقام مدینہ سے کچھ کم ایک دن کی مسافت پر واقع تھا رسول اللہؐ پندرہ دن اور بقول بعض اس سے بھی زیادہ دنوں تک ان لوگوں کا محاصرہ کیے رہے یہ یہاں تک کہ وہ مجبور ہوگئے کہ سعد بن معاذؓ کو حکم بنایا جائے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے مرد قتل کر دیے جائیں عورتیں بچے غلام بنائے جائیں اور ان کے اموال مسلمانوں میں تقسیم کر دیے جائیں[2] غرض" رسول اللہؐ نے بنو قریظہ کی املاک عورتوں اور بچوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا[3]"

" معمر نے امام زُہری سے پوچھا کہ کیا بنو قریظہ کے پاس کوئی زمین تھی؟ انھوں نے بصراحت کہا ہاں تھی اور وہ زمین رسول اللہؐ نے مسلمانوں میں بحصہ رسدی تقسیم فرما دی[4]"

غرض ہجرت کے پہلے پانچ سال مدینہ اور اس کے اطراف کی زمینیں رسول اللہؐ کے قبضے میں آگئیں، جو زمینیں بزور فتح ہوئیں آپ نے انھیں صحابہ کرامؓ میں تقسیم فرمایا اور جو علاقے بغیر لڑائی کے فتح ہوئے وہ رسول اللہؐ کے خالصہ یعنے سرکاری ملک قرار پائے۔ رسول اللہؐ نے اپنے اختیار تمیزی سے مہاجرین اور مفلس انصاریوں کو ان میں سے عطائیں دیں ماسوا اس کے ابن عباس کا بیان ہے کہ " جب رسول کریمؐ مدینہ تشریف لائے تو ہر ایسی زمین جہاں پانی نہیں پہنچتا تھا اور جو افتادہ اراضی تھی اس کے بارے میں آپ جو چاہتے کرتے[5] یعنے حسب صوابدید تقسیم فرما دیتے تھے۔

اس موقع پر اس کا تذکرہ ضروری ہے کہ رسول اللہؐ نے یہودیوں کو جلاوطنی کا

---

[1] بلاذری صفحہ ۲۱ - اموال بنی قریظہ۔ [2] مسعودی: التنبیہ والاشراف صفحہ ۵۰ غزوہ بنی قریظہ
[3] بلاذری صفحہ ۲۲ - اموال بنی قریظہ نیز کتاب الاموال صفحہ ۱۲۹ - دوسرے باب میں تذکرہ ہو چکا کہ یہودیوں کے پاس مفتوحوں کے ساتھ یہی عمل درآمد تھا۔ [4] طبری صفحہ ۱۴۹۲ غزوہ بنی قریظہ۔
[5] بلاذری: باب ۳ صفحہ ۲۲ - اموال بنی قریظہ۔ [6] کتاب الاموال صفحہ ۲۸۲ و ۳ ۶۹ نمبر

حکم دینے سے پیشتر انھیں اپنی زمینوں کو فروخت کرنے کا حکم دیا تھا چنانچہ امام بخاری لکھتے ہیں ۔

باب :۔ أَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْيَهُودَ بِبَيْعِ أَرْضِهِمْ حِينَ أَجْلَاهُمْ، فِيهِ الْمَقْبُرِيُّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ[1]	باب : نبی کریمؐ نے یہودیوں کو اپنی زمینوں کے بیچ ڈالنے کا حکم دیا جب کہ آپ نے انھیں مدینے سے نکالا، اس کے راویوں میں ابو ہریرہؓ کے تحت مقبری ہیں ۔

غالباً امام بخاریؒ کو مزید تفصیلیں نہ ملی ہوں گی اس لیے انھوں نے صرف ایک باب قائم کیا ہے اس کے نیچے مزید حدیثیں نہیں لکھی ہیں جیسا کہ ان کا عام طریقہ ہے بلکہ اس کے بعد ہی دوسرا باب شروع کر دیا ہے ۔

(۴) خیبر کی اراضی :۔ ہجرت کے ساتویں سال کے شروع میں خیبر کا زرخیز علاقہ اور اس کے نخلستان رسول اللہؐ کے قبضے میں آ گئے ۔ "خیبر مدینے سے آٹھ چوکیوں کی مسافت پر واقع ہے[2]" رسول کریمؐ نے خیبر پر محرم ۷ھ میں غزا فرمایا یہاں کے باشندے عرصے تک آپ کے مقابلے میں جمے رہے رسول کریمؐ نے مہینہ بھر ان کا محاصرہ جاری رکھا، پھر انھوں نے اس شرط پر صلح کر لی کہ ان کے خون معاف کیے جائیں، ان کے بال بچے قید نہ کیے جائیں البتہ وہ زمین سے جلا وطن ہو جائیں گے اور زمین سونے چاندی اور مال و اسباب سمیت مسلمانوں کے لیے چھوڑ دیں گے سوائے اس مال کے جو ان کے جسموں پر ہے[3]۔ آپ نے خیبر کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جس کی کچھ تفصیل ذیل میں درج ہے ۔

"رسول اللہؐ نے خیبر کے چھتیس حصے فرمائے اٹھارہ حصے ان حقوق و ضروریات کے لیے تھے جو آپ پر واجب تھیں اور اسی میں ان مہمانوں اور وفدوں کے مصارف تھے جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور باقی اٹھارہ حصے اس طرح تقسیم فرمائے کہ ہر حصہ میں سو آدمی شریک تھے[4] خود

---

[1] بخاری پ ۸ کتاب البیوع ۔ [2] مسعودی : التنبیہ والاشراف ، ہجرت کا ساتواں سال ۔
[3] بلاذری : فتوح البلدان باب ۱۳ صفحہ ۲۳ ۔ خیبر ۔ [4] بلاذری فتوح البلدان صفحہ ۲۶ نیز کتاب الاموال صفحہ ۵۶ ۔ نمبر ۱۴۳ ۔

مورخ بلاذری نے ہی ان کی مزید تفصیل بیان کی ہے کہ "خیبر ۳۶ حصوں میں تقسیم کیا گیا جن میں سے ہر حصہ سو سو حصوں پر مشتمل تھا ۱۸ حصے مسلمانوں کے حصے میں آئے جو انھوں نے بقدر حصہ رسدی آپس میں بانٹ لیے انہی میں ایک حصہ عام مسلمانوں کی طرح رسول اللہؐ کا بھی تھا اور باقی ۱۸ حصے مہمانوں اور سفارتوں کے اخراجات اور ان ضرورتوں کے لیے مخصوص فرما دیے جو آپ کو لاحق ہوتی تھیں"[1]

"ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ خیبر ۱۵۸۰ حصوں میں تقسیم کیا گیا کیونکہ غزوہ کے شرکاء کی تعداد اتنی ہی تھی ان میں سے جو حدیبیہ کے دن شریک ہوئے تھے وہ ۱۵۴۰ تھے اور جو جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حبشہ گئے وہ ۴۰ تھے"[2] "آپ نے خیبر کو شرکائے حدیبیہ میں چاہے وہ خیبر کے واقعہ میں شریک ہوئے یا نہیں تقسیم فرما دیا مگر صرف ایک جابر بن عبد اللہؓ ہی ایسے تھے جو شریک نہ ہو سکے تھے مگر رسول اللہؐ نے اوروں کی طرح ان کا بھی حصہ لگایا"[3]

"رسول اللہؐ کے حصے میں شق اور نطاۃ اور ان کے متعلقات تھے اور جو حصہ آپ نے وقف فرمایا اس میں کتیبہ، وطیحہ اور سلالم تھے"

"جب زمینیں رسول اللہؐ کے قبضے میں آگئیں تو زمین پر کام کرنے والوں کی قلت کے باعث رسول اللہؐ نے اس کو پیداوار کی آدھی بٹائی پر معاملہ کر کے انہی یہودیوں کے سپرد کر دیا یہ عمل آپ کی زندگی میں اور پھر آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں قائم رہا لیکن جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو چونکہ مسلمانوں کو بہت سے کام کرنے والے ہاتھ آگئے اور اس قابل ہو گئے کہ زمین آباد کر سکیں اس لیے حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو شام کی طرف جلاوطن کر دیا اور تمام اموال مسلمانوں میں تقسیم کر دیے"[4] ان یہودیوں کو جلاوطن کرنے کے اور بھی اسباب تھے جن کا تذکرہ آئندہ کیا جائے گا۔

۱۔ بلاذری، فتوح البلدان صفحہ ۲۶ خیبر۔ ۲۔ بلاذری، فتوح البلدان صفحہ ۲۸ خیبر نیز ابوداؤد کتاب الخراج ۔ ۳۔ طبری صفحہ ۱۵۸۹ غزوہ وادی القری۔

۴۔ ابوعبید قاسم بن سلام، کتاب الاموال صفحہ ۵۶ نمبر ۱۴۲ نیز فتوح البلدان صفحہ ۲۶ خیبر۔

(۵) فدک کی اراضی :- خیبر کے بعد فدک کا علاقہ رسول اللہؐ کے قبضے میں
میں آگیا چنانچہ مورخ طبری لکھتے ہیں کہ "رسول اللہؐ نے جب خیبر فتح کرلیا تو اللہ نے
اہل فدک کے دل میں اہل خیبر کی ذلیل شکست سے ایسا رعب ڈالا کہ انھوں نے
خود ہی نصف پیداوار کی ادائی پر رسول اللہؐ سے مصالحت کی درخواست کی
ان کے نمائندے خیبر میں یا اثنائے راہ میں یا آپ کے مدینہ تشریف لانے کے
بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان کی درخواست منظور فرمائی
اس طرح فدک پر چونکہ مسلمانوں نے فوج کشی نہیں کی تھی اس لیے یہ علاقہ
محض آپ کی ذات کے لیے خالصہ ہوا" [1]

یہ بیان تو مورخ طبری المتوفی ۳۱۰ھ کا تھا۔ طبری سے پہلے مورخ بلاذری
المتوفی ۲۷۹ھ نے اس کی یوں تفصیل لکھی ہے کہ "رسول اللہؐ نے خیبر سے واپسی پر
محیصہ بن مسعود الانصاریؓ کو اہل فدک کے پاس بھیجا کہ انھیں اسلام کی دعوت
دیں۔ اس وقت ان کا سردار انھی میں کا ایک شخص یوشع بن نون یہودی تھا
اس نے رسول اللہؐ کو آدھی زمین دے کر صلح کرنی چاہی جو آپ نے منظور فرمالی
اس وجہ سے آدھا فدک رسول اللہؐ کا خالصہ ہوگیا کیونکہ مسلمانوں نے اس پر
اپنے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے تھے یہاں کی آمدنی مسافروں پر خرچ
کی جاتی تھی یہاں کے باشندے حضرت عمر بن الخطابؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد
اس زمانے تک اپنی زمینوں پر قابض رہے کہ انھوں نے یہودیوں کو حجاز سے
جلاوطن کردیا انھوں نے ابوالہیثم مالک بن تیہانؓ (بعض تیہان کہتے ہیں) اور سہل
بن ابی حثمۃ الانصاریؓ اور نیز زید بن ثابت الانصاریؓ کو (فدک) بھیجا ان
لوگوں نے ان کے حصے کی عادلانہ قیمتیں جانچیں جو ان کو دے دی گئی اور ان کو
شام کی طرف جلاوطن کردیا گیا" [2]

مختصر یہ کہ "خیبر تمام مسلمانوں کی ملکیت عام ہوا اور فدک محض رسول اللہؐ
کا خالصہ ہوا کیونکہ اس پر مسلمانوں نے فوج کشی نہیں کی تھی" [3]

۱؎ طبری، غزوہ خیبر صفحہ ۱۵۸۹ ۷ھ کے واقعات ۔
۲؎ بلاذری؛ فتوح البلدان، باب ۵ صفحہ ۲۹ ۔۔ ۳؎ طبری ص ۱۵۸۹

"حضرت عمرؓ نے خیبر کے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا اور وہ وہاں سے چلے گئے مگر فدک کے یہودی آدھی زمین اور آدھی پیداوار کے حصہ دار تھے کیونکہ انھوں نے رسول اللہ صلعم سے اسی پر صلح کی تھی اس لیے حضرت عمرؓ ان کو نصف زمین اور نصف پیداوار کے معاوضے میں سونے، چاندی اور نیز اونٹوں کے پالان دیے اور ان کو جلاوطن کر دیا[1]

مورخ بلاذری نے صراحت کی ہے کہ "جب حضرت عمرؓ نے انھیں جلاوطن کیا تو نخلستان اور اراضی میں ان کا جتنا حصہ تھا اس کی عادلانہ قیمتیں جانچنے کے لیے چند واقف کاروں کو بھیجا اور جو قیمتیں انھوں نے تجویز کیں وہ ان کو دیدیں[2]"

امام ماوردی المتوفی سنہ ۴۵۰ھ کے بیان سے بعض اور امور پر مزید روشنی پڑتی ہے اسی لیے ہم ان کے بیان کو بھی درج کریں گے امام ماوردی لکھتے ہیں کہ "خیبر کی فتح کے بعد اہل فدک آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور محیصہ بن مسعود کی سفارت سے اس شرط پر مصالحت کر لی کہ نصف اراضی فدک اور اس کے کھجور کا آپ مقاسمہ کرا لیا کریں آپ کے نصف اور نصف اہل فدک کے ہوں گے[3]"

"حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں جب زمیوں کو حجاز سے جلاوطن کیا تو فدک سے ان کو بھی نکال دیا اور فدک کی قیمت لگا کر آدھی قیمت یعنے ساٹھ ہزار درہم ان کے حوالے کر دی قیمت لگانے والے مالک بن تیہان سہل بن حیثمۃ اور زید بن ثابت تھے"

"اس کے بعد آدھا فدک تو آپ کے صدقات کا رہا اور آدھا عام مسلمانوں کے لیے ہو گیا مگر اب (بزمانہ ماوردی) دونوں کا مصرف ایک ہی ہے[4]"

(۶) وادی القریٰ کی اراضی:- "رسول کریم صلعم خیبر سے واپسی میں وادی القریٰ تشریف لائے اور اس کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی انھوں نے اس سے انکار کیا اور جنگ کی رسول اللہ صلعم نے ان کو فتح کر لیا اور خدا نے ان کے اموال آپ کے لیے غنیمت کر دیے آپ نے خمس ان میں سے لے لیا اور اراضی اور نخلستان انہی کے پاس رہنے دیے اور

---

[1] - فتوح البلدان صفحہ ۳۲ فدک -

[2] - بلاذری فتوح البلدان صفحہ ۲۹

[3] - ماوردی، احکام السلطانیہ باب ۱۴ صفحہ ۱۶۲ [4] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۴ صفحہ ۱۶۲

ان سے ویسا ہی سمجھوتا فرمایا جیسا کہ اہل خیبر سے [1] ہے

"رسول اللہ نے حمزہ بن النعمان بن ہوذہ العذری کو وادی القریٰ میں وہ جگہ جاگیر میں عطا فرمائی جہاں انھوں نے اپنا کوڑا پھینکا تھا۔ یہ حمزہ بن نعمان بنو عذرہ کے سردار اور اہل حجاز میں پہلے شخص تھے جنھوں نے رسول کریم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے قبیلہ کا صدقہ پیش کیا [2] ہے

پھر حضرت عمرؓ نے یہاں کے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا اور ان کی زمین اور نخلستان کو ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جو یہاں کی جنگ میں شریک تھے [3] ہے

لیکن جلاوطنی سے پیشتر ایک گراں بہا رقم ان کی اراضی کے معاوضہ میں ادا کر دی چنانچہ امام ماوردیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے وادی القریٰ کے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا اور قیمت لگا کر جو نوے ہزار دینار ہوتی تھی ان کے حوالے کر دی [4] ہے

حکومت کی جانب سے اراضی کی خریدی :- بخاری شریف کے حوالے سے اوپر بیان کیا گیا کہ "نبی کریمؐ نے یہودیوں کو اپنی اراضی کے بیچ ڈالنے کا حکم دیا جب کہ آپ نے انھیں مدینہ سے نکالا تھا" اب یہ بیان کیا گیا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے فدک اور وادی القریٰ وغیرہ سے یہودیوں کو جلاوطن کیا تو ایک گراں بہا رقم ان کی اراضی کے معاوضہ میں ادا کر دی [I] یا جیسا کہ ہم آگے نجران کے تذکرے میں پڑھیں گے کہ زمین کے

۱، ۲ ؎ فتوح البلدان صفحہ ۴۴ وادی القریٰ

۳ ؎ ۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۵ وادی القریٰ ۔ ۴ ؎ احکام السلطانیہ ماوردی باب ۱۴ ص ۱۶۲

I ۔ آج انڈیا یونین میں بھی زمینداری نظام کو ختم کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے نومبر ۱۹۴۵ء میں انڈیا یونین کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر چرچل سابق وزیر اعظم انگلستان میں حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

"چرچل : تم اپنے اراضی کے مسئلہ کے متعلق کیا کر رہے ہو ؟ ۔

نہرو : ہم زمینداری نظام کو ختم کر رہے ہیں۔ ہم زمینداریت کو ختم کرنے کے لیے معاوضہ ادا کر رہے ہیں۔

چرچل : میرا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں مروجہ ملکیت اراضی کے طریقہ میں نقص ہے اور میں بھی کچھ اسی قسم کے اقدام کرنا چاہتا تھا" اسٹیٹسمن مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۴۵ء ۔

بدلے زمین عطا کی گئی۔ حکومت کی جانب سے اراضی کی خریدی کے گویا یہ قدیم نظیریں ہیں۔ بایں ہمہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں ناواقفیت کی بنا پر بیان کیا گیا ہے کہ حکومت کی جانب سے اراضی کے خرید لینے کے طریقے کو ایک جرمن گوسن نے پیش کیا۔ بعد ازاں ایک فرانسیسی پروفیسر لیان والرس نے اس کو از سر نو دریافت کیا۔[1]

(۷) تیماء کی اراضی :۔ "اہل تیماء نے جب یہ سنا کہ رسول اللہؐ نے وادی القریٰ کے لوگوں کو مغلوب کر لیا تو انھوں نے بھی جزیہ پر صلح کر لی اور اس طرح وہ بدستور اپنے شہروں میں رہے اور ان کی زمینیں انہی کے قبضے میں رہیں۔[2] پھر حضرت عمرؓ نے خیبر، فدک اور تیماء کے باشندوں کو جلاوطن کر دیا۔[3]

(۸) مکہ کی اراضی :۔ خیبر کے بعد رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا۔ "فتح مکہ کے بعد رسول اللہؐ نے مہاجرین صحابہ کو مکہ میں ان کی جس قدر زمینیں تھیں اور جو مکانات تھے اجازت دے دی کہ ان سب پر قابض ہو جائیں اور ان زمینوں اور مکانوں کو مال غنیمت نہیں قرار دیا۔[4]

فتح مکہ کے بعد رسول کریمؐ نے مکہ اور اس کے اطراف کی اراضی کو حرم قرار دیا حرمت مکہ کے متعلق اسلامی فقہاء نے طول طویل بحثیں کی ہیں نیز فقہا نے بھی اس پر بحث کی ہے کہ مکہ کی زمینات اور مکانات سے کرایہ لینا جائز ہے یا نہیں، ہم اس بحث کو یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔[5]

(۹) طائف کی اراضی :۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہؐ نے طائف کا رخ کیا اور اس کا محاصرہ کیا لیکن بعد میں آپ نے محاصرہ کو اٹھا لیا پھر چند ماہ کے بعد مدینہ میں "بنو ثقیف کا ایک وفد اسلام اور بیعت کی نیت سے آیا اور چاہا کہ اپنی جان، زمین اور املاک کے متعلق رسول اللہؐ سے عہد لکھوا لیں۔[6] چنانچہ اس کا عہد لکھ دیا گیا اور ان کی اراضی انہی کے قبضے میں رہنے دی گئی۔

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا جلد (۱۳) صفحہ ۶۵۳ عنوان (Land Nationalization.)

[2] فتوح البلدان صفحہ ۳۲ وادی القریٰ وتیماء۔ [3] فتوح البلدان ص۳۴ [4] مسعودی التنبیہ والاشراف حرمت مکہ۔ [5] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاموال لابی عبید قاسم بن سلام ص۶۵ تا ۶۶ [6] مکہ فتح کے واقعات

(۱۰) دومۃ الجندل کی اراضی :۔ رسول اللہؐ نے خالد بن ولیدؓ کو اکیدر بن عبدالملک کے مقابلہ پر دومۃ الجندل روانہ فرمایا خالدؓ نے اس کو گرفتار کیا اور اس کو اپنے ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اکیدر مسلمان ہوگیا رسول اللہؐ نے اس کے لیے اور نیز اہل دومۃ الجندل کے لیے یہ وثیقہ تحریر فرمایا جو حسب ذیل تھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یہ تحریر محمد رسول اللہ کی جانب سے اکیدر کے لیے جبکہ اس نے اسلام قبول کیا اور اصنام کو چھوڑ دیا اور اہل دومہ کے لیے ہے۔

جو ہٹروں کا وہ حصہ جو آبادی کے باہر ہے بنجر زمین اور جنگل اور غیر آباد زمین، زرہیں اور ہتھیار اور بار برداری کے جانور اور گڑھی یہ سب چیزیں ہمارے لیے ہیں اور تمھارے لیے وہ کھجور کے درخت ہیں جو گڑھی کے اندر ہیں اور بہتا ہوا پانی ہے تمھارے چرنے والے جانور چراگاہوں سے نہیں پھیرے جائیں گے اور نصاب کی مقررہ تعداد سے جو مویشی زیادہ ہوں زکوٰۃ کے تعین کے وقت ان کا شمار نہیں کیا جائے گا اور تمھارے پودے اُگنے سے روکے نہیں جائیں گے۔ تمھیں وقت پر نماز پڑھنی اور حق کے مطابق زکوٰۃ دینی ہوگی اس لیے کہ تمھارے ساتھ اللہ کا عہد و میثاق ہے اور تم ہماری صداقت اور وفا کے عہد کے مستحق ہو اللہ اور مسلمان حاضرین گواہ ہیں"[1]

(۱۱) نجران کی اراضی :۔ "اہل نجران نے رسول اللہؐ کی خدمت میں ایک وفد بھیجا جس میں ان کے سردار اور نمائندے تھے انھوں نے آپ سے صلح کی درخواست کی۔ چنانچہ رسول کریمؐ نے ان سے صلح کر لی اور ایک فرمان عطا فرمایا اور ان کی جان و مال۔ زمین جائداد ملت اور کلیسا وغیرہ کو امن دیا[2] اور ان پر جزیہ عائد کر دیا پھر جب ابوبکر صدیقؓ

---

[1] ابو عبید قاسم بن سلام کتاب الاموال صفحہ ۱۹۵ نیز ۵۰۸ نیز فتوح البلدان صفحہ ۶۲ دومۃ الجندل ابو عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ کہتے ہیں کہ خود میں نے اس تحریر کو پڑھا ہے اور یہ ایک سفید چمڑے پر لکھا ہوا تھا اور میں نے حرف بحرف اس کی نقل لے لی۔

[2] ۔ فتوح البلدان صفحہ ۶۳ صلح نجران ۔

خلیفہ ہوے تو انھوں نے بھی معاہدہ برقرار رکھا اور آنحضرت ؐ کے فرمان کے مانند ایک تحریر دی لیکن حضرت عمر ابن الخطاب رضؓ خلیفہ ہوے تو یہ لوگ سود[1] کھانے لگے تھے اور ان کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی اس سے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ان سے اسلام کو نقصان نہ پہنچ جائے اس لیے انھوں نے ان کو جلاوطن کر دیا۔ اور ان کے لیے پروانہ لکھا کہ

"اَمَّا بَعد یہ لوگ شام اور عراق کے باشندوں میں سے جس کے پاس جائیں وہ انھیں زراعت کے لیے زمین دے (ایسی زمینوں میں سے) یہ لوگ جو زمین بونے اور جوتنے لگیں گے وہ ان کی یمن والی زمین کے معاوضے میں ہوگی"[2]

مورخ بلاذری نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ "حضرت عمرؓ نے اہل نجران کو جلاوطن کرنے سے پیشتر ان کی جائدادیں اور ان کے اموال خرید لیے"[3] غرض یہ لوگ منتشر ہو گئے اور ان میں سے بعض شام چلے گئے بعض نے کوفہ کے نواح میں نجرانیہ بسایا اور اس کا یہ نام انھوں نے رکھا ہے[4]

"پھر جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوے تو نجرانیوں کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا معروضہ پیش کیا اس پر حضرت عثمانؓ نے ولید بن عقبہ کو جو کوفہ میں ان کے گورنر تھے لکھا کہ:۔

"اَمَّا بَعد میرے پاس نجران کا نمائندہ اور پادری اسقف اور چند معززین رسول اللہؐ کا فرمان لے کر آئے اور وہ پروانہ بھی انھوں نے مجھے دکھایا جو عمرؓ نے انھیں دیا تھا میں نے اس کے متعلق عثمان بن حنیف سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ میں اس معاملے میں غور و فکر کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ (شرط) زمینداروں کے لیے بہت نقصان دہ ہے کیونکہ اس کی وجہ سے وہ اپنی زمینوں سے

---

[1] معاہدہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ "جو سود کھائے وہ ضمانت سے خارج ہے" کتاب الاموال صفحہ ۱۸۸ [2] فتوح البلدان صفحہ ۶۶ ضلع نجران نیز کتاب الاموال صفحہ ۸۹ کتاب الاموال میں بجائے شام و عراق کے باشندوں کے شام و عراق کے امرا لکھا ہے۔ [3] فتوح البلدان صفحہ ۶۷ ضلع نجران [4] فتوح البلدان صفحہ ۶۹ ضلع نجران۔

محروم ہو جاتے ہیں اس لیے میں ان کو زمین کے معاوضہ میں لوجہ اللہ ان کے جزیہ میں سے دو سو حلے کم کر دیتا ہوں اور ان کے حق میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اس لیے کہ یہ وہ قوم ہے جس کا ذمہ لیا گیا ہے[1]۔

جلاوطنی کے اسباب:۔ اس نوبت پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ چند اسباب یکجا بیان کر دیے جائیں جن کی بنا پر غیر مسلم رعایا کی جزیرۃ نمائے عرب سے جلاوطنی عمل میں آئی، مسلمان مورخین اور بعض مستشرقین خاص کر سر ولیم میور[2] نے جو اسباب بیان کیے وہ یہ ہیں:۔

عیسائیوں کو جلاوطن کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انھوں نے حد سے زیادہ سود لینا شروع کیا تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنا حسد آپ کرنے لگے تھے اور خود انھوں نے یہ خواہش کی کہ انھیں جلاوطن کر دیا جائے، مورخ بلاذری نے بھی لکھا ہے کہ "جب اہل نجران کی تعداد چالیس ہزار ہوئی تو وہ آپس میں حسد کرنے لگے اور حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور خواہش کی کہ ہمیں جلاوطن کر دو وہ اول ہی ان کی تعداد سے متردد ہو رہے تھے انھوں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور جلاوطن کر دیا"۔ بعد ازاں ان لوگوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے دور میں آپ سے استدعا کی کہ حضرت عمرؓ کے حکم کو واپس لے لیا جائے لیکن حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "عمرؓ بڑے معاملہ فہم تھے میں ان کے خلاف عمل کرنا ٹھیک نہیں سمجھتا"[3]۔

ایک وجہ یہ تھی جیسا کہ اوپر بیان ہوا کثرت آبادی کی وجہ طاقتور ہوتے چلے جا رہے تھے اور ان کی ذات سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

یہودیوں کو جلاوطن کرنے کے یہ اسباب بیان کیے جاتے ہیں کہ اُن میں وبا پھوٹ پڑی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ بُرا برتاؤ کرنے لگے تھے نیز ان میں قتل و خونریزی کی وارداتیں بھی ہو چلی تھیں اور انھوں نے خود خلیفہ کے صاحبزادہ[4]

---

[1] کتاب الاموال صفحہ ۱۸۹ نمبر ۵۰۴ نیز فتوح البلدان صفحہ ۶۶ صلح نجران۔

[2] سر ولیم میور: انالس آف دی ارلی کلیفیٹ صفحہ ۲۲۴۔

[3] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۶۷ صلح نجران۔

حملہ کیا اور ضربات شدید پہنچائے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ جلاوطن کرتے وقت ان کی غیر منقولہ جائداد کا کافی معاوضہ دے دیا جاتا تھا یہ نہیں کہ جرمنی کے یہودیوں یا بھرت پور اور الور کے مسلمانوں کی طرح بے زر کر کے جلاوطن کر دیا اور زمینات پر زبردستی قبضہ کر لیا۔

(۱۲) یمن کی اراضی:۔ "جب اہل یمن کو رسول اللہؐ کے ظہور اور اعلائے حق کی خبر ہوئی تو ان کے وفد خدمت مبارک میں حاضر ہوئے آپ نے انھیں تحریر دی جس میں یہ اقرار تھا کہ وہ جن اموال و اراضی اور مدفون خزانوں پر قابض ہیں اسلام لانے کے بعد بدستور قابض رہیں گے[1] البتہ رسول اللہؐ نے جو لوگ اسلام لائے تھے ان پر زکوٰۃ اور ان کی اراضی پر لگان مقرر کیا جس کا تذکرہ آئندہ کیا جائے گا۔

(۱۳) یمامہ کی اراضی:۔ یمن کی طرح یمامہ کے باشندے بھی اسلام لے آئے۔ "رسول اللہؐ نے فرات بن حیان کو ایک زمین یمامہ میں جاگیر میں عطا فرمائی"[2]

(۱۴) حضرموت کی اراضی:۔ حضرموت کے لوگ بھی اسلام لے آئے اور ان کی اراضی اسلامی مملکت کا جز بن گئی "علقمہ بن وائل الحضرمی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے انھیں (یعنی علقمہ کے والد وائل کو) حضرموت میں ایک زمین جاگیر میں عطا فرمائی"[3]

(۱۵) عمان کی اراضی:۔ "رسول اللہؐ نے ۸ھ میں ابو زید انصاری اور عمرو بن العاص کو عبید اور جیفر، جلندی کے فرزندوں کے پاس فرمان مبارک دے کر روانہ فرمایا جس میں ان کو اسلام کی دعوت دی۔ یہ دونوں عمان گئے، عبید اور جیفر سے سمندر کے کنارے صحار میں ملے اور ان کو نبی کریمؐ کا فرمان مبارک دیا، انھوں نے اسلام قبول کیا پھر انھوں نے عربوں کو اسلام کی دعوت دی وہ اسلام لائے اور اس میں دلچسپی لینے لگے"[4] عمرو بن العاصؓ جو بعد میں فاتح مصر بنے

---

[1] - فتوح البلدان صفحہ ۷۰ الیمن۔ [2] کتاب الاموال صفحہ ۲۷۴ نمبر ۶۷۸، اقطاع النبی نیز فتوح البلدان صفحہ ۹۴۔ [3] - بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۷۳، الیمن۔

[4] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۷۶ عمان نیز طبری صفحہ ۱۶

عمان کے گورنر بنائے گئے" وہ ان کے اموال سے زکات اور ان کی اراضی سے لگان (عشر) وصول کرتے تھے۔[1]

غرض خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سالہ مدنی زندگی میں تقریباً دس لاکھ مربع میل کا علاقہ اسلامی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا۔ اور دس سال تک اوسطاً روزانہ دو سو چھہتر مربع میل کا رقبہ فتح ہوا۔[2] رسول کریم کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جو علاقے جنگ کے بعد بزور فتح ہوتے تو آپ ان کو شرکا، جنگ میں تقسیم کر دیا کرتے اور جو علاقے بغیر جنگ کیے حاصل ہوتے آپ اس کو سرکاری ملک قرار دیتے اور اس سرکاری ملک کا ایک حصہ اگر چاہتے تو اپنے اختیار تمیزی سے نادار صحابیوں میں تقسیم فرما دیتے لیکن جن علاقوں کے لوگ خود مسلمان ہو کر اپنے علاقے کو اسلامی سلطنت میں شامل کرنا چاہتے یا اہل کتاب اور مجوسی جزیہ دینا قبول کرتے تو ان کی زمینوں کو انہی کے پاس رہنے دیا جاتا اور ان تمام علاقوں میں بعض ایسی زمینوں پر جن پر اگر کوئی پہلے سے قابض نہ ہوتا تو رسول کریمؐ اس کو مختلف اشخاص کو ان کے کارہائے نمایاں کے صلے میں بطور جاگیر کے بھی عطا فرما دیتے تھے۔

عہدِ صدیقی کی کیفیت:۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔

اراضی سے متعلق رسول کریمؐ کا جو طرزِ عمل تھا آپ نے اسی کو برقرار رکھا آپ نے بھی چند زمینیں جاگیر میں عطا فرمائیں۔[3]

آپ کے عہد کی دو ایک باتوں کا تذکرہ ضروری ہے مرتدین کے پاس ابتداً جو زمینیں تھیں ان کی ملکیت کو آپ نے ختم کر دیا چنانچہ مورخ طبری کا بیان ہے کہ "جب مرتدین مغلوب ہوئے اور ان کا فتنہ خود انہی کے لیے تباہ کن ثابت ہوا اور امن و امان قایم ہوا تو بنو ثعلبہ اور اس علاقہ (ابرق لزاح مدینہ) کے قدیم متوطن پھر توطن کے لیے وہاں آئے مگر ان کو قابضوں نے اس ارادے میں کامیاب ہونے دیا وہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس مدینہ آئے اور پوچھا کہ ہم کو کیوں اپنی زمینوں میں

۱؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ طبری ۸ھ کے واقعات۔ ۳؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاموال باب اقطاع جاگیرات

۲؎ ڈاکٹر محمد حمید اللہ: قانون بین الممالک صفحہ ۴۴ طبع ثانی مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن

آباد ہونے سے روکا گیا؟ حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ اس علاقے پر تمھاری ملکیت باقی نہیں رہی یہ علاقہ اب میری ملک اور زیر تصرف ہے چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے ان کی درخواست نہیں مانی اور بنو ثعلبہ کے برخلاف انھوں نے ابرق کو مسلمانوں کے گھوڑوں کی چراگاہ بنا دیا اس کے بعد پھر اس تمام علاقہ کو اسی جنگ کی وجہ سے جو منکرین زکوٰۃ اور مسلمانوں میں ہوئی ابو بکرؓ نے زکوٰۃ کے جانوروں کی چراگاہ بنا دیا اور اس طرح ان چراگاہوں کو اوروں کے لیے محصور اور ممنوع قرار دیا۔[1]

حضرت صدیق اکبرؓ نے عراق کی فتح کے لیے خالد ابن ولیدؓ کو بھیجا تھا مسلمان تو آپ کے فوجی کارناموں پر فدا ہیں، یورپی مستشرقین خصوصاً فان کریمر اور سر ولیم میور نے بھی خالدؓ کی عظمت کا لوہا مانتے ہوئے انھیں دنیا کے نامور ترین سپہ سالاروں میں شمار کیا ہے۔ "عراق کی مہم میں خالدؓ کا سب سے پہلا مقابلہ ھرمز سے کاظم میں ہوا تھا اس کے بعد خالدؓ دوآبہ فرات میں دجلہ کے کنارے فروکش ہوئے۔" خالدؓ نے جنگجو لوگوں کی اولاد اور ان کے معاونین کو گرفتار کیا کاشتکاروں سے اور جن لوگوں نے دعوت اسلام کے بعد خراج دینا قبول کیا ان سے کوئی تعرض نہیں کیا اور جن لوگوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا وہ سب ذمی[2] بنا لیے گئے ان کی زمین انھی کے قبضے میں رہنے دی لیکن یہ عملدرآمد اس وقت تک کے لیے رکھا گیا جب تک کہ زمین تقسیم نہ ہو اس کے بعد یہ عمل باقی نہ رہے گا۔[3]

عہد فاروقی کی تفصیلات:۔ حضرت ابو بکرؓ کی وفات پر حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے۔

شام کی اراضی:۔ "حضرت عمر بن الخطابؓ کی خلافت کو پانچ مہینے گذرے تھے کہ اردن میں مقام فحل پر مسلمانوں کی اردن والوں سے مڈھ بھیڑ ہوئی تا آنکہ وہ

---

[1] طبری عہد خلافت راشدہ ۱۳ھ کے واقعات۔ [2] وہ غیر مسلم رعایا جس کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی مملکت قبول کرتی ہے۔ [3] تاریخ طبری صفحہ ۲۰۲۹ ۱۲ھ کے واقعات، غدار کا واقعہ۔

اس پر امان خواہ ہوئے کہ وہ اپنے پر جزیہ اور اپنی زمین پر خراج دیں گے مسلمانوں نے انھیں ان کی جان اور ان کے اموال پر امان دی۔[1]

ملک شام کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ نے تقسیم اراضی کا ارادہ فرمایا لیکن حضرت معاذ بن جبلؓ نے اراضی کو تقسیم نہ کرنے کا مشورہ دیا۔

"حضرت عمرؓ جابیہ آئے اور زمین مسلمانوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ وہ بزور فتح کی گئی تھی۔ معاذ بن جبلؓ نے ان سے کہا: خدا کی قسم اگر آپ نے اس کو تقسیم کیا تو اس کا نتیجہ وہ ہوگا جو ہم پسند نہیں کرتے بہت سا مال قوم کے قبضے میں چلا جائے گا پھر یہ لوگ مرجائیں اور مال ایک ہی جماعت کی نسل میں محدود رہے گا اس کے بعد ایک دوسری جماعت آئے گی جو اسلام کی مدافعت میں جانیں لڑائے گی مگر اسے کچھ نہ ملے گا۔ بس ایسا طریقہ اختیار کیجئے جو اول و آخر سب کے مفاد پر حاوی ہو۔ حضرت عمرؓ نے معاذؓ کی رائے پر عمل کیا۔[2]

انتظام اور فتوحات، ہر لحاظ سے عہد فاروقی تاریخ اسلام میں نہایت درخشاں نظر آتا ہے چنانچہ عہد فاروقی میں اسلامی مملکت کے حدود جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر اگر ایک طرف ایران ہوتے ہوئے ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچ گئے تو دوسری طرف افریقہ میں مصر کا بہت بڑا علاقہ فتح ہوا۔ اور پھر شام میں رومی سلطنت کا ایک بڑا علاقہ اسلامی سلطنت کے زیر نگیں آیا بایں ہمہ حضرت عمرؓ کے زمانے کی صرف دو فتوحات کا خاص طور پر ذکر کریں گے۔ (۱) ایک تو عراق میں دجلہ اور فرات کے درمیان کا سرسبز و شاداب علاقہ یعنے سواد کی فتح اور (۲) دوسرے دریائے نیل کے کنارے مصر کے علاقے کی فتح۔

(۱) سواد کی اراضی:۔ حضرت عمرؓ نے ۱۶ھ میں عراق کے سرسبز و شاداب منطقہ یعنے سواد[3] کے علاقے کو فتح کیا۔ امام ماوردی لکھتے ہیں کہ "سواد طول میں موصل حدیثہ سے

---

[1] فتوح البلدان صفحہ ۱۱۵ یوم فحل [2] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۱۵۲۔ جند قنسرین نیز کتاب الاموال صفحہ ۵۹ نمبر ۱۵۲ و ۱۵۳۔ [3] سواد "جب عربوں نے قریوں اور نخلستانوں اور درختوں کی کثرت دیکھی تو کہا کہ ہم نے اس سے زیادہ سواد نہیں دیکھا۔ سواد کالبد کو کہتے ہیں۔ اسی لیے اس کا نام

عباداں تک اور عرض میں عذیب قادسیہ سے حلوان تک کا رقبہ بائیس کروڑ پچاس لاکھ جریب ہوتا ہے اس میں سے ٹیلوں، شور زمینوں، قلعوں، پگ ڈنڈیوں، راستوں نہروں، شہروں، بستیوں، پن چکیوں، ڈاک خانوں، پلوں، بندرگاہوں، فواروں، نیستانوں اور اینٹ کی بھٹیوں وغیرہ کا سات کروڑ جریب کے لگ بھگ رقبہ نکال دیا جائے تو نصف کاشت کا رقبہ ہے[1]

"سواد کے فتح ہونے پر حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے درمیان سواد تقسیم کرنے کا ارادہ کیا اور حکم دیا کہ اس کی مردم شماری کی جائے چنانچہ مردم شماری کی گئی، معلوم ہوا کہ ایک ایک مسلمان کے حصے میں تین تین کسان پڑتے ہیں پھر انھوں نے رسول کریمؐ کے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ انھیں آزاد چھوڑ دو کہ وہ مسلمانوں کے لیے مستقل آمدنی کا ذریعہ رہیں، حضرت عمرؓ نے عثمان بن حنیف انصاریؓ کو بھیجا اور انھوں نے اہل عراق پر اڑتالیس یا چوبیس درہم فی کس کے حساب سے محصول عائد کر دیا"[2]

"غرض حضرت عمرؓ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے مفتوحہ اراضی مثلاً عراق اور شام کی اراضی کو فاتحین میں تقسیم کرنے کی منظوری صادر نہیں فرمائی اور یہ خیال ظاہر فرمایا کہ اگر ایسا کیا جائے گا تو آئندہ اسلامی نسل کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سواد رکھ دیا گیا" (فتوح البلدان صفحہ ۲۹۹ مدینۃ السلام)

"اس زمین کو سواد (سیاہ یا سبز) اس کے باغوں اور کھیتوں کی سرسبزی کی وجہ سے کہتے ہیں چونکہ جزیرۃ العرب خشک علاقہ ہے جس میں زراعت اور باغات کا نام نہیں، جب عرب اپنے گھروں سے باہر نکلے تو کھیتوں اور باغوں کی سرسبزی اور شادابی نظر آئی، سبزی اور سیاہی کو یہ لوگ ایک ہی نام سے موسوم کرتے تھے، فضل بن عباس بن عتبہ بن ابی لہب کا شعر ہے یہ شخص سیاہ فام تھا (بحر رمل) ۔

وَأَنَا الأَخْضَرُ مَنْ يَعْرِفُنِي ❊ أَخْضَرُ الْجِلْدِ مِنْ نَسْلِ الْعَرَبِ

اگر کوئی مجھے پہچاننا چاہتا ہے تو میں سبز کھال کا عربی النسل ہوں

لہٰذا عراق کی سرسبزی کو سواد سے تعبیر کیا" (ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۴ صفحہ ۱۶۴)

[1] الاحکام السلطانیہ باب ۱۴ صفحہ ۱۶۵؛ [2] کتاب الاموال صفحہ ۵۰ نمبر ۱۵ نیز فتوح البلدان صفحہ ۳۶۶ جلولاء کی جنگ ۔

کچھ نہ رہے گا" بخاری شریف میں ہے کہ

قَالَ عُمَرُ: لَوْلَا آخِرُ الْمُسْلِمِيْنَ مَا فُتِحَتْ قَرْيَةٌ اِلَّا قَسَمْتُهَا بَيْنَ اَهْلِهَا كَمَا قَسَمَ رَسُوْلُ اللهِ خَيْبَرَ۔[1]

حضرت عمرؓ نے کہا: اگر پچھلے مسلمانوں کا خیال نہ ہوتا تو جو قریہ (گاؤں) فتح کرتا اس کو مجاہدین میں تقسیم کر دیتا جیسا کہ رسول اللہؐ نے خیبر کو تقسیم کر دیا تھا۔

بخاری کی ایک اور روایت میں "حضرت عمرؓ کہتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ پچھلے لوگ یکساں مفلس رہ جائیں گے تو جو قریہ فتح ہوتا اسے تقسیم کر دیا کرتا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو تقسیم کر دیا تھا لیکن میں اسے خزانہ کے طور پر ان کے واسطے چھوڑ دیتا ہوں تاکہ وہ اسے تقسیم کرتے رہیں"[2]

"جب حضرت عمرؓ نے سواد فتح کر لیا تو لوگوں نے کہا کہ اس کو ہمارے درمیان تقسیم کر دو کیونکہ ہم نے اس کو بزور فتح کیا ہے۔ انھوں نے تقسیم کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ پھر ان مسلمانوں کے لیے کیا رہے گا جو تمھارے بعد آئیں گے؟ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں اس کو تقسیم کر دوں تو پھر تم آپس میں پانیوں پر بھی فساد کرو گے چنانچہ سواد والوں کو ان کی زمینوں پر بحال رکھا اور ان پر جزیہ اور ان کی زمینوں پر خراج عائد کیا اور اس کو ان کے (مسلم فاتحین) کے درمیان تقسیم نہیں کیا"[3]

حضرت عمرؓ نے جو مشورت کی اس کا احوال: بیان کیا جاتا ہے کہ اراضی تقسیم کرنے یا نہ کرنے کی بابت حضرت عمرؓ صحابہ کرامؓ سے کئی دن تک مشورہ کرتے رہے، مشورہ کیا تو لوگوں نے مطالبہ کیا کہ زمین تقسیم کر دی جائے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر یہ زمین وطن والوں کے ساتھ تقسیم کر دی جائے اور اس میں وراثت جاری ہو تو بعد میں آنے والے مسلمانوں کا کیا حال ہو گا؟ میری یہ رائے نہیں ہے۔ اس پر عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے

---

[1] بخاری کتاب الحرث والمزارعہ پ۹ نیز بخاری کتاب الجہاد پ۱۲ نیز بخاری کتاب المغازی پ۱۷ نیز ابوداؤد کتاب الخراج الامارۃ پ۱۹ نیز کتاب الاموال صفحہ ۷۵ نمبر ۱۴۳ نیز صفحہ ۸۵ نمبر ۱۴۸۔

[2] بخاری پ۱۲ کتاب المغازی النبی ۳ ۔ کتاب الاموال صفحہ ۷۵ نمبر ۱۴۶ نیز فتوح البلدان ۲۶۸ جلولاء کی فیصلہ کن جنگ۔

کہا تو پھر آپ کی کیا رائے ہے ؟ زمین اور وطن داروں دونوں کو خداوند تعالیٰ نے مسلمانوں کو بطور فے (مال غنیمت) کے دیا ہے حضرت عمرؓ نے جواب دیا بات تو یہی ہے جو تم کہتے ہو پر خدا کی قسم ! میرے بعد جو ملک فتح ہوگا اس میں کوئی بڑا فائدہ نہ ہوگا بلکہ ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کے سر کا وبال ہو جائے پس اگر عراق کی زمین وطن داروں کے ساتھ تقسیم کردی جائے اور اسی طرح شام کی زمین وطن داروں کے ساتھ تقسیم کردی جائے تو سرحدوں کی حفاظت کیونکر ہوگی ؟ شام، عراق اور اس شہر (مدینہ) اور اس کے علاوہ دوسرے شہروں کے چھوٹے بچوں اور بیوہ عورتوں کو کیا ملے گا ؟ لیکن لوگوں نے حضرت عمرؓ سے بڑا مباحثہ کیا اور کہا کہ خدا نے ہماری تلواروں کے ذریعے سے ہم کو جو مال غنیمت عطا فرمایا ہے اس کو آپ ایسے لوگوں پر وقف کرنا چاہتے ہیں جو جنگ میں شریک نہیں ہوئے آپ اس کو ایسے لوگوں کے لڑکوں اور پوتوں کو دینا چاہتے ہیں جو جنگ میں موجود نہ تھے لیکن حضرت عمرؓ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہتے تھے کہ یہ میری رائے ہے ۔"

"اب ان لوگوں نے کہا آپ اس معاملہ میں مشورہ کیجئے چنانچہ حضرت عمرؓ نے مہاجرین اولین سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی یہ رائے تھی کہ ان کے حقوق تقسیم کر دیئے جائیں اور حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ حضرت عمرؓ کے ہم رائے تھے۔"

"اب حضرت عمرؓ نے دس انصار کو (جنھیں کاشتکاری کا خاص تجربہ تھا) طلب فرمایا جن میں پانچ سردار شرفائے اوس کے اور پانچ سردار شرفائے خورج کے تھے۔ جب یہ لوگ جمع ہوئے تو حضرت عمرؓ نے پہلے خدا کی حمد و ثنا کی جو اس کے سزاوار ہے پھر کہا کہ میں نے آپ لوگوں کو صرف اس لیے تکلیف دی ہے کہ آپ لوگ میری ذمہ داریوں میں شریک ہوں کیونکہ میں بھی آپ ہی لوگوں کی طرح معمولی سا فرد ہوں اور آج آپ ہی لوگ حق قایم رکھ سکتے ہیں۔ کسی نے میری مخالفت کی اور کسی نے میری موافقت۔ اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ لوگ میری پیروی کریں۔ آپ کے ساتھ خدا کی حق گو کتاب ہے اگر میں کوئی ایسی بات کہوں جس کو میں کرنا چاہتا ہوں تو اس سے میرا مقصد صرف حق ہوگا۔ ان لوگوں نے کہا

اے امیر المومنین! فرمایئے ہم سنیں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ لوگوں نے ان لوگوں کی بات سن لی جو خیال کرتے ہیں کہ میں ان کے حقوق کو چھین لینا چاہتا ہوں اور میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں ظلم کا ارتکاب کروں۔ اگر میں ان سے کوئی ایسی چیز چھین لوں جو ان کی ہو اور اس کو دوسروں کو دے دوں تو میں بدبخت ہوں گا۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ کسریٰ کی سرزمین کی فتح کے بعد اگر تمام مال و جائداد اور وطنداروں کو مال غنیمت سمجھ کر تقسیم کر دیا جائے اور خمس کو میں اس کے مصارف میں صرف کر دوں تو کوئی دوسرا ملک فتح نہ ہو سکے گا۔ میری یہ رائے ہے کہ میں تمام اراضی کو وطنداروں کے ساتھ وقف قرار دوں اور ان زمینوں پر خراج اور ان کے سروں پر جزیہ عائد کر دوں تاکہ وہ فوجیوں، چھوٹے بچوں اور ان کے بعد آنے والے مسلمانوں کے لیے فئے ہو۔ کیا آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ ان سرحدوں کی حفاظت کے لیے بہت سے اشخاص کی ضرورت ہے جو وہاں جمع رہیں؟ کیا آپ لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ ان بڑے بڑے شہروں جیسے شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر کے لیے یہ ضروری ہے کہ فوجوں کے ذریعے ان کی حفاظت کی جائے اور ان کو گزارے (وظائف) دیے جائیں پھر اگر زمین اور وطندار تقسیم کر دیے جائیں تو پھر ان کو کہاں سے گزارہ دیا جائے گا؟"

"غرض ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہی کی رائے ٹھیک ہے اور آپ نے کیا اچھی بات کہی کہ اور اگر یہ سرحدیں اور اگر یہ شہر فوجوں کے ذریعہ محفوظ نہ رکھی جائیں اور ان کے وظیفے نہ مقرر کیے جائیں تو تمام کفار اپنے اپنے شہروں میں واپس چلے جائیں گے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اب میرے لیے معاملہ صاف ہو گیا جس شخص میں عقل و دانائی ہو گی تو وہ زمین کو حسب حال رکھے گا اور وطنداروں پر ایسا محصول لگائے گا جو اس کے لیے برداشت کے قابل ہو گا پس انھوں نے اس پر اتفاق کیا کہ عثمان ابن حنیفؓ کو اس اہم کام کے لیے بھیجا جائے کیونکہ یہ عقلمند اور تجربہ کار ہیں۔ غرض حضرت عمرؓ نے اراضی سواد کی پیمائش کے لیے انھیں مقرر کیا اور حضرت عمرؓ کے انتقال سے پہلے ہی سواد کوفہ کا خراج آنے لگا سالانہ دس کروڑ درہم آتے اور اس زمانے میں ایک درہم ۲-۱/۲ ڈھائی دانق کے برابر ہوتا تھا اس زمانے میں درہم کا وزن

مثقال کا وزن ہوتا تھا۔[1]

قاضی ابو یوسفؒ نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے مزید تفصیل بھی بیان کی ہے

چنانچہ "محمد بن اسحاق زہری سے روایت کرتے ہیں کہ جب سواد فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے مشورہ طلب کیا، عام رائے یہ تھی کہ اس کو تقسیم کر دیا جائے اور حضرت بلالؓ کو سب سے زیادہ اصرار تھا اور حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ اس کو یونہی رہنے دیا جائے اور تقسیم نہ کیا جائے اور بلال کے سخت اصرار پر کہا کہ اے خدا مجھے بلال اور ان کے ساتھیوں سے نجات دے غرض دو تین روز یا اس سے بھی زیادہ دن تک غور و فکر کرتے رہے پھر خود حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں نے ایک دلیل پائی ہے خداوند تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ

وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ

جو کچھ خدا نے اپنے پیغمبر کو ان لوگوں سے دلوایا تو تم لوگ اس پر اونٹ یا گھوڑے دوڑا کر نہیں گئے تھے لیکن خدا اپنے پیغمبروں کو جس پر چاہے غلبہ دلا دیتا ہے۔

وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

پ۲۸ الحشر ۵۹ ع۱

مذکورہ بالا آیت بنو نضیر کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ آیت تمام بستیوں کے بارے میں ہے کہ :-

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔

جو کچھ خدا نے بستی والوں کے مال سے اپنے پیغمبر کو دیا ہے تو وہ خدا کے لیے اور رسول کے لیے اور اس کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ دولت تمہارے مالداروں کے درمیان گردش کرتی نہ رہے، اور تم کو جو رسول دیں لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز آجاؤ اور خدا سے ڈرو بے شک خدا سخت سزا دینے والا ہے۔

پ۲۸ الحشر ۵۹ ع۱

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۱۵ فصل فی الخراج مطبوعہ بولاق مصر۔

پھر ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔

وہ مال ان مہاجر ناداروں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور مالوں سے نکالے گئے اور وہ خدا کے فضل اور اس کی رضا مندی کے طلبگار ہیں اور خدا اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ سچے ایمان دار ہیں

پ۲۸ الحشر ۵۹ ع۱

پھر اس پر اکتفا نہیں ہوئی بلکہ ان کے ساتھ اوروں کو بھی شامل کیا گیا

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

اور وہ مال ان انصار کے لیے ہے جنھوں نے ایمان میں سبقت کی اور دار الاسلام میں مہاجرین سے پہلے گھر بنایا، جو کوئی ان کے ہاں ہجرت کر کے آتا ہے تو وہ اس کو دوستی سے پیش آتے ہیں اور مہاجرین کو کچھ مال غنیمت کبھی زیادہ دیا جاتا ہے تو اس کی طرف سے اپنے دلوں میں کبھی حسد نہیں کرتے اور مہاجرین کو اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انھیں کتنی ہی احتیاج کیوں نہ ہو اور جو شخص اپنے نفس کو بخل سے محفوظ رکھے تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

پ۲۸ الحشر ۵۹ ع۱

پس یہ مذکورہ آیتیں جیسی ہم تک پہنچی ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے خاص کر انصار سے متعلق ہیں پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا یہاں تک کہ ان کو دوسروں سے ملا دیا پھر فرمایا

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔

نیز وہ مال ان لوگوں کے لیے ہے جو بعد میں آئیں اور وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لے آئے بخش دے اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کا حسد نہ ڈال۔ پروردگار! بیشک تو مشفق اور مہربان ہے۔

پ۲۸ الحشر ۵۹ ع۱

تو یہ تمام آئندہ آنے والوں کے لیے ہے اور اس بنا پر تمام مفتوحہ ممالک تمام لوگوں کا حق ٹھیرے ہے پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں موجودہ لوگوں میں تو تقسیم کردوں اور ان لوگوں کو محروم کردوں جو آئندہ پیدا ہوں گے بس لوگوں نے اس کو یونہی چھوڑ دینے پر اتفاق کرلیا اور اس کا لگان (خراج) وصول کیا گیا۔[1]

"جس دن عراق فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھا۔

اما بعد تمھارا مکتوب مجھے ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ لوگ مال غنیمت کی تقسیم چاہتے ہیں جو اللہ نے ان پر فئے کیا ہے جب میرا مکتوب تمھیں ملے تو تم یہ دیکھنا کہ اہل لشکر نے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں سے کتنا مال اور سواری و بار برداری کے کتنے جانور حاصل کئے ہیں (اور پھر خمس نکال کر) یہ چیزیں تمام مسلمانوں میں جو کہ وہاں حاضر ہیں تقسیم کر دینا اور زمینیں اور نہریں ان لوگوں کے لیے چھوڑ دینا جو ان میں کام کرتے ہیں تاکہ ان کی آمدنی، مسلمانوں میں عطا کے کام آئے کیونکہ اگر ہم انھیں تقسیم کر دیں گے جو اس وقت موجود ہیں تو ان کے بعد آنے والوں کے لیے کچھ بھی نہ رہے گا۔[2]

حکومت کی جانب سے اراضی کی خریدی:۔ حضرت عمرؓ نے نہ صرف غیر مسلموں کی اراضی خریدی تھی بلکہ فلاح عامہ کی خاطر مسلمانوں سے بھی خرید کی تھی۔

حضرت عمرؓ نے جریر بن عبداللہ البجلیؓ اور ان کے قبیلہ سے معاہدہ کیا تھا کہ اگر وہ عراق کی فتح میں مدد دیں تو اُن کو چوتھائی حصہ دیا جائے گا۔[3] جنگ قادسیہ میں قبیلہ بجیلہ کل فوج کا چوتھا حصہ تھے اس وجہ سے حضرت عمرؓ نے بجیلہ کے لیے سواد کا چوتھا حصہ مقرر کیا تھا اور وہ ان کے ہاتھ میں دو یا تین برس رہا عمار بن یاسرؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور ان کے ساتھ جریر بن عبداللہؓ بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے جریر بن عبداللہؓ سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے جریر! اگر میں ذمہ دار تقسیم کرنے والا نہ ہوتا تو جو کچھ تم کو دے چکا ہوں اس پر قائم رہتا لیکن

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج صفحہ ۱۵۔ [2] کتاب الاموال صفحہ ۵۹ و ۱۵۰ نیز فتوح البلدان صفحہ ۲۶۵ [3] جلولا کی فیصلہ کن جنگ نیز ابو یوسف، کتاب الخراج صفحہ ۴ مطبوعہ بولاق مصر

اب میں دیکھ رہا ہوں کہ لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے تو اب میری یہ رائے ہے کہ تم اس کو واپس کردو۔ غرض جریرؓ نے واپس کر دیا اور حضرت عمرؓ نے اسّی دینار (بطور انعام) عطا کیے[1] اور ایک روایت ہے کہ "حضرت عمرؓ نے قبیلہ بجیلہ سے سواد کا چوتھائی حصہ لے لیا اور ان کے لیے دو ہزار درہم وظیفہ مقرر کر کے ان سے سمجھوتہ کر لیا"[2]

یہاں یہ بات ذکر کے قابل ہے کہ حکومت معاوضہ دے کر اراضی تو لے سکتی ہے لیکن زبردستی یہ نہیں چھین سکتی۔

وَلَیْسَ لِلْاِمَامِ اَنْ یُخْرِجَ شَیْئًا مِنْ یَدِ اَحَدٍ[3] — امام (صدر حکومت) کو اس بات کا اختیار نہیں کہ کسی کے قبضہ اور ملک سے زمین کو چھین لے۔

غیر مسلم رعایا سے زبردستی زمین لینے کی ممانعت اسلامی حکومت قانوناً زبردستی زمینیوں کی زمینیں بھی نہیں لے سکتی" امام (حکومت) کو جائز نہیں اور نہ قانوناً اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی مسلمان سے یا ذمی سے جس نے اسلامی حکومت سے معاہدہ کیا ہو اس کو اس کے حق سے محروم کر دے۔ اور نہ اس کو یہ حق ہے کہ زبردستی کوئی چیز اس کے قبضے سے نکال لے"[4]

(۲) **مصر کی اراضی** جب شام کا علاقہ فتح ہو گیا تو حضرت عمرؓ کے ایما سے عمرو بن العاصؓ ساڑھے تین ہزار کا لشکر لے کر ۱۹ھ میں مصر کی جانب روانہ ہوئے پھر زبیر بن العوامؓ کے ساتھ بارہ ہزار کی جمعیت دیکر حضرت عمرؓ نے انھیں مدد پہنچائی پھر جب "عمرو بن العاصؓ نے مصر بغیر کسی عہد کے فتح کیا تو زبیر بن العوامؓ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا:۔ اے عمرو! زمین تقسیم کرو۔ عمرو بن العاصؓ نے کہا کہ میں اس کو تقسیم نہ کروں گا۔ زبیرؓ نے کہا کہ تقسیم کرنا ہی

---

[1] کتاب الاموال صفحہ ۶۱ نمبر ۱۴۸ نیز فتوح البلدان صفحہ ۲۶۸۔ [2] فتوح البلدان ص ۲۶۵ جلولا کی جنگ۔ [3]، [4] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۳۵

پڑے گا جس طرح رسول اللہؐ نے خیبر تقسیم فرما دیا تھا۔ عمرو بن العاصؓ نے کہا میں اس کی تقسیم نہ کروں گا جب تک کہ اس کی بابت حضرت عمرؓ کو نہ لکھ دوں۔ چنانچہ انھوں نے اس کے متعلق حضرت عمرؓ کو لکھا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں جواب میں لکھا کہ اس کو آئندہ نسلوں کے لیے یونہی رہنے دو[1]۔"

"عمرو بن العاصؓ کے فرزند عبداللہؓ کہتے ہیں کہ لوگ مصر کے معاملے میں مشتبہ ہیں ایک جماعت کہتی ہے کہ بزور فتح کیا گیا اور دوسری کہتی ہے کہ بصلح فتح کیا گیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب میرے والد یہاں آئے تو باب الیونہ کے باشندوں نے ان سے جنگ کی انھوں نے اس کو بزور فتح کیا اور مسلمانوں کو اس میں داخل کر دیا۔ زبیرؓ پہلے شخص تھے جو اس کے قلعہ پر چڑھے یہاں کے حاکم نے میرے والد سے کہا کہ تم نے شام میں جو کچھ کیا ہمیں معلوم ہے تم نے عیسائیوں اور یہودیوں پر جزیہ لگایا اور زمین اس کے مالکوں کے پاس رہنے دی کہ وہ اس کو آباد کریں اور خراج دیتے رہیں اگر تم ہمارے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرو گے تو ہمیں قتل کرنے اور لونڈی غلام بنانے اور جلاوطن کرنے کی بہ نسبت یہ تمھارے لیے زیادہ مفید ہوگا چنانچہ میرے والد نے مسلمانوں سے مشورہ کیا سب نے یہی رائے دی لیکن چند لوگ اس کے خواستگار تھے کہ زمین آپس میں تقسیم کر دی جائے ....."

"عمرو بن العاصؓ نے اہل مصر کو تحریر دی اور ان سے یہ شرط کر لی کہ اگر وہ اس کی پابندی کریں گے تو ان کے بال بچے فروخت نہیں کیے جائیں گے اور یہ کہ ان کے اموال اور خزانے انہی کے قبضے میں رہیں گے پھر اس کے متعلق امیرالمومنین حضرت عمرؓ کو لکھا انھوں نے اس کی اجازت دے دی اور اس طرح یہاں کی زمین خراجی ہو گئی اس شرط و معاہدہ کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ مصر بصلح فتح ہوا[2]۔"

---

[1] کتاب الاموال صفحہ ۵۸ نمبر ۱۴۹ نیز فتوح البلدان صفحہ ۲۱۴ فتح مصر والمغرب نیز فتوح البلدان صفحہ ۲۱۸ فتوح مصر والمغرب نیز فتوح مصر لابن عبدالحکم المتوفی ۲۵۷ھ م ۸۷۱ء صفحہ ۸۸ مطبع لیڈن

[2] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۱۵ فتوح مصر والمغرب نیز مقریزی ج ۱ ص ۲۵ تا ۲۷

اس تمام تفصیل سے معلوم ہو گا کہ زرخیز زمینوں سے بڑے پیمانے پر دولت حاصل ہوتی ہے اس لیے حضرت فاروق اعظمؓ نے دُوراندیشی سے کام لے کر عراق، شام اور مصر کی اراضی کو حکومت کی نگرانی میں لے لیا۔

عہد عثمانیؓ اور عہد حیدریؓ کی کیفیت:۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اسلامی مملکت میں اور وسعت ہوئی اگر ایک طرف ایران کے آگے آرمینہ اور آذربائیجان اور روسی ترکستان[1] کا علاقہ فتح ہوا تو دوسری طرف براعظم افریقہ میں اسلامی فوجیں مصر اور طرابلس سے آگے تونس الجزائر اور مراکش تک پہنچ گئیں اسی عہد میں اسلامی بحریہ نے بحیرۂ روم کے بعض جزائر پر بحری فتح حاصل کی، بعض مستند اسلامی اور یورپی مورخین مثلاً طبری اور گبن کا بیان ہے کہ اندلس (اسپین) کا ایک حصہ بھی عہد عثمانی میں فتح ہو چکا تھا۔[2]

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے عہد خلافت میں اسلامی سلطنت اور وسیع ہوئی لیکن مفتوحہ اراضی سے متعلق رسول اللہؐ جو کا طرز عمل تھا اور جو اصول عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں قرار پا چکے تھے انہی پر عمل درآمد رہا۔

عراق، شام اور مصر وغیرہ کی اراضی کو حضرت عمرؓ اور دیگر خلفائے راشدینؓ نے بیت المال کی جائداد قرار دیا یعنے اس کو قوم کی مشترکہ جائداد (کامن پراپرٹی) بنا دیا اور زمینداری نظام کو رائج ہونے نہ دیا لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اسلامی معاشیات شخصی تملیک کی قائل نہیں صحیح نہیں ہے اس لیے کہ مال غنیمت کی تقسیم حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی شخصی تملیک کی صورت میں ہوتی تھی نیز رسول کریمؐ نے خیبر کی اراضی کو صحابہ میں تقسیم کر دیا تھا نیز خلفائے راشدین نے بھی چند جاگیریں عطا فرمائیں پس معلوم ہوا کہ تملیک ہو یا تقسیم اسلامی معاشیات ان دونوں کے متعلق مطلق اضافی رائے رکھتی ہے تقسیم دولت میں تسویہ اور تفضیل ضرورت

---

[1] یہ علاقے آج کل سوویٹ روس کی عملداری میں ہیں۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ طبری صفحہ ۲۸۱۶، ۲۷ھ کے واقعات، مطبوعہ لیڈن نیز گبن؛ تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روما ج ۵ صفحہ ۵۵۵ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

اور حالات و آمدنی کے لحاظ سے دونوں اختیار کیے جا سکتے ہیں جیسا کہ ابوبکر صدیق نے تسویہ دولت پر عمل فرمایا اسی طرح تملیک میں بھی دونوں صورتوں کی گنجائش ہے یہ امام یا حکومت وقت کی رائے اور اختیارِ تمیزی پر موقوف ہے جن چیزوں کے متعلق چاہے مناسب خیال کرتے ہوئے شخصی تملیک کا طریقہ اختیار کرے یا مناسب معلوم ہو تو قومی تملیک کی راہ اختیار کرے[1]۔

بہر طور اسلامی معاشیات کی رو سے یہ طریقہ بھی صحیح ہے کہ حکومت ہی تمام زمین کی مالک ہو اور اس کے ذریعہ سے جو لگان وصول ہو اس سے تمام قوم مستفید ہو کہ

اَلْخَرَاجُ فَیْئٌ لِجَمِیْعِ الْمُسْلِمِیْنَ[2]۔ — خراج تمام مسلمانوں کی مشترکہ آمدنی ہے۔

امام اعظمؒ کے الفاظ میں

اِنَّ نَوَاحِیَ دَارِ الْاِسْلَامِ تَحْتَ یَدِ اِمَامِ الْمُسْلِمِیْنَ وَیَدُہٗ یَدُ جَمَاعَۃِ الْمُسْلِمِیْنَ[3] — اسلامی سرزمین کے جملہ حصے امام (صدر مملکت) کے زیر اقتدار ہوتے ہیں اور اس کا اقتدار مسلمانوں کی جماعت ہی کا اقتدار ہوتا ہے۔

زمین کو شخصی ملکیت بنا دیا جائے یہ بھی درست ہے لیکن انھیں بھی لگان بشکل عشر دینا ہی پڑتا ہے اسی طرح حکومت چند اراضی کو چاہے تو خرید کر مشترکہ ملک بنا سکتی ہے جیسا کہ رسول کریمؐ نے ارادہ فرمایا تھا یا حضرت عمرؓ نے خرید لیا تھا غرض زمین کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے جس میں قوم کے ہر فرد کو مساوی حق ملکیت حاصل ہونا چاہیے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قدرت کے اس عطیہ کا حقیقی مالک خود خدا کی ذات ہے۔

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِہٖ ۔ (پ ۹ الاعراف ع ۵) — زمین تو اللہ کی ہے[I] اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب ÷ بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

اقبال "ضرب کلیم"

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاموال ص ۵۵ [2] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۴۶
[3] سرخسی مبسوط ج ۱ ص ۹۳ ۔ [I] دنیا میں اس مسئلہ پر کش مکش ہے کہ زمین اور منابع پیداوار کا مالک کون ہے؟ اسلام کا تصور ہے کہ "زمین خدا کی ملکیت ہے"۔ یہ فلسفیانہ نظریہ نہیں ہے بلکہ

ان حقیقتوں کا مطالعہ یہ بتلاتا ہے کہ اسلامی معاشیات نے کس طرح میانہ روی کی حکمت عملی کو پیش کیا ہے اور افراط و تفریط سے بچ کر ایک ایسا راستہ نکالا ہے جس میں مطلق خانگی املاک کی اراضی کی گنجائش نہیں رکھی اور اشتراکیت کے نقصانات سے بچایا گیا ہے زمین پر افراد کا حق ملکیت تسلیم ہے اور عام حالات میں اس میں کوئی مداخلت اور مزاحمت نہیں کی جاتی جب تک کہ زمین کے مالک حکومت کو مقررہ معاوضہ بشکل لگان ادا کرتے رہیں لیکن مفاد عامہ کا تقاضا ہو تو حکومت اس میں مداخلت کرے چنانچہ معقول معاوضہ ادا کرنے کے بعد حکومت کو یہ حق رہتا ہے کہ وہ اس پر قبضہ کرلے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اسلامی قانون کا بنیادی اصول ہے۔ اسلامی قانون کا دوسرا اصول یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے کوئی کام ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ شریک نہ ہو۔ جاگیرداری کی اسلام میں گنجائش نہیں اور نہ ہی ایسی زمینداری جائز ہے جس کے تحت زمین پر کاشت کرنے والا کسان غلام بن کر رہ جائے۔ اگر کسی طریقہ سے زمین کی پیداوار بڑھائی جاسکے اور مزدور اور کسانوں کو نقصان نہ ہو تو اسلامی اصول کے تحت حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسا طریقہ نافذ کردے۔ اگر وراثت کی وجہ سے زمین اتنی کم رہ جائے کہ اقتصادی فائدہ نہ حاصل ہوسکے تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کا علاج تجویز کرے۔ عوام الناس کے مفاد کو کسی فرد واحد کی خاطر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت عمرؓ نے حالات کے تحت مقبوضہ ملکوں میں عربوں کے حق ملکیت کو تسلیم نہیں کیا تھا لیکن جب حالات بدل گئے تو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ان کو اجازت دے دی گئی۔ زمین کی ملکیت کے متعلق کسی مخصوص نظام کو ہم اسلامی یا غیر اسلامی نہیں کہہ سکتے۔ اسلام کا اصل اصول عدل اور انصاف ہے۔"

اسلامی ممالک کی معاشی کانفرنس میں فضیلت مآب غلام محمد صاحب
وزیر مالیہ پاکستان کی تقریر
"الصدق" حیدرآباد دکن مورخہ ۱۸ر صفر المظفر ۱۳۶۹ھ م ۹ر دسمبر ۱۹۴۹ء (بحوالہ اردو ڈائجسٹ)

(ب) مسئلہ لگان

لگان کا مفہوم اور اس کی وسعت

زمین کے استعمال کا معاوضہ عام طور سے لگان کے نام سے موسوم ہے "لگان ایک وسیع لفظ ہے جس کا اطلاق کانوں، چراگاہوں اور آب پاشی کے حقوق وغیرہ کی صورت میں بھی ہوتا ہے[1]

ڈاکٹر تھامس نے لگان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "عام فہم اصطلاح میں یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ کسی مکان کا اس زمین کے ساتھ جس پر کہ مکان قائم ہے اس کے استعمال کا معاوضہ نیز کھیت یا جائداد پر تصرف کی بناء پر جو معیادی معاوضہ پٹہ دار زمیندار کو ادا کرتا ہے یا حکومت جو مالگذاری وصول کرتی ہے یا کسی جنگل، ماہی گیری کے مقام یا معدن سے اس کے مالک کو لکڑی، مچھلی یا معدنی شئے نکالنے کے استحقاق کی بناء پر جو معاوضہ ملتا ہے اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے[2]

پہلے صرف زرعی اغراض کے لیے جو زمین استعمال کی جاتی ہے اس کے معاوضہ سے متعلق بحث کی جائے گی۔

عہدِ رسالت میں لگان کے مسائل

اسلامی معاشیات نے اراضی کے استعمال کرنے پر معاوضہ وصول کرنے کا جو

۱۔ سر محمد اقبال: علم الاقتصاد صفحہ ۱۵۲۔

۲۔ ایس۔ ای، تھامس: ایلیمنٹس آف اکنامکس باب ۱۷ صفحہ ۲۲۲۔

طریقہ بتایا ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے جاہلی عرب میں لگان وصول کرنے کے طریقوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

جاہلیت میں لگان کے خاص طریقے:۔ ”عرب کے قدیم معاشی نظام“ باب۔ میں طائف اور مدینہ میں لگان کے جو طریقے رائج تھے ان کا تذکرہ کیا گیا یہاں کچھ تفصیل بیان کرتے ہوئے ان کی خصوصیتوں کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

”بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے مشرکین عرب کے ہاں کھیتوں اور مویشیوں کی پیداوار کے متعلق ایک نظام موجود تھا جس کا ایک حصہ انھوں نے خدا کے لیے مقرر کیا تھا جو فقیروں، مسکینوں پر صرف کیا جاتا تھا اور دوسرا حصہ بتوں کے لیے رکھا گیا تھا جو بت خانے کے متولیوں پر صرف کیا جاتا تھا لیکن وہ لوگ بتوں کے مقررہ حصے کی نگرانی بڑے اہتمام سے کرتے تھے اس لیے اس کا کوئی جزو دوسرے کو نہیں مل سکتا تھا لیکن خدا کے مقررہ حصے کی یہ حالت نہ تھی بلکہ اس میں سے بت خانہ کے متولی بھی کچھ فائدہ اٹھاتے تھے“[1] ان کے یہاں کھیتوں کی پیداوار کا جو ایک حصہ نکالا جاتا تھا قرآن مجید میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا ، فَقَالُوْا: هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ، سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔	اور انھوں نے کھیتی اور مویشی کا ایک حصہ خدا کے لیے مقرر کیا تھا وہ اپنے خیال کے موافق کہتے کہ یہ خدا کا ہے اور یہ ہمارے شریکوں کا، شریکوں کا حصہ تو خدا کو نہیں پہنچتا لیکن جو خدا کا حصہ ہوتا وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا، یہ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں۔

پ۸ الانعام ۶ ع۱۶

مفسر بیضاوی مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”وہ لوگ کھیت کی پیداوار کا ایک حصہ خدا کے لیے مخصوص کر دیتے تھے جس کو وہ مہمانوں اور فقیروں پر

---

[1] محمد الخضری: تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۵۳ زکوٰۃ۔ مطبوعہ مصر

صرف کرتے تھے اور اس کے کچھ حصے کو اپنے دیوتاؤں کے لیے خاص کر اس کی رکھوالی میں صرف کرتے تھے[1] یہ تو اسی صورت میں ہوتا تھا جبکہ کسانوں کی اپنی زمین ہوتی تھی لیکن دوسروں کی زمین لے کر کاشت کرنے اور استعمال کا معاوضہ ادا کرنے کا طریقہ بھی ان کے یہاں رائج تھا۔

طائف میں لگان کا طریقہ :- طائف کے قدیم معاشی نظام باب ۱ صفحہ ۲۱ پر بتایا گیا ہے کہ ایک فریق یعنی بنو عامر نے زمین فراہم کی تھی اور دوسرے فریق یعنی بنو ثقیف نے اس پر محنت کی تھی ان دونوں قبیلوں یعنی بنو عامر اور بنو ثقیف میں پیداوار کو آدھوں آدھ بانٹنے کا دستور تھا۔ ثقیف جو کہ کاشت کار تھے وہی سب کچھ کرتے تھے اور بنو عامر جو کہ زمیندار تھے وہ نہ صرف زمین فراہم کرتے بلکہ جب کبھی دوسرے قبیلے ثقیف پر حملہ آور ہوتے تو یہ حملے سے انھیں بچاتے تھے رفتہ رفتہ ثقیف والے دولت مند ہوتے چلے گئے اور اس قابل ہو گئے کہ اپنی حفاظت آپ کر سکیں اس لیے مجموعی پیداوار کا پچاس فیصد بڑی دینا انھیں بار گراں گذرا۔ آئے دن وہ طاقت ور ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ انھوں نے زمینداروں کو لگان دینا بند کر دیا اور آخر میں تو زمینداروں کو سرے سے بے دخل ہی کر دیا آفتاب اسلام کے طلوع کے وقت ثقیف اپنی کاشت کی اراضی کے خود مالک ہو چکے تھے۔

مدینہ میں لگان کے طریقے :- مدینہ میں لگان دینے کے طلوع اسلام کے وقت جو طریقے رائج تھے ان کی تفصیل باب ۱ کے صفحہ ۸۶ تا ۸۷ پر بیان ہو چکی ہے (۱) پہلا طریقہ یہ تھا کہ زمین ہی کے ایک حصہ کی پیداوار زمین کے مالک کے لیے بطور لگان کے خاص کر دی جاتی تھی چنانچہ "رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ تمام اہل مدینہ میں سب سے زیادہ کھیتی باڑی ہمارے یہاں ہوتی تھی ہم زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے اور زمین کا ایک حصہ زمیندار کے لیے نامزد کر دیا جاتا تھا تاکہ جو کچھ اس میں پیداوار ہو اس کو وہ اپنے لگان کے معاوضہ میں

---

[1] ۔ تفسیر بیضاوی صفحہ ۲۷۱ ج ۱ مطبوعہ نولکشور پریس۔

لے لے، اس حصہ پر کبھی کوئی آفت آجاتی تھی اور باقی کھیت اچھی حالت میں رہتا تھا اور کبھی باقی کھیت پر کوئی آفت آجاتی تھی اور وہ ٹھیک رہتا تھا تو ہمیں اس کی ممانعت کر دی گئی اور سونا چاندی (لگان میں دینے کا) اس وقت رواج نہ تھا۔[1]
اس سے واضح ہوا کہ رسول اللہ نے اس طریقہ کو منسوخ قرار دیا تھا۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ تھا کہ تری کی پیداوار تو زمیندار لیتا اور خشکی کی پیداوار کاشتکار لیتا تھا۔ رافع بن خدیج بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت رسول اللہؐ کے زمانہ میں نہروں کے کناروں اور نالیوں کے سروں پر جو پیداوار ہوتی ہے اس کے بدلے میں اور کبھی اور پیداوار پر زمین کو کرایہ پر چلاتے تو کبھی ایک چیز تلف ہو جاتی اور دوسری بچ جاتی اور کبھی یہ تلف ہوتی اور وہ بچ جاتی پھر بعضوں کو کچھ کرایہ نہ ملتا مگر وہی جو بچ رہتا تھا۔[2] رسول اللہؐ نے اس طریقہ کی بھی ممانعت فرما دی۔

(۳) لگان ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ کاشتکار لگان میں زر کے بجائے کچھ غلہ دے دیتا تھا چنانچہ ظہیر بن رافعؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے رسول خداؐ نے بلا کے یہ پوچھا کہ تم اپنے کھیتوں کو کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہم ان کو ¼ چوتھائی (پیداوار) پر اور کبھی کھجور اور جَو کے چند وسق کے بدلے کرایہ پر دیتے ہیں۔[3]

(۴)۔ چوتھا طریقہ یہ تھا کہ کل پیداوار کا کچھ حصہ کاشتکار زمین کے مالک کو دیتا تھا "لوگ تہائی، چوتھائی اور نصف (پیداوار) پر زمین پر کھیتی باڑی کیا کرتے تھے"[4] گویا یہ بٹائی کا طریقہ تھا۔

رافع بن خدیجؓ جن کا گھرانا مدینہ کے سب سے بڑے کاشتکاروں میں گنا جاتا تھا ان کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں زر یا سکہ کو لگان میں دینے کا رواج نہ تھا اور اہل مدینہ اس سے ناواقف تھے۔ زر کی شکل میں لگان

---

[1]۔ بخاری پ ۹ باب المزارعۃ۔ [2]۔ مسلم ج ۲ کتاب البیوع۔
[3]۔ بخاری پ ۹ باب المزارعۃ۔ [4]۔ بخاری پ ۹ باب المزارعۃ۔

وصول کرنے کو اسلامی معاشیات جائز قرار دیتی ہے البتہ پیداوار کے لحاظ سے لگان وصول کرنے کے بارے میں اسلامی فقہاء اختلافی رائے رکھتے ہیں معاشی نقطۂ نظر سے بھی یہ طریقہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا خود آنحضرتؐ کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے جس کو ہم ابھی بیان کریں گے کہ آپ لگان بشکل زر وصول کرنے کا طریقہ ہی رائج کرنا چاہتے تھے بشکل پیداوار لگان وصول کرنے میں جو خرابی ہے اس کو مثال کے ذریعہ یوں واضح کیا جا سکتا ہے "فرض کرو کہ کاشت کار از روئے معاہدہ زمین کی کل پیداوار کا ایک ربع حصہ بطور لگان ادا کرنا ضروری ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کاشتکار کی محنت و جانفشانی کی بدولت جس قدر مقدار میں اضافہ ہوگا اسی قدر لگان کی مقدار بھی بڑھتی جائے گی گویا جو اضافہ پیداوار محض کسان کی کوششوں کا نتیجہ ہے اس میں زمیندار بھی حصہ بانٹ لیتا ہے"[1]

لگان کے مذکورہ طریقے میں جس طرح کاشتکار کا نقصان ہوتا ہے اسی طرح زمیندار کا نقصان بھی ممکن ہے مثلاً ہو سکتا ہے کہ کاشتکار ضرورت سے بڑھ کر زمین تو لے مگر اس پر کچھ محنت نہ کرے اور یوں زمیندار کو نقصان اٹھانا پڑے حالانکہ اسلامی اصول یہ ہے کہ

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ — نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔

پ ۳ بقرہ ع ۳۸

غرض لگان دینے کا ایسا طریقہ ہونا چاہیے کہ نہ تو کاشتکار کا نقصان ہو اور نہ زمین کے مالک کا۔ اس کے لیے مناسب طریقہ یہی ہے کہ لگان کا تعین بعینہ زر کی شکل میں کیا جائے، گو خود حضور اکرمؐ نے خیبر کو نصف پیداوار پر دیا تھا اور خود رسول کریمؐ کے عہد میں اور بعد کے زمانہ میں بھی لوگ پیداوار کے کچھ حصے پر زمینوں کو کرایہ پر دیتے رہے جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے کہ لوگ رسول اللہؐ کے زمانہ میں کھیت کو تہائی اور چوتھائی پیداوار کے بدلے کرایہ پر

---

[1] - پروفیسر حبیب الرحمٰن: معاشیات صفحہ ۷۶ -

دیتے تھے" نیز ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ "ہم رسول اللہؐ کے عہد میں اپنے کھیت چوتھائی پیداوار اور کچھ گھانس کے بدلے کرایہ پر دیتے تھے"[1] تو اس کو ناجائز کہنے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی بخاری شریف ہی سے آنحضرتؐ کے ایک مخفی منشاء کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ خود اس طرح پیداوار کی شکل میں لگان وصول کرنے کے طریقے کو برقرار رکھنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ "رافع بن خدیج بن رافعؓ اپنے چچا حضرت ظہیرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ "رسول کریمؐ نے ہمیں ایک ایسے کام سے منع فرمادیا کہ جس سے ہمیں بہت آسانی ہوتی تھی میں نے کہا کہ جو کچھ رسول کریمؐ نے فرمایا ہے وہی حق ہے انھوں نے کہا کہ ایک دن مجھے رسول اللہؐ نے بلایا اور فرمایا کہ تم اپنے کھیتوں کو کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہم ان کو چوتھائی پیداوار پر اور کبھی کھجور اور جو کے چند وسق کے بدلے کرایہ پر دیتے ہیں، آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو یا تو خود ان پر زراعت کرو یا کسی سے ان پر زراعت کرالو یا ان کو اپنے پاس روکے رکھو، رافع کہتے ہیں کہ میں نے کہا ہم نے یہ سن لیا اور اب ایسا ہی کریں گے"[2]

رسول اللہؐ کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پیداوار کی شکل میں لگان لینے کے طریقے کو روک کر زر کی شکل میں ہی لگان لینے کا طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے چنانچہ رافع بن خدیجؓ بیان کرتے ہیں کہ "مجھ سے میرے چچا نے بیان کیا کہ لوگ رسول کریمؐ کے زمانے میں کھیت کو چوتھائی پیداوار پر یا کسی ایسی چیز کے بدلے میں جس کو زمین کا مالک مستثنیٰ کر لیتا تھا زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے تو ہمیں نبی کریمؐ نے اس سے منع فرمادیا، میں نے رافع سے کہا کہ دینار و درہم کے عوض کرایہ پر دینا کیسا ہے؟ انھوں نے کہا کہ دینار اور درہم کے بدلے کچھ حرج نہیں، حدیث کے راوی امام لیث بن سعد کہتے ہیں کہ آپ نے اس سے جو ممانعت فرمائی تھی اگر حلال اور حرام (کی علت) کے سمجھنے والے اس پر غور کرتے تو وہ اس کو ہرگز جائز نہ سمجھتے کیونکہ اس میں نقصان کا اندیشہ تھا"[3]

---

[1] بخاری پ ۹ باب المزارعۃ۔ [2] بخاری پ ۹ باب المزارعۃ۔
[3] بخاری پ ۹ باب المزارعۃ۔

بخاری کی ایک حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ لگان زرہی کی شکل میں
ہونا چاہیے چنانچہ رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ "ہم سب انصار سے زیادہ زراعت
کرنے والے تھے، ہم زمین کرایہ پر دے دیا کرتے تھے (اور ایک حصہ اسی زمین کا
کرایہ میں مقرر کر لیا کرتے تھے) تو کبھی اس حصے میں پیداوار ہوتی اور کبھی پیداوار
نہ ہوتی تھی اس لیے ہمیں اس کی ممانعت کر دی گئی اور چاندی کے سکے کے
بدلے کرایہ پر دینے کی ہمیں ممانعت نہیں کی گئی"[1] صحیح مسلم میں بھی اسی کی سی
حدیث ہے البتہ آخری الفاظ یہ ہیں کہ "اگر کرایہ کے بدل کوئی معین شئے
جس کی ذمہ داری ہو ٹھیرے تو اس میں کوئی قباحت نہیں"[2]
رسول کریمؐ اور خیبر کی اراضی:۔ تقسیم اراضی کی بحث میں بتایا گیا ہے کہ رسول کریمؐ
نے خیبر کی فتح کے بعد خیبر کے یہودیوں کو جلاوطن کر دینا چاہا تھا بعد میں اراضی پر
کام کرنے والوں کی کمی کے باعث ان سے بٹائی پر معاملہ طے کر لیا" آپ نے
خیبر یہودیوں کو اس شرط پر دیا تھا کہ وہ اس میں کام کریں اور وہاں زراعت
کریں اور جو کچھ اس میں پیدا ہو اس کا نصف ان کو ملے گا"[3] جب بٹائی کا وقت
آیا تو رسول کریمؐ نے ابن رواحہ کو خیبر روانہ کیا۔ انھوں نے یہودیوں سے کہا
رسول اللہؐ نے مجھے یہاں اس واسطے نہیں بھیجا ہے کہ تمھارا مال کھا جاؤں
بلکہ آپ نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ تمھارے اور مسلمانوں کے درمیان
باہمی تقسیم کا طریقہ جاری کر دوں، تم چاہو تو میں اندازہ کر کے نصف تمھیں
دے دوں اور اگر چاہو تو تم خود اندازہ کر کے نصف ہمیں دے دو (یہ سن کر)
یہودی کہنے لگے کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں"[4] ابن رواحہ نے
چالیس ہزار وسق تخمینہ لگایا اور بیس ہزار وسق مسلمانوں کے لیے لے لیا اور

---

[1] ۔ بخاری پ۱۰ کتاب الشروط ۔ [2] مسلم الجزء الرابع کتاب البیوع ۔
[3] ۔ بخاری پ۱۰ کتاب الشروط نیز بخاری پ۹ باب المزارعۃ نیز بخاری پ۱۰ کتاب الشرکتہ
نیز بخاری پ۹ کتاب السلم نیز بخاری پ۱۰ کتاب النبی، بخاری کے علاوہ مسلم موطا اور ابوداؤد وغیرہ
[4] ۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۱۹ بروایت عبداللہ بن عباسؓ ۔ نیز فتوح البلدان صفحہ ۳۵

بیس ہزار وسق یہودی کاشتکاروں کے لیے رکھ چھوڑا"۔[1]

غرض ہر سال جب بٹائی کا موقع آتا تو "عبداللہ بن رواحہ پیداوار کی باہمی تقسیم کے لیے خیبر جاتے تھے اور وہ ان کی پیداوار کا اندازہ لگاتے تھے، جب اہل خیبر ان سے اس کی شکایت کرتے کہ آپ نے ظلم کیا تو وہ کہتے کہ تم کو اختیار ہے کہ چاہے اندازہ کا نصف ہمیں دو یا تم لے لو۔ دونوں میں سے جو مقدار چاہو ہمیں دو، اس پر یہودی کہتے کہ اسی عدل پر آسمان اور زمین برقرار ہیں، عبداللہ بن رواحہؓ زندگی بھر مقاسمہ کرتے رہے"۔[2]

"بٹائی کے طریق میں مزدوروں سے اجرت پر کام لینے کے طریق کے مقابل یہ فائدہ ہے کہ بٹائی کاشتکار کے لیے ایک محرک کا کام کرتی ہے اور وہ تا امکان زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرتا ہے لیکن اس میں بظاہر ایک یہ نقص بھی ہے کہ زمیندار بھی پیداوار میں شریک ہوتا ہے"[3] لیکن جیسا کہ ابھی تذکرہ ہوا صحابہؓ یہودی کاشتکاروں کے ساتھ عدل انصاف کا برتاؤ کرتے تھے۔

"یہ بات ظاہر ہے کہ بٹائی کے فائدے قابل لحاظ ہیں جب کہ زمین کے پتے چھوٹے چھوٹے ہوں اور کاشتکار غریب ہوں اور زمیندار بھی معمولی چیزوں کے لیے لالچی نہ ہوں لیکن بٹائی کا طریقہ بڑے بڑے پٹوں کے لیے ٹھیک نہیں ایک قابل اور بھروسے کے کسان کو مستعدی دکھانے کا اس میں موقع نہیں ہے"۔[4] اس بنا پر حضرت عمرؓ کے عہد میں بڑے بڑے قطعات اراضی عراق، شام اور مصر کے علاقے میں فتح ہوئے تو وہاں بجائے بٹائی کے لگان کا طریقہ جاری کیا گیا۔

بہر حال رسول کریمؐ کے آخری زمانہ تک۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت تک خیبر میں یہی عمل درآمد رہا پھر حضرت عمرؓ نے انھیں جلاوطن کر دیا چنانچہ "عبداللہ ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو

---

[1] مصنف ابی داؤد۔ [2] تاریخ طبری سنہ ۷ھ کے واقعات ۱۵۸۹ نیز فتوح البلدان ص ۲۶ اور صفحہ ۲۷۔ [3] ٹاسگ: پرنسپلز آف اکنامکس ج ۲ صفحہ ۹۷۔

[4] مارشل: پرنسپلز آف اکنامکس صفحہ ۶۴۵ آٹھواں ایڈیشن

حجاز سے نکال دیا رسول کریمؐ نے جب خیبر پر غلبہ پایا تو وہاں سے آپ نے یہودیوں کو نکال دینے کا ارادہ کیا اور جس وقت خیبر فتح ہوا اسی وقت وہاں کی زمین اللہ اور اس کے رسول اور تمام مسلمانوں کی ہو گئی تھی۔ پس جب آپ نے وہاں سے یہودیوں کو نکال دینا چاہا تو یہودیوں نے رسول کریمؐ سے درخواست کی کہ آپ اُن کو وہاں اس شرط پر رہنے دیں کہ وہ وہاں کام کریں گے اور انھیں نصف پھل ملیں گے اور ان سے رسول کریمؐ نے فرمایا تھا کہ ہم اس شرط پر تم کو جب تک چاہیں گے یہاں رکھیں گے چنانچہ وہ وہاں رہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ان کو (مقام) یتماء اور اریحا کی طرف نکال دیا۔[1]

خیبر سے یہودیوں کی جلاوطنی کے بارے میں عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ "جب خیبر والوں نے میرے ہاتھ پاؤں میں ضرب پہنچائی تو حضرت عمرؓ خطبہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے اور کہا کہ بے شک رسول اللہؐ نے خیبر کے یہودیوں سے ان کے مالوں کی بابت معاملہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ جب تک اللہ تم کو قائم رکھے گا ہم بھی تم کو قائم رکھیں گے۔ اس وقت یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ اپنی جائداد پر جو وہاں ہے گئے تو ان پر شب کے وقت ظلم کیا گیا اور ان کے دونوں ہاتھ اور پیر توڑ ڈالے اور ان یہودیوں کے سوا کوئی ہمارا دشمن وہاں نہیں ہے اور ہمارا شبہہ انھیں پر ہے اور اب میں ان کو جلاوطن کر دینا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔"

"پھر جب حضرت عمرؓ نے اس بات کا پکا ارادہ کر لیا تو ابو الحقیق کی اولاد میں سے کوئی شخص (مدینہ) آیا اور کہا کہ اے امیر المومنین! کیا آپ ہمیں نکال رہے ہیں؟ حالانکہ محمد (صلعم) نے ہمیں رکھا تھا اور (خیبر کے) مالوں کی بابت ہم سے معاملہ کیا تھا اور اس بات کی ہمارے لیے شرط کر لی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں رسول اللہ کا یہ ارشاد بھول گیا کہ تیرا کیا حال ہوگا جب تو خیبر سے نکالا جائے گا؟ تیرا اونٹ تجھے راتوں میں لے کر

---

[1] بخاری پ۱۲ کتاب الجہاد نیز بخاری پ۹ کتاب المزارعۃ۔

لیے لیے پھریگا۔ اس نے کہا کہ یہ تو ابو القاسم کا مذاق تھا حضرت عمرؓ نے کہا کہ اے خدا کے دشمن! تو جھوٹ کہتا ہے۔ پھر ان سب کو حضرت عمرؓ نے نکال دیا اور جو کچھ ان کا تھا یعنے میوے، اونٹ، اسباب، پالان اور رسیوں وغیرہ کی قسم سے ان سب کی قیمت انھیں دے دی[1]

قرآن مجید میں لگان کا تذکرہ

اگرچہ معاشی لگان کی صورت بہت خاص ہے جو بقدر گنجایش آگے پیش ہوگی۔ تاہم اسلامی فقہ میں بعض دیگر صورتیں بھی لگان کے مماثل پائی جاتی ہیں۔ جس وقت کہ رسول اکرمؐ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو ایسے انصار جن کے یہاں کھجور کے درخت تھے اپنے پھلوں کا کچھ حصہ اپنی خوشی سے نکالا کرتے اور لاکر مسجد میں لٹکا دیا کرتے تھے، نادار لوگ ان کو کھا لیا کرتے تھے کچھ لوگ خراب کھجوریں ہی لاکر لٹکا دیتے چنانچہ "براء بن عازب کہتے ہیں کہ جب کھجور توڑنے کے دن آتے تو انصار خراب کھجوروں کے خوشے رسول کریمؐ کی مسجد میں اس کے ستونوں کے درمیان رسی سے باندھ کر لٹکا دیتے اور نادار مہاجرین ان کو کھاتے تھے"[2] اسی بناء پر قرآن نے حکم دیا کہ

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا! اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِنَ الْاَرْضِ۔	اے مسلمانو! خدا کی راہ میں اپنی کمائی کا اچھا حصہ خرچ کرو اور اس چیز میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے

پ ۳ البقرۃ ۲ ع ۳۷

"براء بن عازب کا بیان ہے کہ مذکورہ آیت ہم انصار کی جماعت کے حق میں نازل ہوئی، ہم لوگوں کے پاس کھجور کے درخت تھے تو ہم لوگ تھوڑے بہت جتنے کھجور کے درخت ہوتے ان کے پھل لے آتے کوئی ایک خوشہ لے آتا کوئی دو خوشے پھر ان کو مسجد میں لٹکا دیتے اور اہل صُفہ میں ایسے لوگ تھے جن کی گذر بسر کے لیے کچھ نہ تھا جب ان میں سے کوئی بھوکا ہوتا ان خوشوں کے پاس آکر لکڑی سے مارتا اور جو کھجوریں ان میں سے گر پڑتیں وہ کھا لیتا

---

[1] بخاری پ ۱۱ کتاب الصلح ۔ [2] تفسیر طبری ج ۳ صفحہ ۱۵ آیت انفقوا من طیبات ما کسبتم

چند لوگ جو نیکی کی جانب مائل نہ تھے ایسے بھی خوشے لے آتے جن میں خراب یا ٹوٹے ہوئے پھل ہوتے اور ان کو نا کر لٹکا دیتے تب مذکورہ آیت نازل ہوئی[1]

مذکورہ بالا قرآنی آیت کے علاوہ ذیل کی آیت میں بھی زرعی پیداوار کی لگان دینے کا حکم ہے کہ

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ ۔ جب پھل پک جائیں تو انھیں کھاؤ۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۔ اور فصل کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔

پ الانعام ۶ ع ۱

رسول کریمؐ کا لگان کی شرح معین فرمانا

چونکہ قرآن مجید کی آیتیں مطلق تھیں اور ان میں لگان کی شرح کا تعین نہ تھا اس لیے خود آنحضرتؐ نے قرآن کے شارح ہونے کی حیثیت سے لگان کی شرح معین فرمادی بہت سی حدیثیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول کریمؐ نے لگان کی شرح مقرر فرمائی تھی جس کی بناء پر آپ کے عاملین عرب کے مختلف حصوں کے باشندوں سے لگان وصول کرتے تھے۔

پھر رسول کریمؐ مختلف والیوں (گورنروں) کے نام تقرر کے جو فرمان صادر فرماتے تو ان میں بھی لگان کا تذکرہ ہوتا۔ اسی طرح مختلف قبیلوں کے سردار جب اسلام لے آتے تو آپ انھیں بھی لگان سے متعلق احکام لکھ بھیجتے رسالتمآبؐ نے "عمرو بن حزم الصاریؓ" کو نجران میں بنو حارث بن کعب کا والی مقرر کیا تاکہ ان کو دین اسلام کی تعلیم دیں اور ان سے صدقات وصول کریں اس کے متعلق آپ نے عمرو بن حزم کو تقرر کا فرمان عنایت فرمایا اس میں آپ کے احکام ذیل کے فرمان سے واضح ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ عہد محمد النبیؐ کی جانب سے عمرو بن حزم کے نام ہے جو ان کو یمن بھیجتے وقت لکھا جاتا ہے..... اور مومنین کی زمینوں میں سے بقدر عشر ۱/۱۰ لگان وصول کریں

[1] تفسیر طبری ج ۳ صفحہ ۱۵ آیت مذکور نیز ترمذی ابواب التفسیر ج ۱ ص ۱۰۱

لگان کی یہ مقدار ان زمینوں کے متعلق ہے جو بارش یا چشمے سے سیراب ہوئی ہوں اور جو ڈول سے سیراب ہوئی ہوں ان سے نصف عشر ½ لیا جائے ..... [۱]

اسی طرح آپ نے ملوک حمیر کے نام جو فرمان روانہ کیا تھا اس میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ "..... اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو، نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، مال غنیمت میں سے اللہ اور اس کے رسولؐ کا پانچواں حصہ نکال کر ادا کرو۔ اس کے علاوہ زمین کا لگان دو، جو زمین چشمے یا بارش سے سیراب ہو اس میں سے عشر دیا جائے اور جو ڈول سے سیراب ہو اس میں سے نصف عشر۔ [۲]

رسول اللہؐ نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کا مصدق (ٹیکس کلکٹر) مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ کھجور، گیہوں، جو، انگور (یا کہا کہ کشمش) پر عشر $\frac{1}{10}$ اور نصف عشر $\frac{1}{20}$ ہے۔ [۳]

عتاب بن اسید جو مکہ میں آنحضرتؐ کے گورنر تھے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے مکہ کے گورنر عتاب بن اسید کو ثقیف کے تاکستانوں کے جانچنے کا حکم دیا تھا جس طرح کہ نخلستانوں کی جانچ کی جاتی ہے اس کی تفصیل مالیات کے باب میں کی گئی ہے، عتاب بن اسید بیان کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ میووں اور انگوروں کی جانچ کرنے کے لیے لوگوں کو بھیجا کرتے تھے۔ [۴]

حضرت عمر فاروقؓ کا انتظام حضرت عمرؓ نے مفاد عامہ اور آئندہ نسلوں کے مفاد کے تحفظ کا خیال پیش نظر رکھتے ہوئے صحابہ کے مشورہ سے عراق، شام اور مصر کے بڑے بڑے زرخیز اراضی کے قطعات کو تقسیم نہ کیا اور اس کو تمام مسلمانوں کی ملکیت عامہ قرار دیا تھا اس فیصلہ کے بعد ہی حضرت عمرؓ نے سواد کی پیمائش کے لیے عثمان بن حنیفؓ کو روانہ کیا اور انھوں نے نہایت عمدگی سے سواد کی پیمائش کی اور اراضی کا بندوبست کیا

۱۔ تاریخ طبری سنہ۱۰ھ کے واقعات نیز فتوح البلدان صفحہ ۷۰ بروایت محمد بن اسحاق۔

۲۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۷۱۸ سنہ ۹ھ کے واقعات نیز فتوح البلدان صفحہ ۷۲۔

۳۔ فتوح البلدان صفحہ ۷۰ الیمن۔ ۴۔ ابن ماجہ ابواب الزکوٰۃ۔

كَانَ عُثْمَانُ عَالِماً بِالْخَرَاجِ فَمَسَحَهَا مَسَاحَةَ الدِّيبَاجِ۔[1] عثمان بن حنیفؓ کو لگان میں مہارت تھی انھوں نے (زمین کی) اس طرح پیمائش کی جس طرح دیباج کا کپڑا ناپا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ اور دیگر خلفاء راشدینؓ نے لگان کا تعین کیونکر کیا؟ اور لگان وصول کرنے کے لیے کیا کیا انتظامات کیے؟ اس کی زیادہ تفصیل[2] کی یہاں گنجائش نہیں البتہ ذیل میں چند اہم اور ضروری امور کا تذکرہ کیا جاتا ہے مالیات کے باب میں بھی اس کی کچھ تفصیل کی گئی ہے۔

مختلف پیداوار کی مختلف شرح لگان

اسلامی عہد میں مختلف پیداوار کی لگان کی مختلف شرح مقرر کی گئی تھی "عثمان بن حنیفؓ نے سواد کی پیمائش کرلی تو کل زمین تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب تھی، حضرت عمرؓ نے فی جریب ایک درہم اور ایک قفیز خراج مقرر کیا[3] یہ تو ابتدائی اندازہ معلوم ہوتا ہے پھر" حضرت عمرؓ نے سواد میں ہر جریب پر خواہ عامر (آباد) ہو

---

[1] ۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۲۲ "ماعمل بہ فی سواد"

[2] ۔ خاص مسئلہ لگان پر قاضی ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ نے خلیفہ ہارون رشید کی فرمائش پر کتاب الخراج کے نام سے ایک مستند کتاب لکھی ہے نیز ابو عبید قاسم بن سلام کی کتاب کتاب الاموال میں بھی تفصیل موجود ہے۔ ابو عبید کے شاگرد بلاذری کی کتاب فتوح البلدان اور نیز ماوردی کی کتاب الاحکام السلطانیہ نیز قاضی ابویعلی کی الاحکام السلطانیہ اور یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج میں بھی لگان کی تفصیلیں پائی جاتی ہیں۔ خود اسلامی فقہ کی ہر کتاب میں لگان اور اراضی سے متعلق قانونی بحثیں پائی جاتی ہیں چنانچہ ھدایہ، امام شافعیؒ کی الام، سرخسی کی مبسوط میں اس کا تفصیل سے تذکرہ ہے، پروفیسر فان برشم نے بھی فرانسیسی زبان میں ایک کتاب مسلمانوں کے قانون مالگذاری پر لکھی ہے۔

[3] ۔ کتاب الاموال صفحہ ۶۹ نمبر ۱۷۵ نیز فتوح البلدان صفحہ ۲۶۹ جلولا کی جنگ

خواہ غامر (غیر آباد۔ بنجر) لیکن پانی اس تک پہنچتا ہو ایک درہم اور ایک قفیز خراج مقرر کیا اور رطبہ (کھیرا، ککڑی، تربوزہ وغیرہ) کے ایک جریب پر پانچ درہم اور پانچ قفیز اور درختوں کے ایک جریب پر دس درہم اور دس قفیز مقرر کیے اور انگور کے ایک جریب پر دس درہم اور دس قفیز مقرر کیے، راوی نے نخلستان کا ذکر نہیں کیا ہے[1]

عثمان بن حنیفؓ نے کافی جانچ پڑتال کے بعد حضرت عمرؓ کو لگان کی نئی شرح کے متعلق لکھا اور انھوں نے منظوری دے دی چنانچہ مورخ بلاذری کا بیان ہے کہ "عثمان بن حنیفؓ نے زمین کی پیمائش کی اور کھجوروں کی ایک جریب پر دس درہم، انگوروں کی ایک جریب پر چار درہم اور جو کی ایک جریب پر دو درہم خراج معین کر کے حضرت عمرؓ کو لکھا انھوں نے منظوری دے دی ہے[2]

امام ماوردی لکھتے ہیں کہ "خراج کی مقدار زمین کی حیثیت پر ہے حضرت عمرؓ نے عراق کے بعض حصوں پر فی جریب ایک قفیز اور ایک درہم مقرر کیا تھا آپ نے اس میں کسریٰ بن قباد (شاہ ایران) کے فیصلے کو اختیار کیا سب سے پہلے اسی نے زمینوں کی پیمائش، حدبندی خراج اور دفاتر قائم کیے اور زمین کے متعلق تمام ایسے امور کا لحاظ کیا جس سے زمیندار اور کاشتکار دونوں کو نقصان نہ پہنچے، اس نے فی جریب ایک قفیز اور ایک درہم مقرر کیا تھا قفیز کا وزن ۸ رطل کا تھا جس کی قیمت مثقال کے وزن سے تین درہم تھی دورِ جاہلیت کے عربوں میں اسی خراج کا رواج تھا چنانچہ زہیر بن ابی سلمیٰ اپنے معلقہ میں کہا ہے کہ ؎ (بحر طویل)

فَتُغْلِلْ لَكُمْ مَا لَا تُغِلُّ لِأَهْلِهَا ٭ قُرًى بِالْعِرَاقِ مِنْ قَفِيزٍ وَدِرْهَمِ

اس لڑائی کے نتیجے اتنے زیادہ کثیر ہوں گے کہ عراق کے دیہات کی آمدنی کے قفیز اور درہم بھی اتنے نہ ہوں گے۔

اور دوسرے علاقے پر اور مقدار معین فرمائی تھی چنانچہ عثمان بن حنیفؓ کو وہاں عامل

---

[1] کتاب الاموال صفحہ ۶۹ نمبر ۱۸۴ نیز فتوح البلدان صفحہ ۲۶۹ نیز ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۲۰ [2] فتوح البلدان صفحہ ۲۶۹ جلولاء کی جنگ۔

بنا کر بھیجا اور یہ حکم دیا کہ وہاں کی پیمائش کے بعد حیثیت کے موافق زمین پر خراج لگائیں
انھوں نے پیمائش کر کے حسب ذیل تجویز کیا، انگور اور گھنے درختوں پر فی جریب
دس درہم، کھجور پر آٹھ درہم، نیشکر پر فی جریب چھ درہم، ترچیزوں پر پانچ درہم،
گیہوں پر چار درہم، جو پر دو درہم اور اس کو لکھ کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں
ارسال کر دیا۔ آپ نے اسے منظور کر کے نافذ فرما دیا۔ شام کے علاقے میں کچھ
اور مقرر فرمایا۔ بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے زمین کی حیثیت سے
خراج مقرر کیا تھا[1]

دیگر خلفاء راشدینؓ کے عہد میں لگان کی شرح

حضرت عمرؓ کے بعد دوسرے خلفاء نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا چنانچہ[2] ابوزید الانصاری اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے
حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس علاقے میں بھیجا جسے دریائے فرات سیراب
کرتا ہے حضرت علیؓ نے بہت سے دیہات کا ذکر کیا اور حکم دیا کہ۔

۱۔ گیہوں کے گھنے کھیت کی ہر جریب پر ڈیڑھ درہم اور ایک صاع غلہ۔

۲۔ اوسط درجہ کے کھیتوں کی ہر جریب پر ایک درہم۔

۳۔ جو کھیت چھدرے ہوں ان کی ہر جریب پر $\frac{1}{3}$ درہم۔

۴۔ جو کے کھیتوں پر اس کا نصف اور یہ بھی حکم دیا کہ باغوں پر جس میں
نخلستان اور دوسرے درخت ہوں فی جریب ۱۰ درہم۔

۵۔ انگوروں پر جب کہ ان کو کاشت کیے تین برس گذر کر چوتھا برس
اور بار آور ہو چکے ہوں فی جریب دس درہم[2]

"حسین بن صالح نے حسن سے پوچھا کہ خراج کی یہ مختلف شرحیں کیوں ہیں!
انھوں نے کہا کہ یہ مختلف زمانوں میں مقرر کی گئی ہیں اور ان کے مقرر کرنے میں
مورلی (فارم) سے مارکٹوں (اسواق) اور بن گھاٹ کا قرب و بعد ملحوظ رکھا گیا ہے[3]"

---

[1] ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۳ ص ۱۴۲ مطبوعہ مصر

[2] فتوح البلدان صفحہ ۲۷۱ جلولاء کی جنگ

[3] فتوح البلدان صفحہ ۲۷۱ جلولاء کی جنگ۔ بروایت یحییٰ بن آدم

مالگذاری کی شرح کا تعین

مالگذاری کی شرح کے تعین میں کافی اعتدال اور بڑی احتیاط کی ضرورت ہے چنانچہ قرآن مجید کی جس آیت یعنے "واتوا حقہ یوم حصادہ"[1] سے مالگذاری وصول کرنے کا مفہوم لیا گیا ہے اسی کے بعد آیت ولاتسرفوا (حد سے نہ گزرو) کا ذکر ہے اس کی تشریح مفسرین[1] یہی کرتے ہیں کہ حکومت نہایت احتیاط اور اعتدال سے کام لے اور ناحق زیادہ مالگذاری نہ لے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب کہ اسلامی سلطنت کو عراق اور مصر کے زرخیز علاقوں سے مالگذاری وصول ہو رہی تھی آپ نے بڑی احتیاط اور اعتدال کی پالیسی اختیار کی چنانچہ جب سواد کی پیمائش کا ارادہ کیا تو حذیفہ[I] کو لکھا کہ ان کے پاس خوخی کے ایک دہقان[2] کو بھیجا جائے اسی طرح عثمان بن حنیف کو بھی لکھ بھیجا کہ ان کے پاس عراق سے ایک دہقان کو بھیجا جائے چنانچہ ان دونوں نے ایک ایک دہقان کو بھیجا اور ان کے ساتھ اہل حیرہ میں سے ایک مترجم کو بھی روانہ کیا جب یہ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم عجمیوں کو زمینوں پر کس قدر خراج دیا کرتے تھے کہنے لگے کہ ۲۷ درہم۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں پھر آپ نے ہر ایک جریب پر جس تک پانی پہنچ سکتا ہو خواہ وہ عامر ہو یا غامر گیہوں یا جو کا ایک قفیز اور ایک درہم عائد کیا[3]
"عراق کا خراج دس کروڑ اوقیہ آتا تھا اور ہر سال حضرت عمرؓ دس کوفہ والوں کو اور دس بصرہ والوں کو طلب کرتے اور وہ چار مرتبہ خدا کو حاضر ناظر جان کر

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر طبری ج ۸ صفحہ ۴۲ بروایت ابن زید

[I] "حضرت عمرؓ نے حذیفہ بن الیمانؓ کو دجلہ کے اس پار بھیجا اور عثمان بن حنیف کو اس کے سوا تمام عراق کے علاقوں پر مقرر کیا تھا (ابو یوسف بکتاب الخراج صفحہ ۲۱ نیز بلاذری صفحہ ۲۶۹)

[2]۔ دہقان کا لفظ عربی میں گاؤں کے مکھیا، چودھری، پٹیل، دیسمکھ، دیس پانڈے وطندار وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

[3]۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۲۱۔

گواہی دیتے کہ یہ مالگذاری کسی ذمی (معاہد) یا مسلمان سے زبردستی نہیں لی گئی ہے اور یہ کہ وہ مال طیب ہے[1]"

اسی طرح مصری اراضی کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاصؓ کو لکھا کہ مقوقس سے جو رومیوں کے زیر انتداب مصری حکمران تھا مشورہ لیا جائے نیز آپ نے ایک لگان کے ماہر قبطی کو بلا کر مدینہ میں اس کا بیان لیا[2]" مصری زمین پر فی جریب ایک دینار اور تین اردب گیہوں خراج اور ہر بالغ پر دو دینار مقرر کرکے عمرو بن العاصؓ نے حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دے دی[3] جس کی حضرت عمرؓ نے توثیق فرمائی۔ مرتے دم تک حضرت عمرؓ کو یہی خیال تھا کہ لگان کی شرح کم سے کم رہے

"عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو ان کے شہید ہونے سے چند دن پہلے مدینہ میں دیکھا کہ حذیفہ بن یمانؓ اور عثمان بن حنیفؓ کے پاس کھڑے ہوئے کہہ رہے تھے کہ تم دونوں نے کیا کیا؟ کیا تمھیں اس بات کا خیال ہے کہ تم نے سواد کی زمین پر اتنا لگان لگا دیا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتی؟ ان دونوں نے کہا نہیں ہم نے اس پر اتنا لگان لگایا ہے جس کی وہ طاقت رکھتی ہے اس میں بہت زیادتی نہیں ہے، حضرت عمرؓ نے کہا کہ غور کرو شاید تم نے اس زمین پر اتنا لگان لگا دیا ہو جسے وہ اٹھا نہ سکتی ہے' ان دونوں نے کہا کہ نہیں پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اللہ نے اگر مجھے سلامت رکھا تو میں اہل عراق کی بیوہ عورتوں کو اس حال میں کر دوں گا کہ وہ میرے بعد کبھی کسی کے محتاج نہ ہوں، عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ پھر اس کے چوتھے ہی دن وہ شہید کر دیے گئے......[4]"

غرض بندوبست اراضی کے ایسے جامع اور مفصل طریقے رائج کیے گئے اور اس بات کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا کہ کاشتکاروں پر زیادہ بار نہ پڑے

---

[1] - ابو یوسف بکتاب الخراج صفحہ ۶۵ - [2] - مقریزی بکتاب الخطط صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۰ مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ نیز ابن عبد الحکیم فتوح مصر صفحہ ۱۶۱ -

[3] فتوح البلدان صفحہ ۲۱۵ فتوح مصر ۱۰ نیز [4] بخاری پ۱۴ فضائل عثمانؓ -

اور یہ ایسے طریقے تھے جن پر آج کی مہذب حکومتیں بھی اس سے بہتر طریقے پر جانچ نہیں کر سکتیں فرانس کے ایک لائق مصنف نے لکھا ہے کہ "یہ بات مسلّم ہے کہ اسلام کی فتوحات میں خراج اور مالگذاری کے معاملہ کو بہت دخل ہے رومن سلطنت میں باشندگان ملک کو جو سخت خراج ادا کرنا پڑتا تھا اس نے مسلمانوں کی فتوحات کو نہایت تیزی سے بڑھایا مسلمانوں کے حملوں کا جو مقابلہ کیا گیا وہ اہل ملک کی طرف سے نہ تھا بلکہ حکومت کی طرف سے تھا، مصر میں خود قبطی کاشتکاروں نے یونانیوں کے برخلاف مسلمانوں کو مدد دی دمشق اور حمص میں عیسائی باشندوں نے ہرقل کی فوج کے مقابلہ میں شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے اور مسلمانوں سے کہدیا کہ ہم تمھاری حکومت بمقابلہ بے رحم رومیوں کے بہت زیادہ پسند کرتے ہیں"[1]

خراج اور عُشر کی تشریح

ذیل میں خراج اور عشر کی کچھ تشریح کی جاتی ہے بحیثیت ملک اور حکم کے تمام اسلامی مملکت کی اراضی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا (۱) خراجی (۲) عشری

"خراج عربی زبان میں کرایہ اور پیداوار کو کہتے ہیں"[2] فقہاء کی اصطلاح میں خراج اراضی کے استعمال کا سرکاری معاوضہ ہے جو اسلامی حکومت اپنی ذمی رعایا سے وصول کرتی ہے اس لگان کا تعین حکومت اپنے اختیار تمیزی سے زمین کی پیمائش اور پیداوار کی جانچ کے بعد ہی کرتی ہے۔

عُشر کے لغوی معنے دسویں حصے کے ہیں اور اصطلاح میں پیداوار کا وہ حصہ مراد ہے جو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اسلامی حکومت مسلمانوں سے وصول کرتی ہے اور اس کا تعین خود رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ "جس زمین کو بارش کا پانی سیراب کرے یا چشمے سیراب کریں یا خود بخود پیدا ہو تو اس میں عشر $\frac{1}{10}$ ہے۔ اور جو زمین کنوین کے پانی سے سینچی جائے اس میں نصف عشر ہے"[3]

خراج اور عشر کے فرق کو مختصر لفظوں میں یوں واضح کیا جاسکتا ہے

---

[1] ۔ شمس العلماء شبلی نعمانی: الفاروق حصہ دوم صفحہ ۹۴ نامی پریس کانپور ۱۸۹۹ء۔

[2] ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۰ [3] بخاری باب ۵۶ کتاب الزکوٰۃ نیز مسلم، موطا اور ترمذی کے ابواب الزکوٰۃ۔

"خراج زمین سے اور عشر زراعت سے لیا جاتا ہے۔"[1]

"علاء بن الحضرمی بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہؐ نے بحرین یا ہجر کو بھیجا مجھے ایک ایسے باغ سے محصول وصول کرنے کی صورت پیش آئی جو چند بھائیوں کی مشترکہ ملک تھا۔ ان میں سے ایک بھائی مسلمان ہو چکا تھا باقی اپنے دین پر قائم تھے۔ جو بھائی اسلام لے آیا تھا میں اس کے حصے سے تو عشر وصول کرتا تھا اور باقی بھائیوں کے حصوں سے خراج وصول کرتا تھا۔"[2]

فقہاء نے تفصیل سے ان تمام شہروں اور دیہات کے نام گنوائے ہیں اور بتایا ہے کہ کس گاؤں کی اراضی سے خراج لیا جائے اور کس سے عشر۔ اس تفصیل کی نہ تو یہاں گنجائش ہے اور نہ ضرورت البتہ اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ہی ساتھ عشری اراضی کے رقبہ میں بھی رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا۔

"مسلمانوں کے ساتھ عشر کی تخصیص اگرچہ بظاہر ایک قسم کی ناانصافی یا قومی ترجیح معلوم ہوتی ہے لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے اولاً تو مسلمانوں کو بمقابلہ ذمیوں کے بہت سی زائد رقمیں ادا کرنی پڑتی تھیں مثلاً مویشی پر زکوٰۃ، گھوڑوں پر زکوٰۃ، روپے پر زکوٰۃ حالانکہ ذمی ان محصولوں سے بالکل مستثنیٰ تھے اس بنا پر خاص زمین کے معاملہ میں جو نہایت اقل قلیل مسلمانوں کے قبضے آئی تھی اس قسم کی رعایت بالکل مقتضائے انصاف تھی دوسرے یہ کہ عشر ایک ایسی رقم تھی جو کسی حالت میں کم یا معاف نہیں ہو سکتی تھی۔ یہاں تک کہ خود خلیفہ یا بادشاہ معاف کرنا چاہے تو معاف نہیں کر سکتا تھا بخلاف اس کے خراج میں تخفیف اور معافی دونوں جائز تھی اور وقتاً فوقتاً اس پر عمل درآمد بھی ہوتا تھا۔ اس کا تذکرہ مالیات کے باب میں کیا گیا ہے۔ عمرو بن العاصؓ نے اہل مصر سے جو معاہدہ کیا تھا اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ" ان پر جو خراج لگایا جائے گا اس میں

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۴ [2] ابن ماجہ: باب العشر والخراج

[3] شبلی نعمانی: الفاروق حصہ دوم صفحہ ۷۰ نامی پریس کانپور ۱۸۹۹ء۔

اضافہ نہیں کیا جائے گا[1] ماسوا اس کے خراج سال میں صرف ایک ہی بار لیا جاتا ہے لیکن عشر ہر فصل کے کاٹنے کے وقت لیا جاتا ہے خواہ سال میں کتنی ہی فصلیں ہوں۔

لگان کے متعلق عمرو بن العاصؓ کے مشورے حضرت عمرو بن العاصؓ گورنر جنرل اور مصر کے فاتح نے مصر میں اس خوش اسلوبی سے انتظام کیا کہ کاشتکار خوش حالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ذیل میں حضرت عمرؓ اور عمرو بن العاصؓ کے خط درج کیے جاتے ہیں تاکہ مصر میں مالگذاری کا جو نظام انھوں نے قائم کیا تھا اس کا ایک سرسری سا اندازہ ہو جائے۔

"حضرت عمرؓ کا خط:۔ منجانب جانشین ابوبکرؓ بنام عمرو بن العاصؓ سپہ سالار مصر۔

"اے عمرو! میں جو چیز تم سے چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس خط کے پہنچنے کے ساتھ ہی تم مجھکو مصر کی ایسی درست کیفیت لکھ بھیجو کہ جس سے مجھے یہ معلوم ہو کہ میں نے اپنی آنکھوں سے اس ملک کو دیکھ لیا" فقط

عمرو بن العاصؓ کا جواب:۔

"اے امیر المومنین! تصور کیجئے کہ آپ ایک خشک ریگستان اور ایک شاداب خطہ جو دو پہاڑوں کے درمیان میں واقع ہوئے ہیں دیکھ رہے ہیں، ان میں سے ایک پہاڑ تو ریگ کے ٹیلہ کی شکل میں ہے دوسرا ایک دُبلے گھوڑے کی پیٹھ یا اونٹ کی پیٹھ کی صورت، یہ ہے مصر کی...... ظاہری صورت، اس ملک کی ساری پیداوار اور اس کی ساری دولت اسوان سے حدود غزہ تک ایک دریا کی بدولت ہے جو نہایت شان و شوکت کے ساتھ اس میں بہتا ہے اس دریا کے مدوجزر کا زمانہ ویسا ہی مقرر ہے

---

[1] فتوح البلدان صفحہ ۲۱۸ فتوح مصر والمغرب

جیسا کہ آفتاب اور ماہتاب کا دور ایک وقت مقررہ پر تمام عالم کے چشمے اس ندیوں کے بادشاہ کو وہ خراج دیتے ہیں جو قدرت نے ان کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اس وقت دریا کا پانی چڑھنے لگتا ہے اور دونوں کناروں پر پھیل جاتا ہے اور شاداب کرنے والی چکنی مٹی کو زمین پر چھوڑ جاتا ہے

"اس وقت مختلف قریوں میں بجز چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے اور کوئی آمد و رفت کا ذریعہ نہیں رہتا اور یہ کشتیاں اس کثرت سے ہوتی ہیں جیسے کھجور کے پتے، اس کے بعد وہ وقت آجاتا ہے کہ زمین کو شاداب کرنے کے لیے پانی کی ضرورت نہیں رہتی تو پھر نیک بخت دریا اپنے ان حدود کے اندر عود کرتا ہے جو قدرت نے اس کے لیے ٹھیرائی ہیں تاکہ وہ ذخیرے جو اس نے زمین کے اندر پوشیدہ کیے ہیں ہاتھ آسکیں"

ایک مخلوق جس پر خدا کی مہربانی ہے اور جو شہد کی مکھیوں کی طرح دوسروں کے لیے مشقت کرتی ہے اور اپنی محنت اور گاڑھے پسینے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی اس زمین پر ہلکا سا ہل چلا کر اس میں بیج بو دیتی ہے اور اس قادر مطلق سے سرسبزی کی امیدوار ہوتی ہے جو غلہ کو نمو بخشتا ہے اور پکاتا ہے بیج جمتا ہے، درخت بڑھتا ہے اور شبنم کی مدد سے جو مینہ کا کام دیتی ہے اور دریا کا لایا ہوا کھاد پرورش کرتا ہے، خوشہ پیدا ہوتا ہے اور پختگی کو پہنچتا ہے، عمدہ سے عمدہ فصل کے بعد دفعۃً خشک سالی ہو جاتی ہے۔

اے امیر المومنین! یہ مصر کی سرزمین کبھی تو خشک اور بنجر ریگستان اور سفید میدان ہے اور کبھی دلدل سیاہ اور گہری کیچڑ جمی ہوئی ہوتی ہے اور کبھی سبزہ زار جس میں انواع و اقسام کے پھول کیاروں میں نظر آرہے ہیں اور کبھی تو ایک عظیم الشان کشت زار جس میں غلہ پختگی کے قریب آچلا ہے حمد و ثنا اس خالق مطلق کو جس نے یہ عجائبات پیدا کیے۔"

"مصر کی سرسبزی اور اس کے باشندوں کی خوش حالی زیادہ تر تین چیزوں پر موقوف ہے اولاً کوئی ایسی تجویز نہ کی جائے جس سے لگان میں اضافہ ہو ثانیاً مالگذاری کا ایک ثلث نہروں اور بندوں اور پلوں کی نگہداشت اور نئی تعمیر میں صرف کیا جائے ثالثاً لگان ہمیشہ زمین کی پیداوار کی حیثیت پر قائم کیا جائے۔
والسلام[1]"

معاشی لگان اور اس کے حصہ دار زمین کی پیداوار کا وہ حصہ جو کاشت کے تمام مصارف منہا کرنے کے بعد بچ رہے اصطلاحاً معاشی لگان کہلاتا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ایک مفت عطیہ ہے جو اسباب کی قدرتی یا اتفاقی موافقت سے بلا صرف محنت حاصل ہوتا ہے[2] معاشیات والوں نے یہ سوال اٹھایا کہ اس معاشی لگان کا واجبی حق دار کون ہے؟ اور کن لوگوں میں کس نسبت سے عملی طور پر تقسیم ہونا چاہیے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ زمین کا مالک سب سے پہلے اس کا حق دار ہے مگر اس کے ساتھ ہی معاشئین لکھتے ہیں کہ "چونکہ معاشی لگان کسی خاص شخص کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مفت عطیہ ہے جو بہت سے اجتماعی اثرات کے تحت قدرت کی جانب سے انسان کو حاصل ہوتا ہے اس لیے عام طور پر ضروری اور مناسب سمجھا گیا کہ عوام کو بھی اس کے ثمرات سے فیض یاب ہونے کا موقع دیا جائے" اسلامی معاشیات نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ جو زمین بارش سے سیراب ہو اس میں سے دسواں حصہ ملک کے غریبوں اور ناداروں کو عشر کے نام سے حکومت دلوائے اور جو کنویں تالاب اور نہر سے سیراب ہو اس میں $\frac{1}{20}$ حصہ عوام کا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ

---

[1] موسیو لی بان: تمدن عرب اُردو ترجمہ از شمس العلما سید علی بلگرامی مرحوم صفحہ ۲۰۲
[2] عمرو بن العاص نے ایک خط کی عبارت ملاحظہ ہو جو انھوں نے حضرت عمرؓ کو لکھا تھا کہ "ہماری زمین زراعت اور تجارت کی زمین ہے اور اس سے ہمیں اتنی آمدنی ہوتی ہے جو ہمارے مصارف سے زائد ہوتی ہے" (فتوح البلدان صفحہ ۲۱۰ - فتوح مصر والمغرب)

ریکارڈو کے جس نظریے کا ذکر معاشی لگان کے ذیل میں کیا جاتا ہے اسلامی معاشیات نے کتنی وضاحت کے ساتھ اس کی تقسیم کی ہے، یعنے مالک کی جانب سے جتنی کم محنت ہوگی اتنا ہی عوام کا حصہ آمدنی میں زیادہ ہو جاتا ہے اسی بنیاد پر معاشئین نے طے کیا ہے کہ حکومت جو درحقیقت تمام باشندوں کی نمائندہ ہے اس زاید ماحصل کا ایک حصہ خود وصول کر کے عوام کی فلاح اور بہبود کے لیے صرف کرے۔

رسول کریمؐ اور خلفاء راشدینؓ کے عہد میں خراج اور عشر کا جو مصرف تھا اس کی تفصیل آگے آتی ہے یہاں یہی بیان کر دینا کافی ہے کہ حضرت عمرؓ نے مفتوحہ اراضی کو فتح کرنے والوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ اس کو قدیم کاشتکاروں کے قبضے میں ہی رہنے دیا پھر بھی ان اراضی سے جو مالگذاری وصول ہوتی تھی اس کو ملک کے تمام باشندوں میں تقسیم فرما دیا۔ گو کہ زمین تقسیم نہ کی گئی لیکن لگان سب میں مشترکہ طور پر تقسیم کر دیا گیا اسی بنا پر فقہاء نے خراج کو مشترکہ ملک قرار دیا ہے۔

اَلْخَرَاجُ فَیْئٌ لِجَمِیْعِ الْمُسْلِمِیْنَ۔[1] خراج تمام مسلمانوں کی مشترکہ آمدنی ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے الفاظ ملاحظہ ہوں کہ "کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس کا اس میں حق نہ ہو انشاءاللہ اگر میں زندہ رہا تو ہر مسلمان اپنا حق پالے گا (یا) کہا کہ اپنا حصہ پالے گا یہاں تک کہ (یمن کے) سرو پہاڑ کا رہنے والا بھی اپنا حصہ پالے گا[2]

(۳) معدنی دولت

ذیل میں مختصراً معدنی دولت کی ملکیت اور اس کی تقسیم کی وضاحت کی جاتی ہے

اقطاع معدن:- اس سے زمین کے وہ قطعات مراد ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دھاتیں، جواہرات اور دوسری قسم کی اشیاء پیدا کیے ہیں[3]

معدنیات بھی قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہیں جن میں قوم کے ہر فرد کو

۱۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۴۶۔ ۲۔ کتاب الخراج صفحہ ۱۳، ۲۷ نیز کتاب الاموال ۲۱۴ نمبر ۵۲۵

۳۔ ماوردی احکام السلطانیہ باب ۱۷ صفحہ ۱۰۷

مساوی ملکیت کا حق حاصل ہے گو نظری طور پر ہر شخص کو حق ملکیت حاصل ہے تاہم ہر ایک زمین کے ان پوشیدہ خزانوں سے استفادہ نہیں کر سکتا اور بعض قسم کی معدنی دولت تو ایسی ہے کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے نہ صرف زمین کے اندر میلوں کھودنے کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ ساتھ ہی کثیر سرمایہ، بہترین مہارت اور اعلیٰ تنظیمی قابلیت درکار ہوتی ہے اسی بنا پر اسلامی فقہاء نے کانوں کی دو قسمیں قرار دی ہیں (۱) ایک ظاہری (۲) دوسرے باطنی۔

۱۔ معدن ظاہری "ظاہری سے مراد وہ کانیں ہیں جن کی چیزیں ظاہر اور کھلی ہوئی ہوں جیسے سرمہ، نمک، ڈانبر (قار) نفط[۱]۔ ان کا حکم پانی کے مثل ہے جو کسی فرد کو بطور جاگیر نہیں دیا جا سکتا، سب آدمی برابر فائدہ اٹھائیں[۲]۔"

مذکورہ فیصلے کی تائید میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ "ابیض بن حمال کا بیان ہے کہ وہ ایک وفد کے ساتھ رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مآرب والی نمک کی کان کو حاصل کرنا چاہا آپ نے وہ عنایت فرمائی جب وہ چلے تو حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے جو عطا فرمایا کیا آپ اسے جانتے ہیں؟ آپ نے اس کو نہ رکنے والا پانی دے دیا۔ پس آپ نے وہ (کان) واپس لے لی ....[۳]" حدیث کی بعض کتابوں مثلاً ابن ماجہ میں اس کی اور تفصیل یہ ہے کہ "ابیض بن حمالؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول کریمؐ سے مآرب کا نمک بطور جاگیر کے مانگا۔ آپ نے رضامندی ظاہر کی۔ پھر اقرع بن حابس تمیمیؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے اس نمک کو جاہلیت میں دیکھا ہے اور اس زمین میں کچھ پانی وغیرہ بھی نہیں ہے، لوگ آتے ہیں،

۱۔ نفط ڈانبر وغیرہ کی جنس کی ایک آتش گیر چیز ہے اور اردو میں بھی وہی لفظ ہے نیز انگریزی میں بھی Naphtha کہا جاتا ہے۔

۲۔ ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۵ صفحہ ۱۸۷۔

۳۔ ابو داؤد ج۲ کتاب القطاع نیز کتاب الاموال صفحہ ۲۷۵ نمبر ۶۸۲ نیز فتوح البلدان صفحہ ۷۳، الیمن۔ نیز ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۷ صفحہ ۱۸۸

اور لے جاتے ہیں اور وہ نہ ختم ہونے والے پانی کی طرح ہے۔ آپ نے ابیض بن حمال کو واپس کرنے کو کہا انھوں نے عرض کی کہ میں اس شرط پر واپس کرتا ہوں کہ آپ اس کو میری طرف سے صدقہ فرما دیں آپ نے فرمایا کہ اچھا یہ تمھاری طرف سے صدقہ ہے اور نہ رکنے والے پانی کی طرح ہے وہاں جو بھی آئے اس کو لے سکتا ہے (راوی کا) بیان ہے آج تک وہاں جو کوئی آتا ہے اس کو لے جاتا ہے۔[1]

"بہر حال اس قسم کی چیزوں کو جاگیر میں دینا درست نہیں اگر دے دی گئیں تو اعتبار کے ناقابل ہے، جاگیر دار اور دوسرے لوگ، مساوی حقوق رکھتے ہیں"[2]

۲۔ **معدن باطنی**: "معدن باطنی سے وہ کانیں مراد ہیں جن کی اشیاء پوشیدہ ہوں جیسے سونے، چاندی، پیتل (صفر) لوہے وغیرہ کی کانیں عام اس سے کہ ان میں سے نکلے ہوئے مادے کو پگھلا کر صاف کرنے کی ضرورت ہو یا نہ ہو"

"ان کو جاگیر میں دینے میں دو قول ہیں (۱) پہلا قول یہ کہ ناجائز ہے معدن ظاہری کی طرح یہ بھی سب کے لیے عام ہیں (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ جائز ہے"[3]

دوسرے قول کی دلیل میں رسول کریمؐ کا وہ فرمان مبارک پیش کیا جا سکتا ہے جو حدیث کی کتابوں میں ہے کہ "رسول اللہؐ نے بلال بن حارث المزنی کو قبلیہ کی کانیں جو بلندی پر اور پستی میں تھیں اور نیز قدس میں زراعت کے لائق جو زمین تھی جاگیر میں عطا فرمائی اور رسول اللہؐ نے مندرجہ ذیل یہ سند ان کو تحریر فرما دی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"یہ وہ سند ہے جس کی رو سے محمدؐ نے جو کہ اللہ کے رسول ہیں بلال بن حارث المزنی کو قبلیہ کے کانوں کا ٹھیکہ دیا (یہ کانیں) جو بلندی میں اور جو پستی میں ہیں اور قدس میں جہاں پر کھیتی ہو سکتی ہے اور انھیں کسی مسلمان کا حق نہیں دیا"[4]

"اگر کسی شخص نے زمین آباد کی خواہ جاگیر میں لے کر یا اس کے بدوں اور

---

[1] ۔ ابن ماجہ ج ۲ صفحہ ۲۳۶ ۔ [2] ماوردی احکام السلطانیہ باب ۱۷ صفحہ ۱۸۸
[3] ۔ ماوردی کا احکام السلطانیہ باب ۱۷ صفحہ ۱۸۸ ۔ [4] ۔ ابو داؤد ج ۲ کتاب القطائع نیز موطا امام مالک کتاب الزکات نیز کتاب الاموال ص ۳۳۸ و فتوح البلدان نیز ماوردی ص ۱۸۸

اس زمین میں کوئی ظاہری یا باطنی معدن نکلے تو آباد کنندہ ہمیشہ کے لیے مالک ہوگا جیسے کہ چشموں اور کنوؤں کا کھودنے والا مالک ہو جاتا ہے[1] چنانچہ "نص سے ثابت ہے کہ جس کی زمین میں کوئی معدن نکلے وہ اس کا حق ہوگا"[2]

عکرمہ بلال بن الحارث سے کے آزاد کردہ غلام نے کہا کہ "رسول اللہ نے بلال بن الحارث کو ایک زمین جاگیر میں عطا فرمائی فلاں مقام سے فلاں مقام تک اس میں ایک پہاڑ تھا یا ایک معدن۔ بلالؓ کی اولاد نے اس زمین کا ایک حصہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاتھ فروخت کیا، اتفاق سے اس میں دو کانیں نکل آئیں۔ اس پر آل بلال نے ان سے کہا کہ ہم نے تمہارے ہاتھ کاشت کی زمین بیچی ہے کانیں نہیں اور اپنی تائید میں ایک جریدے میں رسول اللہ کا فرمان پیش کیا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس فرمان مبارک کو چوما اور آنکھوں سے لگایا اور اپنے منیب کو بلا کر کہا کہ حساب میں دیکھو کہ اب تک اس میں کیا نکلا اور اس پر کیا خرچ ہوا؟ اخراجات نکال کر جو باقی ہے ان کے حوالہ کر دو"[3]

رائلٹی (حق سرکار) معدن باطنی کو معلوم کرنے کے لیے زمین کی گہرائی کو برمانے، مساحت کرنے، کھودنے اور زمین کے اندر سے اشیاء کو نکال لینے میں کثیر سرمایہ، مہارت اور اعلیٰ تنظیمی قابلیت درکار ہوتی ہے اس لیے اگر حکومت کسی خاص فرد یا مشترکہ سرمایہ دار کمپنی کو اجارہ پر دینا چاہے تو دے سکتی ہے اور اجارہ دار سے معدنی پیداوار کا ایک حصہ وصول کرنے کا حق رکھتی ہے اس طرح گو افراد ملک وملت باطنی معدنوں میں مساوی حقوق یا ان سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تاہم جو رائلٹی وصول ہوتی ہے اس میں شریک ہوتے ہیں جو اشیاء زمین کے اندر ہیں ان کا بھی خالق خداوند تعالیٰ ہی ہے پس جو کچھ ان سے نکلتا ہے وہ خالصاً اسی کی ملک ہے لیکن اس نے اپنی مرحمت سے معدنوں کے مالکوں یا قیمتی اجناس پانے والوں کو ۴/۵ لینے کی اجازت عطا فرمائی اور بقیہ ۱/۵ کو

---

[1] ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۴ صفحہ ۱۲۸۔ [2] قاضی ابو یعلی الاحکام السلطانیہ ص ۱۱۱

[3] کتاب الاموال صفحہ ۳۳۹ نمبر ۸۶۶ نیز فتوح البلدان صفحہ ۱۳

قوم کے لیے مخصوص کر دیا ہے[۱]

مالیات کے باب میں رائلٹی حق سرکار کی مزید بحث کی گئی ہے۔

معدن ظاہری کی طرح معدن باطنی کا بھی مشترکہ ملک ہونا

اوپر بتایا جا چکا کہ بعض فقہاء نے معدن ظاہری کی طرح معدن باطنی کو بھی سب کے لیے عام اور مشترکہ قرار دیا ہے

امام مالکؒ نے اس سلسلہ میں یہ زاویہ نگاہ اختیار کیا ہے کہ "کسی شخص کی زمین میں اگر سونے چاندی، تانبے لوہے یا سیسے یا پارے یا یشب یا ہڑتال یا سرمہ یا یاقوت یا زمرد یا بلور وغیرہ کی کوئی کان نکل آئے تو اس صورت میں امام مالکؒ کہتے ہیں کہ

تَصِيْرُ الْاَرْضُ لِلسُّلْطَانِ — زمین سلطان (یعنے حکومت) کی ہو جانے کی۔[۲]

دوسرے لفظوں میں ہر قسم کی معدنیات کو امام مالکؒ نے مشترکہ ملک قرار دیا تھا امام مالک نے جن بنیادوں پر اس مسلک کو اختیار فرمایا ہے ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے پیمانہ پر آمدنی پیدا کرنے والی چیزوں کو حکومت اپنی نگرانی میں لے لے۔

(۴) جاگیرات وعطیات

اسلامی مملکت یا صدر جمہوریت (امام) چاہے تو اپنے اختیار سے ایسی اراضی کو جن کا کوئی مالک نہ ہو بطور جاگیر کسی خاص فرد کو اس کے اہم خدمات کے صلہ میں یا بنجر زمین کو آباد کرنے کی غرض سے دے سکتا ہے خود "رسول کریمؐ نے زبیرؓ کو خیبر میں ایک زمین جاگیر میں عطا فرمائی جس میں نخلستان کے علاوہ اور قسم کے درخت بھی تھے[۳] عہد نبوی میں طرح طرح کی جاگیروں کا پتہ چلتا ہے[۴]

۱۔ سر عبدالرحیم: اصول فقہ اسلام صفحہ ۲۰۴۔ ۲۔ محلی ابن حزم ج ۸ صفحہ ۲۳۸۔

۳۔ بخاری ج۱ کتاب الجہاد نیز کتاب الاموال صفحہ ۲۷۳ باب الاقطاع نیز فتوح البلدان صفحہ ۲۹۔

۴۔ ۱۔ پیشگی عطا کہ فلاں مقام فتح ہو تو تمہیں جاگیر میں دیا جائے گا (الوثائق السیاسیہ مولفہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب صفحہ ۴۳ و مابعد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۵ پر)

خلفاء راشدین رضؓ کے عہد میں بھی اس قسم کے نظائر ملتے ہیں چنانچہ جعفر بن محمد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضؓ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ینبع جاگیر میں دیا اور پھر ایک اور جاگیر اضافہ کی[1]

حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی کرمؓ نے بھی اسی طرح بعض علاقے لوگوں کو بطور جاگیر کے عنایت فرمائے[2]۔

جاگیرات کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جاگیر پانے والے بھی دیگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

۲ - عطا دوران اسلام میں (وثائق ص۱)

۳ - مشروط الخدمت کہ جنگ میں حصہ لو (وثائق صفحہ ۱۲)

۴ - مشروط کہ مشرکوں سے پرانے تعلقات اور حلیفیان توڑ لو (وثائق صفحہ ۱۸)

۵ - مشروط بشرائط مختلفہ (صفحہ ۸۴ - ۲۰۸ - ۲۱۶)

۶ - بلا شرط (۸۶ - ۸۸ - ۸۹ - ۱۴۵ - ۱۴۹ - ۱۵۴ - ۱۵۵ - ۱۶۷ - ۲۰۱ - ۲۰۴ - ۲۰۷ - ۲۰۸ - ۲۱۰ - ۲۱۱ - ۲۱۲ - ۲۱۳ - ۲۱۴)

۷ - طعمہ یعنی غذائی اجناس کا ہبہ (ص ۱۱۳)

۸ - قبل اسلام کے مملوکات کی بحالی و برقراری کا پروانہ (ص ۱۳۱ و ص ۱۳۴)

۹ - معدنیات وغیرہ کی عطا (۱۶۳ - ۱۶۴)

۱۰ - شہد (ص ۱۶۴)

۱۱ - قبل اسلام کا حق بحال ص ۱۸۲

۱۲ - احیاء الموات (ص ۱۸۵)

۱۳ - مکان کے لیے زمین (ص ۲۱۸)

۱۴ - کاروانی اسٹیشن پہ مسافر خانے بنانے کا اجارہ ص ۲۲۸

۱۵ - دائمی نسلاً بعد نسلٍ تا قیامت (ص ۴۳ و ابعد ص ۱۱۴ - ۲۲۹)

۱۶ - جاگیر سے عشر نہیں لیا جاتا (ص ۱۶۴)

بعض جاگیریں تاحیات دی جاتی ہیں جو عمری کہلاتی ہیں۔

[1] - بلاذری: فتوح البلدان ص ۱۴ — [2] تفصیل کے لیے کتاب الاموال ، باب الاقطاع نیز ابو یوسف کتاب الخراج بر موقع ملاحظہ ہو۔

مالگان اراضی کی طرح حکومت کو اپنی اراضی کا لگان (عشر) ادا کرتے تھے البتہ انھیں زمین پر حق ملکیت حاصل ہو جاتا تھا۔

اراضی کی ضبطی اسلامی مملکت کی تمام زمین امام یا صدر جمہوریت کے زیر اقتدار ہوتی ہے اس کا اقتدار ملت اسلامیہ ہی کا اقتدار سمجھا جاتا ہے جس طرح صدر مملکت کو ملت اسلامیہ کی فلاح وبہبود کے لیے کسی علاقہ کو بطور جاگیر کے عطا کرنے کا اختیار ہے اسی طرح شریعت کی طرف سے وہ ملت اسلامیہ کی فلاح وبہبود کی خاطر اراضی کی ضبطی کا بھی اقتدار رکھتا ہے

"حضرت عمرؓ نے سواد میں سے ان لوگوں کی زمینیں جو جنگ میں کام آئے اور ان کی زمین جو بھاگ گئے تھے اور کسریٰ اور اس کے خاندان کی تمام املاک، پانی کے جوہر، تالاب، جنگلات اور ویریزید کے پورے علاقے کے علاوہ کسریٰ کی صرفخاص میں لی ہوئی جاگیریں یہ سب کی سب بحق حکومت مخصوص کرلیں اور صوافی (خالصہ جائدادوں) کی آمدنی سات لاکھ درہم تک پہنچ گئی۔"[1] اسی طرح ماوردی لکھتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ نے سواد کی زمین سے کسریٰ اور اس کے خاندان کا مال اور جس کے مالک بھاگ گئے یا ہلاک ہو گئے تھے انتخاب کرلیا اس کی آمدنی نوے لاکھ تھی جو مصالح عامہ میں صرف کی جاتی آپ نے اس میں سے کسی کو جاگیر نہیں دی۔"

"حضرت عثمانؓ نے اس مصلحت سے کہ جاگیرات دینے سے اس کی آمدنی بڑھ جائے گی اس کو جاگیرات میں دیا اور یہ شرط کرلی کہ اس کا حق فئی ادا کریں گویا آپ نے بطور اجارے کے دی تھیں۔ ملوکہ جاگیرات نہ تھیں چنانچہ ان کی آمدنی بڑھ کر پچاس کروڑ ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ اس میں سے انعامات اور عطیات دیتے تھے۔"[2]

مُوات (بنجر اراضی) "موات سے مُردہ زمین مراد ہے جس میں آبادی نہ ہو۔"[3] مملکت اسلامیہ میں یہ عمل درآمد جاری تھا کہ اگر کوئی شخص

۱۔ بلاذری صفحہ ۲۷۲، ۲۷۳۔ ۲۔ ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۵ ص ۱۸۳

۳۔ ماوردی بالا احکام السلطانیہ باب ۱۵ ص ۱۶۹ نیز ابویعلی صفحہ ۱۹۳ تعریف موات

کسی افتادہ زمین کو آباد کرتا تو آباد کار یعنے بنجر دار کو اس زمین پر حق ملکیت حاصل ہو جاتا تھا۔ خود رسول اکرمؐ نے آباد کار کو اس قسم کا حق عطا فرمایا تھا چنانچہ "حضرت عائشہؓ نبی کریمؐ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص کسی زمین کو آباد کرے اور وہ کسی اور کی مملوکہ نہ ہو تو آباد کار اس کا زیادہ حق دار ہے عروہؓ (راوی حدیث) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں یہی فیصلہ کیا تھا"[1]

مسلمانوں اور غیر مسلموں کو مساوی حقوق:۔ بنجر زمین کو آباد کرکے اپنی ملک بنا لینے میں مسلم اور غیر مسلم ذمی میں کوئی فرق نہیں ہے چنانچہ ھدایہ میں ہے کہ "بنجر زمینوں کو آباد کرنے والا ذمی مسلمان ہی کی طرح اس کا مالک ہو جاتا ہے کیونکہ بنجر زمینات کو آباد کرنا ہی اس کی ملکیت کا سبب ہے البتہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک امام (حد مملکت) کا حکم لازمی ہے غرض ذمی اور مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں ہے جس طرح دوسرے اسباب ملک و جائداد میں ذمی اور مسلمان برابر ہیں اسی طرح اس میں ان کی برابری ہے"[2]

"آباد کرنے کی صورت عرف عام پر موقوف ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے مطلق ذکر فرمایا ہے اور کیفیت کو عرف عام پر چھوڑ دیا ہے"

"پس اگر سکونت کی نیت سے آباد کرے تو کوئی مکان بنانا اور اس پر چھت ڈالنا شرط ہے اس لیے کہ یہ تعمیر کی بالکل ابتدائی حالت ہے جس سے سکونت کا استفادہ ممکن ہوتا ہے"

"اور اگر درخت لگانے یا کاشت کرنے کے لیے آباد کرے تو تین شرطیں ہیں۔

(۱) اس کے چاروں اطرف مٹی جمع کرکے ڈول بنانا تاکہ حد فاصل

---

[1] ۔ بخاری پ ۹ کتاب المزارعۃ نیز کتاب الاموال صفحہ ۲۸۶ نمبر ۷۰۱ بخاری کے علاوہ مسند احمد حنبل اور نسائی شریف میں بھی یہ حدیث ہے۔

[2] ۔ ھدایہ ج ۴ کتاب احیاء الموات۔

بن جائے۔

(۲) اگر زمین خشک ہو تو پانی لانا اور زیر آب ہو تو پانی کو روکنا کیونکہ ان کو آباد کرنے کی یہی صورت ہے تاکہ زراعت اور باغ لگانا ممکن ہو۔

(۳) تمام زمین میں ہل وغیرہ چلاکر اونچ نیچ درست کرنا۔ ان تینوں شرطوں کی تکمیل کے بعد زمین آباد سمجھی جائے گی۔ آباد کنندہ اس کا مالک بن جائے گا[1]

اس طرح حق ملکیت عطا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر اراضی جو اب تک افتادہ پڑی ہوئی تھیں آباد ہونے لگیں۔ بصرہ بھی جو ایک زمانہ سے مردہ اور تر اراضی بنا ہوا تھا خلفاء راشدین کے عہد میں پھر سے آباد ہو گیا[2]

"جب امیر معاویہؓ نے اپنے آزاد کردہ غلام عبداللہ بن دراج کو عراق کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجا تو اس نے بہت کچھ علاقہ آباد کیا جس کی آمدنی پچاس لاکھ درہم ہوئی اس کے بعد حسان نبطی نے ولید بن عبدالملک کے عہد میں اور علاقہ نکالا پھر ہشام کے عہد میں اور علاقہ آباد ہوا[3]

گذشتہ صدی میں کناڈا بھی کچھ اسی طرح سے آباد ہوا" حکومت کناڈا نے خاص طور پر زمین مفت دے دے کر بیرونی ملکوں کے لوگوں کو کناڈا آکر بسنے کی ترغیب دی اور اس طرح ملک کی رفتار ترقی کو تیز کر دیا[3]

حمیٰ: "زمین کے جو قطعات خالی رکھے جائیں اور آباد نہ کرنے دیے جائیں تاکہ ان میں گھانس اور چارہ اُگے اور جانوروں کے چرنے کے لیے مباح ہوں ان کو حمیٰ کہتے ہیں[4]

"رسول اللہؐ نے مدینہ طیبہ میں ایسا کیا تھا آپ نقیع میں ایک پہاڑی پر چڑھے اور میدان کی طرف جس کی مقدار ۶ × ایک میل تھی اشارہ کر کے فرمایا کہ

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۵ ص ۱۶۹ موات نیز ابویعلی: الاحکام السلطانیہ ص ۱۹۴
ابوعبید نے بھی کتاب الاموال ص ۲۹۱ پر آبادکاری کی وضاحت کی ہے۔

[2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۵ ص ۱۷۱ [3] آر ٹیج امتھ: اصول طریق محصول ص ۴۲

[4] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۶ ص ۱۷۶ نیز ابویعلی: الاحکام السلطانیہ ص ۲۰۶ الاحمیٰ

یہ میری حمیٰ (محصورہ چراگاہ) ہے اس کو آپ نے مہاجرین اور انصار کے گھوڑوں کے چرنے کے لیے مخصوص کر دیا۔[1]

"آپ کے بعد ائمہ کا حمیٰ بنانا جائز ہے کیونکہ آپ کو مسلمانوں کی مصلحت مدنظر تھی نہ کہ ذاتی منفعت یہی آپ کے قائم مقام کرتے ہیں۔ ابوبکر صدیقؓ نے ربذہ میں صدقہ کے اونٹوں کے لیے حمیٰ تجویز کی اور اس پر اپنے مولیٰ ابوسلامہ کو عامل بنایا اس طرح عمرؓ نے صرف میں حمیٰ مقرر کر کے اس پر اپنے مولیٰ ہنی نامی کو عامل بنایا۔[2] بخاری وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ حمیٰ بنانا سوائے اللہ اور اس کے رسول کے کسی جائز نہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول کریمؐ نے مقام نقیع کو حمیٰ بنایا تھا اور حضرت عمرؓ نے مقام سرف اور ربذہ کو حمیٰ بنایا تھا۔[3]

امام ماوردی لکھتے ہیں کہ آپ کے ارشاد کا کہ "حمیٰ صرف اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے" یہ مطلب ہے کہ حمیٰ صرف اسی طرح ہے جس طرح اللہ اور رسول نے فقیروں مسکینوں اور عام مسلمانوں کی ضروریات کے لیے بنائی نہ کہ زمانہ جاہلیت کی طرح جبکہ لوگ زور و قوت سے اپنے لیے مخصوص کر لیتے تھے جیسے کلیب بن وائل کا طریقہ تھا کہ کسی جگہ کتے کو باندھ دینا اور جہاں تک اس کے بھونکنے کی آواز جاتی اس کو چاروں طرف سے اپنی حمیٰ مخصوص قرار دینا اور دوسری چراگاہوں میں لوگوں کا شریک رہتا۔ اس کے قتل کا سبب یہی اس کی زیادتی تھی۔[4]

"جب زمین کو حمیٰ بنا دیا جائے اور آباد کرنے کی ممانعت ہو جائے تو پھر حمیٰ کا حکم نافذ ہوتا ہے اگر سب کے لیے ہو تو امیر غریب مسلم اور ذمی سب کو چرانے کا حق ہے اگر مسلمانوں کے لیے خاص ہو تو اس میں سب

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۶ ص ۱۷۶ [2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۶ ص ۱۷۷

[3] بخاری پ ۹ کتاب المساقات۔

[4] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۶ ص ۱۷۷

امیر و غریب کو حق ہے اور ذمیوں کو ممانعت ہے اور اگر فقیروں اور مسکینوں کے لیے خاص ہو تو امیروں اور ذمیوں کو چرانے کی ممانعت ہے اور یہ صورت کہ امیروں کے لیے خاص ہو غریبوں کے لیے نہ ہو، ذمیوں کے لیے ہو مسلمانوں کے لیے نہ ہو جائز نہیں اگر صدقہ کے جانور اور مجاہدین کے گھوڑوں کے لیے خاص ہو تو دوسروں کو شریک ہونے کا حق نہیں۔ آئندہ حمیٰ کا حکم اسی عمومیت یا خصوصیت پر رہے گا البتہ اگر مخصوص حمیٰ کو وسیع کر کے سب کے لیے عام کر دیا جائے تو درست ہے"[1]

اب حمیٰ کی ایک خاص شکل بیان کی جاتی ہے رسول کریمؐ کے عہد مبارک میں طائف وغیرہ کے مقامات پر شہد سازی کی خاص صنعت بڑے پیمانے پر جاری تھی لوگ باقاعدہ طور پر مگس پروری کیا کرتے تھے مگس پروری کے لیے رسول اللہؐ نے بعض وادیاں بعض خاص اشخاص کے لیے محفوظ کر دی تھیں کوئی دوسرا شخص وہاں مگس پروری کرنے کا یا ان وادیوں سے استفادہ کا حق نہیں رکھتا تھا چنانچہ

"عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ بنو متعان کا ایک شخص ہلال نامی رسول اللہؐ کی خدمت میں شہد کا عشر (دسواں حصہ) لے کر حاضر خدمت ہوا۔ اور استدعا کی کہ اس کے لیے ایک وادی محفوظ کر دی جائے جس کا نام سلبہ تھا۔ رسول اکرمؐ نے وہ وادی اس کے لیے محفوظ کر دی۔"

"پھر جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو سفیان بن وہب (امیر طائف) نے اس بارے میں دریافت کیا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں لکھا کہ اگر وہ شخص تمھیں وہی ادا کرے جو وہ شہد کا عشر رسول اللہ کو ادا کیا کرتا تھا تو وادی سلبہ اس کے لیے محفوظ رکھو ورنہ وہ مکھیاں مثل اور جنگل کی مکھیوں کی طرح ہیں کہ جن کا شہد ہر شخص کھا سکتا ہے"[2]

"سفیان بن عبداللہ الثقفی نے ان کے لیے دو وادیاں محفوظ کر دی تھیں اور سفیان ان کی وادیوں کی حفاظت کرتے تھے"[3]

شہد کی پیداوار کے لیے مختلف وادیوں کو رسول کریمؐ اور حضرت عمرؓ کے

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۴ صفحہ ۱۷۵ نیز الاحکام السلطانیہ لابی یعلیٰ صفحہ ۱۳۰ [2] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ نیز نسائی کتاب الزکوٰۃ نیز مصنف ابن ابی شیبہ [3] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ۔

زمانہ میں حمی بنانے کا جو عمل درآمد ہے وہ ایسا ہی جیسا کہ آج کل کوئی خاص رقبہ صنعتی بنانے کے لیے حکومت کسی بڑے ماہر صنعت کو اراضی کا کچھ رقبہ دوامی پٹہ پر دے دیتی ہے[1] یا جیسے معدن بھی اجارہ پر دیے جاتے ہیں۔

حمی کو بھی اجارہ[2] یا مونوپولی کی ایک قسم قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں بھی کسی خاص شخص یا افراد کو انفرادی اقتدار حاصل ہوتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مونوپولی دینے سے دولت میں عدم مساوات تو نہیں پیدا ہوتی؟ اس سلسلہ میں پروفیسر بنھام کا بیان ہے کہ

> "عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اجارہ دولت کی تقسیم کو غیر مساوی بنا دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر یہ خیال صحیح نہیں ہوتا[3]۔"

گو ہر شخص ان وادیوں سے استفادہ کرنے کا حق رکھتا تھا تاہم وہ استفادہ کرنے سے محروم رہا۔ اور اجارہ دار کو انفرادی اقتدار کی بنا پر زائد منافع حاصل ہوا حکومت اس قسم کے حاصل شدہ لگان اجارہ کو عام باشندگان ملک کی فلاح و بہبود میں خرچ کرتی ہے۔ گو تمام باشندگان ملک ان سہولتوں اور مراعات سے محروم تھے جو اجارہ دار کو حاصل تھے تاہم اجارہ دار جو لگان اجارہ سرکار کو ادا کرتا ہے اس سے ہر کوئی استفادہ کر سکتا ہے۔ اجارہ کی مزید وضاحت مبادلہ دولت کے باب میں کی گئی ہے۔

جنگلات اسلامی معاشیات نے جنگلات کو عموماً سرکاری ملک قرار دیا ہے رسول اللہ ﷺ نے دومۃ الجندل کے اطراف کے جنگلات کو بیت المال کی

۱۔ خود مملکت حیدرآباد نے اس قسم کے دوامی پٹے اور اجارے دیے ہیں سرپور کناپیٹ کا کچھ علاقہ حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی کو کاغذ سازی کے لیے دیا گیا ہے جہاں کا بانس سوائے کمپنی مذکور کے اور کوئی کاٹ نہیں سکتا۔ ۲۔ گو عربی میں اجارہ کے اور بھی معنے ہیں لیکن ہم نے یہاں انگریزی لفظ مونوپولی کے مترادف معنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

۳۔ بنھام: اکنامکس صفحہ ۲۰۲ مونوپولی۔

ملک قرار دیا تھا[۱]۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے عراق و ایران فتح کیا تو ساسانی سلطنت میں جو جنگلات تھے آپ نے ان کو تقسیم نہیں کیا[۲] بلکہ ان تمام جنگلات کو اسلامی بیت المال کی ملک قرار دی، جنگلات کی آمدنی کا تذکرہ مالیات عامہ باب میں کیا گیا ہے۔

اموال مشترکہ رسول اللہؐ نے پانی، آگ اور گھانس کو مشترکہ ملک قرار دیا ہے کہ

اَلنَّاسُ شُرَكَاءُ فِي الْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ[۳]۔ تمام انسان پانی، آگ اور گھانس میں شریک ہیں۔

بالفاظ دیگر مذکورہ بالا اشیاء کو استعمال کرنے کا کوئی معاوضہ حکومت کی جانب سے نہیں لیا جاتا تھا۔

مملکت اسلامیہ کے بڑے بڑے دریاؤں کو مشترکہ ملک قرار دیا گیا تھا قاضی ابو یوسفؒ لکھتے ہیں کہ

وَالْمُسْلِمُوْنَ جَمِيعاً شُرَكَاءُ فِي دِجْلَةَ وَالْفُرَاتِ وَكُلِّ نَهْرٍ عَظِيْمٍ نَحْوِهِمَا[۴]۔ تمام مسلمان دجلہ اور فرات اور ان جیسے بڑے دریاؤں میں شریک ہیں۔

تاکہ جو چاہے ان سے سیراب ہو، کشتی رانی اور مچھلی کا شکار کرے اور پن چکیاں قائم کرے۔

سمندر بھی مشترکہ ملک قرار پائے تھے چنانچہ صاحب ھدایہ لکھتے ہیں کہ

اَلْاِنْتِفَاعُ بِمَاءِ الْبَحْرِ كَالْاِنْتِفَاعِ بِالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالْهَوَاءِ[۵]۔ سمندر کے پانی سے فائدہ اٹھانا ایسا ہے جیسے چاند، سورج اور ہوا سے استفادہ

غرض بین الاقوامی دولت کی بہترین مثال وہ ساتوں سمندر ہیں جو بذریعہ بارش

---

[۱] کتاب الاموال صفحہ ۱۹۵ نمبر ۸۰۔ و نیز فتوح البلدان صفحہ ۶۲ و دومۃ الجندل [۲] بلاذری: فتوح البلدان ج ۱ صفحہ ۲۷۳

[۳] کتاب الاموال صفحہ ۲۹۵۔ نیز ابو داؤد و نیز ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۵۵۔

[۴]۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۵۵ مطبوعہ بولاق مصر۔

[۵]۔ ھدایہ ج ۴ کتاب احیاء الموات، فصل فی مسائل الشرب۔

جہاز رانی دنیا کی مالی بہبودی کے بہترین معاون ہیں۔
مندرجۂ بالا تفصیلات سے واضح ہوگا کہ تقسیم دولت کے پیچیدہ مسائل جو اراضی سے متعلق پیش آرہے ہیں بنیادی حیثیت سے وہ ابتدائے اسلام میں پیش آچکے ہیں اور اسلام نے ان کو اس طرح حل کیا کہ انفرادی حقوق محفوظ رہتے ہوئے جماعت کو زیادہ سے زیادہ فلاح حاصل ہو اور مفادات میں تصادم کی صورت پیدا نہ ہونی چاہیے جیسی کہ آج کل پیدا ہو رہی ہے جس کا علاج انقلاب تجویز کیا جاتا ہے۔

نوٹ: تقسیم دولت کے دیگر مسائل، مسئلہ اجرت، اور مسئلہ سود وغیرہ دوسری جلد میں بیان ہوئے ہیں۔

دوسری جلد میں مسئلہ اجرت اور سود کے علاوہ
مبادلۂ دولت، صرفِ دولت اور
مالیاتِ عامہ سے متعلق بحث
کی گئی ہے